ہر گھر کی زینت
WWW.PAKSOCIETY.COM
ماہنامہ
دوشیزہ
کراچی
December
2014
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

باتیں ملاقاتیں

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

انتخابِ خاص

رنگِ کائنات

دوشیزہ میگزین

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)......720 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ......5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا......6000 روپے

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: سٹی OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی

Phone : 021-34939823-34930470

Email : pearlpublications@hotmail.com

الوداع اے گزرے برس

ماہ دسمبر، سال کا آخری مہینہ، 2014 غروب ہوا چاہتا ہے اور اگلے ماہ ہم 2015 میں قدم رکھ چکے ہوں گے۔ گئے برس کے اوراق ذرا سا پلٹ کر تو دیکھیے۔ کیا ایسا ہے کچھ 2014 میں جو یاد رکھا جائے۔

ذرا اک سوال تو اپنے آپ سے پوچھیے کہ اس گزشتہ برس ہم زمانے بھر سے تو ملے اور خوب ملے...... مگر کیا ہم خود سے بھی مل پائے؟ ارے کیا ہم خود سے ملنا جانتے ہیں؟ نہیں نہیں...... ہم زمانہ شناس تو ہیں مگر خود شناس نہیں۔ یقیناً اس بیتے برس بھی ہم خود سے بے پروا رہے اور وقت دھیرے دھیرے اپنی چال چلتا رہا، بنا چاپ آگے بڑھتا رہا......

زمین ...... ہماری ماں...... آج بھی ویسی ہی ہے جیسی اربوں، کھربوں برس پہلے تھی مگر ہم بہت تبدیل ہو گئے ہیں، بہت مصروف ہو گئے ہیں۔ ہم بہت جدید ہو گئے ہیں۔

مگر ساتھیو! کبھی شب بھر اولاد کا انتظار کرتی ماں، چاند میں چرخہ کاتتی چاند کی بڑھیا، الف لیلا کی کہانیوں کی شہزادیاں، گاؤں کے پنگھٹ پہ کچے گھڑوں میں پانی بھرتی دوشیزائیں، صبح صبح چاٹی میں لسی بلوتی، ہاتھ سے بچوں کو مکھن چٹاتی مائیں، خالائیں، دادیاں، نانیاں پرانی ہوئیں...... نہیں نا......

سورج کی تپش، چاند کی ٹھنڈک اور شبنم کی نمی میں کوئی فرق پڑا...... گلاب کی لالی اور پتوں کی ہریالی بدلی...... تو پھر ہم کیوں 'مصروف' ہو کر بدل گئے۔

وقت سے کون کہے، یار ذرا آہستہ! یار ذرا دھیرے دھیرے! یار ذرا ہولے ہولے! یار ٹھہر تو سہی!

مگر......! مگر وقت کہاں کسی کی سنتا ہے۔ یہ تو کہتا ہے میری سنو، میری مانو، میری قدر کرو اور اس بھیڑ چال سے نکل جاؤ۔

الوداع اے مصروف و مجبور 2014...... کہ تیرے جاتے جاتے بھی ہم تہی دست ہی رہے۔

الوداع...... الوداع

کاشی چوہان

زادِ راہ

انسان تدبیر کرتا ہے اور اللہ بھی تدبیر کرتا ہے اور یہ اللہ ہی کی تدبیر ہے کہ انسان کی آزمائش کے سیکڑوں طریقے ہیں اور سب سے عجیب طریقہ یہ ہے کہ جب اور جہاں بھی اس کے بندے اللہ کی نافرمانی کی جانب مائل ہو کر اسے درست قرار دینے لگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ......

زندگی کو آسان' باعمل اور ایمان افروز بنانے کا روشن سلسلہ

اللہ تعالیٰ نے ازل سے ہی اپنے بندوں کے لیے جمعہ کو افضل ترین دن قرار دیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی دن کو اپنی امت کے لیے عبادت کا دن فرمایا۔ اس کی حرمت' اس کے احترام کا حکم دیا اور ان کے بعد بھی تمام انبیاء کی امتیں اسی پر قائم رہیں' یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ آیا تو ان کی قوم نے اصرار کیا کہ اے موسیٰ! اپنے رب سے کہو کہ ہماری عبادت کے لیے جمعہ کی بجائے ''سبت'' (ہفتہ) کا دن مقرر فرما دے۔ ہم ہمیشہ اس کی حرمت کریں گے۔ شروع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس طلب کو غلط طریقہ قرار دیتے ہوئے انہیں ہدایت کی مگر اپنی فطرت کے مطابق وہ ضد پر اڑے رہے تو اللہ تعالیٰ نے جمعہ کی برکات وسعادات کو اس قوم سے واپس لے کر ان کے اور ان کی نسلوں کے لیے ''یوم سبت'' مخصوص فرما دیا اور انہیں حکم دیا کہ اس دن آرام اور عبادت کے سوا کچھ نہ کریں یعنی خرید وفروخت' تجارت و زراعت' سفر' کھانا پکانا یا ضیافت کرنا اور میل ملاپ کے لیے آنا جانا' شکار کھیلنا' کھیل کود' لہو لعب کے تمام کاموں کو موقوف کر کے صرف عبادتِ الٰہی میں مصروف رہیں۔ اس دن مالک اپنے غلام سے خدمت نہیں لے اور صرف عبادت کرتا رہے اور غلام اپنے آقا کی خدمت نہیں کرے' صرف عبادت کرتا رہے۔ اس وقت انہوں نے پکے پکے وعدے کر لیے اور کہا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ اس عہد پر قائم رہیں گے اور ابد تک یہی حکم اپنی نسلوں کو بھی دیں گے۔ اسی عہد کی وضاحت کرتے ہوئے قرآنِ پاک میں ارشادِ ربانی ہے۔

''ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ سبت (ہفتہ) کے بارے میں حد سے نہ گزرنا اور ہم نے ان سے اس کے متعلق سخت قسم کے عہد لیے۔'' (سورۃ النساء۔ ۱۵۴)

کچھ عرصہ تک بنی اسرائیل نے اپنے مطلوبہ دن کے لیے اس عہد کی پابندی کی لیکن ان کی فطرت میں تغیر اور کج روی موجود تھی لہٰذا اس عہد کی پابندی میں سستی اور غفلت شروع ہوئی پھر وہ اسے نظر انداز کرنے لگے۔ ابتداء میں یہ حکمِ عدولی انفرادی تھی۔ یہ لوگ چپکے چپکے اپنے کاروبار کرنے لگے۔ انہیں اس

خطا کا احساس بھی ہوتا لیکن دنیاوی فائدہ سامنے آتا تو دوسرے ہفتہ پھر اسی پر آمادہ ہو جاتے۔ اس طرح یہ بدعہدی اجتماعی حیثیت اختیار کرتی چلی گئی اور یہ سب بڑی ہی بے باکی سے اس کام کے لیے حیلے بہانے بنانے لگے۔ ایسے میں جب انہیں کوئی یومِ سبت کی بے حرمتی سے روکتا تو وہ جواز پیش کر کے خود کو درست ثابت کر دیتے۔ اس دوران جو نبی آتا گیا' انہیں ان کا عہد یاد دلاتا گیا' کچھ مان جاتے' کچھ تاویلیں گھڑتے یا اسے محض اپنے اسلاف کا دن سمجھتے ہوئے اپنی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر من مانی کرتے اور کچھ ناگواریوں کا اظہار کرنے لگے۔ نبی یرمیاہ کے زمانہ میں تو انہوں نے باقاعدہ ان کی مخالفت شروع کر دی اور محض ان کی حکم عدولی کے لیے اپنا اپنا تجارتی سامان لے کر بڑی شان کے ساتھ یروشلم کے پھاٹک سے گزرتے پھر حزقیل نبی کا عہد آیا جب بھی وہ اس دن کی بے حرمتی کے لیے تمام دنیاوی کام کرتے رہے' یوں وقت گزرتا رہا اور اللہ تعالیٰ انہیں بار بار ہدایت اور عہد پر عمل کرنے کے مواقع عطا کرتا رہا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے بہت عرصے کے بعد ان کی جو جماعت بحرِ قلزم کے کنارے پر آباد تھی' (جہاں اب ایلہ نام کی ایک بندرگاہ بھی ہے۔) یہ لوگ مچھلیوں کا شکار کر کے اپنا روزگار کماتے تھے۔

کسی زمانہ میں یہ ہفتہ کے چھ دن کام کرتے اور ''سبت'' کے دن اللہ کے احکامات کے مطابق عبادتِ الٰہی میں مشغول ہو جاتے پھر اتوار کے دن سے اپنا کام شروع کر دیتے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان میں بھی اللہ کے حکم سے انحراف کی عادت پڑنے لگی جس کے بعد پہلے اکا دکا نے یہ کام کیا پھر انفرادی خطا' گناہوں کا جواز پیش کرنے اور برائی سے نہ روکنے کے سبب اجتماعی خطا بنتی گئی اور پوری بستی نے سوچا کہ ہفتہ کے دن کاروبار بند رکھنے میں نقصان ہے لہٰذا اس مقدس دن مچھلیاں پکڑنے کے بجائے دریا میں جال ڈال دیں گے اور اتوار کے دن یہ تمام مچھلیاں منڈی لے جا کر فروخت کر دیں گے۔ اس طرح ہفتہ کے دن کے نقصان سے بچ جائیں گے۔ یہ خیال عام ہوا تو باقی لوگوں نے بھی کہا کہ اللہ نے کاروبار اور تجارت کرنے کو منع فرمایا ہے یا مشقت کرنے سے روکا ہے۔ جال ڈالنے سے نہیں روکا' جال ڈالنے میں نہ محنت و مشقت ہے نہ عبادت میں رکاوٹ۔ اس تاویل نے ان سب پر اس نافرمانی کا راستہ کھول دیا اور جب نافرمانی کو قبول کیا گیا تو ایک عجیب چیز سامنے آئی کہ ہفتہ کی صبح شروع ہونے سے پہلے ہی انہیں دریا کی سطح پر اتنی مچھلیاں نظر آتیں جو پورے ہفتہ کی تعداد سے بھی دس گنا زیادہ ہوتیں اور وہ دوڑ دوڑ کر اپنے اپنے جال ڈالنے لگے۔

قرآنِ پاک میں ان کی اس کیفیت کا ذکر اس طرح سے فرمایا گیا ہے۔

''انہیں یاد دلاؤ وہ واقعہ کہ وہاں کے لوگ سبت کے دن احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے اور یہ کہ مچھلیاں سبت کے دن ہی ابھر ابھر کر سطح پر ان کے سامنے آتیں اور سبت کے سوا باقی دنوں میں نہیں آتی تھیں۔ یہ اس لیے ہوتا کہ ہم ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے کو آزمائش میں ڈال رہے تھے۔ (سورۃ الاعراف۔۱۶۳)

انسان تدبیر کرتا ہے اور اللہ بھی تدبیر کرتا ہے اور یہ اللہ ہی کی تدبیر ہے کہ انسان کی آزمائش کے سیکڑوں طریقے ہیں اور سب سے عجیب طریقہ یہ ہے کہ جب اور جہاں بھی اس کے بندے اللہ کی نافرمانی کی جانب مائل ہو کر اسے درست قرار دینے لگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کی نظروں میں نافرمانی کا راستہ سہل کر دیتا ہے اور جب انسان پورے شعور اور عقل کے ساتھ اس راہ پر چل پڑتا ہے نہ خود رکتا ہے اور نہ دوسروں کو روکنے کی کوشش کرتا ہے' تب ہی اس

پر قانونِ جزا لاگو ہوتا ہے گویا کہ انسان مسلسل اپنی بدعملی سے عتاب اور عذاب کو خود دعوت دیتا ہے ورنہ اللہ درگزر کرنے اور بے حد معاف کرنے والا ہے۔ اسی کیفیت سے اس بستی کے لوگ گزرے تھے کہ انفرادی خطا سے اجتماعی خطا تک وہ اسی انداز پر جم گئے تھے۔ شروع شروع میں ان کے ضمیروں نے کبھی ملامت کی لیکن نت نئے جواز اور دلیلوں سے انہوں نے خود کو اور دوسروں کو مطمئن کردیا یہاں تک کہ ان کے ضمیر سو گئے جس کے بعد ان کے اندر سے ہفتہ کی بے احترامی کا احساس ہی مٹ گیا اور نافرمانی کے طریقے بدلتے گئے۔

شروع شروع میں انہوں نے بھی ہفتہ کے دن دریا پر جال ڈال کر اتوار کو انہیں سمیٹ کر بازار جانا شروع کیا پھر انہوں نے نئے طریقے اختیار کیے اور جمعہ کی رات سے دریا کے قریب گڑھے کھود لیتے اور ان کا راستہ دریا سے جوڑ دیتے اور جب ہفتہ کی صبح سطحِ آب پر مچھلیاں نظر آنی شروع ہوتیں تو دریا سے گڑھوں تک کا یہ راستہ کھول دیتے، تب مچھلیاں پانی کے زور سے ان گڑھوں میں جمع ہوجاتیں، تب یہ اتوار کو اپنے اپنے گڑھوں سے مچھلیاں نکال لیتے۔ یوں ہفتہ کی بے احترامی وہ جمعہ سے ہی شروع کردیتے اور اپنے زعم میں یہ ثابت کرتے کہ وہ نافرمانی نہیں کررہے بلکہ ہفتہ کو آرام اور عبادت ہی کرتے ہیں۔ اس وقت ان لوگوں میں اچھے لوگوں کی بھی ایک جماعت تھی۔ انہوں نے انہیں اس عمل سے روکنا اور اس روش کو اللہ کی نافرمانی ثابت کرنا چاہا اور کہا کہ یہ اللہ کے ساتھ ایک مذاق ہے۔ جس طرح سے حکم دیا ہے، اسی طرح سے عمل کرو۔ یہ ہدایت سن کر یہ بدلحاظی کرنے اور اپنی دلیلوں سے اس عمل کو درست ثابت کرنے لگے۔ اس سعادت مند جماعت کا اصرار تھا کہ وہ اپنے گناہوں پر توبہ کریں اور یہ روش چھوڑ دیں اور بستی والوں کی ضد تھی کہ جب یہ گناہ نہیں ہے تو ہم توبہ کیوں کریں۔ اللہ نے ہفتہ کے دن کی حرمت کا حکم دیا ہے۔ ہم جمعہ کے دن سے اپنے اپنے گڑھے کھود لیتے ہیں یا ہفتہ کی صبح سے دریا میں جال ڈال دیتے ہیں، اس پر تمہیں کیوں اعتراض ہے اور پھر ہمارا عمل ہمارے لیے اور تمہارا عمل تمہارے لیے۔ سعادت مند جماعت کا اصرار تھا کہ اللہ نے ہمیں برائی سے روکنے اور نیکی کی ہدایت کا حکم دیا ہے۔ اس پر بستی والے تلخی پر اتر آتے کہ تم نے ایک بار ہمیں ہدایت دے دی، اب کام کرلیا، اب ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ اس جھگڑے کے بعد بستی کے برے لوگ تو اپنی برائی پر جمے رہے لیکن اس صالح جماعت میں نااتفاقی پیدا ہوگئی۔ یہ دو گروہ بن گئے۔ ایک کا اصرار تھا کہ ہمیں چاہیے کہ انہیں مسلسل ہدایت دیتے رہیں اور دوسرا گروہ کہتا کہ اب انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اب یہ جانیں اور اللہ تعالیٰ۔ ادھر بستی والے یومِ سبت کی بے حرمتی سے باز آنے والے نہیں تھے۔

ادھر یہ دونوں جماعتیں نااتفاقیوں کا شکار ہورہی تھیں، گویا کہ برائی کے اِدبار سے بھلائی کرنے والے بھی کچھ اور نہیں تو اختلافِ رائے کا شکار ہورہے تھے۔ اس کے بعد صالح جماعت کا ایک گروہ ان کی ہدایت سے تھک گیا لیکن دوسرا گروہ انہیں سمجھاتا رہا اور وہ اپنے عمل پر جمے رہے۔ کچھ وقت اور گزر گیا تو صالح جماعت کے ہدایت دینے والے گروہ نے بھی ان کا بائیکاٹ کردیا۔ ان کی تجارت، لین دین میں ان سے تعلق ختم کردیا۔ ان کے آس پاس کے اپنے گھر خالی کرکے ان کے پڑوس کو، ان کے بازار اور ان کی تفریح گاہ میں جانا چھوڑ دیا۔ اس طرح اس بستی کے باقاعدہ دو حصے بن گئے۔ ایک جانب صالح جماعت رہتی اور دوسری جانب بستی کے یہ لوگ جو ''یوم سبت'' کی بے حرمتی کرتے تھے۔ انہوں نے اس ترکِ تعلق کو خوش آیند جانا کہ چلو، ہر وقت کی روک ٹوک اور ہدایتوں سے تو

نجات ملی اور اپنی من مانی کرنے کی خوشی میں انہیں یہ اندازہ ہی نہیں ہوا کہ برائی اور بھلائی میں قطع تعلق کس بات کی علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ اچھے اور بروں کو چھانٹ کر الگ الگ کرتا ہے اور ان رشتوں کا ٹوٹ جانا ہی تادیب وسزا کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے اور یہی وقت ان کی سزا اور عذاب کے لیے مقرر تھا کیونکہ ان ہی حالات کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں بندر بن جانے کا حکم صادر فرمایا اور بستی کے یہ لوگ شکل اور جسمانی ہیئت میں بندر بن گئے۔ ان کی عقل بدستور تھی کہ وہ اپنی خطا کو محسوس کر سکیں۔ سورۃ الاعراف آیت ۱۶۶ میں ارشادِ ربانی ہے۔ "آخر کار جب وہ ان ہدایات کو بالکل ہی فراموش کر گئے جو انہیں یاد کرائی گئی تھیں تو ہم نے ان لوگوں کو جو ظالم تھے ان کی نافرمانیوں پر سخت عذاب میں پکڑ لیا اور جب وہ پوری سرکشی کے ساتھ وہی کام کیے چلے گئے جس سے انہیں روکا گیا تھا تو ہم نے کہا کہ ذلیل وخوار بندر بن جاؤ۔"

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ "تمہیں اپنی قوم کے ان لوگوں کا قصہ تو معلوم ہی ہے جنہوں نے سبت کے قانون کو توڑا تھا۔ ہم نے انہیں کہہ دیا کہ بندر بن جاؤ اور اس حال میں رہو کہ ہر طرف سے تم پر دھتکار پھٹکار پڑے۔ اس طرح سے ہم نے ان کے انجام کو اس زمانے کے لوگوں اور بعد کے آنے والی نسلوں کے لیے عبرت اور ڈرنے والوں کے لیے نصیحت بنا کر چھوڑا۔" (البقرہ۔۶۶)

یوں طویل مدت تک ڈھیل دینے اور انہیں ان کی من مانی کرنے دینے کے بعد اپنے احکام کی خلاف ورزی کرنے کی پاداش میں اللہ تعالیٰ کے عذاب نے انہیں اس طرح پکڑا کہ وہ عبرت کا نشان اور اللہ سے ڈرنے اور برائی سے بچنے کی کوشش کرنے والوں کے لیے نصیحت بن کر رہ گئے۔

☆☆......☆☆

دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ' خوب صورت رابطوں کی دلفریب محفل

خط بھجوانے کے لیے پتا: ماہنامہ دوشیزہ ڈائجسٹ۔ 110' آدم آرکیڈ' شہید ملت روڈ' بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی
E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بہت پیارے ساتھیو! 2014ء جس تیزی سے آیا، اُسی تیزی سے گزر گیا۔ یادر کھنے کی بات یہ ہے کہ ہم نے اس گزرے سال سے کیا سیکھا، اگر ہم نے اپنی غلطیوں پر نظر رکھی اور دوبارہ سے غلطیوں کو نہ دہرایا تب تو ہم کامیاب رہے لیکن اگر ہم پھر سے شتر مرغ کی طرح گردن ریت میں دھنسائے دنوں کو گنتے رہے تو ہمارا حال بھی ایسا ہی ہوجائے گا جیسا اکثر نادان دوستوں کا ہوا کرتا ہے۔ بس دعا ہے کہ خدا ہم سب کو نئے سال میں وہ سب کچھ عطا کرے جس کے لیے ہم نے اس برس جستجو کی تھی۔ (آمین)

اس ماہ ہمارے دوست لکھاریوں کی کیا خبریں ہیں ملاحظہ کرتے ہیں۔

☆ سب سے پہلے ہماری سینئر لکھاری ساتھی افسر سلطانہ کو خیریت کے ساتھ حج کی ادائیگی سے واپسی پر مبارک باد۔

☆ پروفیسر صفیہ سلطانہ مغل کے بیٹے شرجیل اقدس کی شادی خانہ آبادی 14 دسمبر کو انجام پائی (بہت بہت مبارکاں)

☆ ہماری ہر دلعزیز رضیہ مہدی ایک بہت پیاری نواسی کی نانی جان بن گئی ہیں۔ عمر درازی اور صحت مندی کی دعاؤں کے ساتھ بہت بہت مبارکباد رضیہ جی کو۔

☆ سب کی پیاری رضوانہ کوثر پچھلے ماہ صدمے سے دوچار ہوئیں، اُن کی کزن سعیدہ اشرف 20 نومبر کو وفات پا گئیں۔ مرحومہ کی مغفرت اور اعلیٰ درجات کے لیے دعا کیجیے گا۔

☆ اس ماہ 14 دسمبر کو نسیم نیازی، 15 دسمبر کو سویرا فلک اور 8 دسمبر کو فرحت جمال صاحبہ کو جنم دن کے موقع پر بہت بہت مبارک باد۔

🖂: محفل میں سب سے پہلی آمد ہے کراچی سے نیئر رضاوی کی۔ لکھتے ہیں شکر گزار ہوں کہ رب کریم نے اس قابل کیا کہ میں بھی لکھ رہا ہوں اور شکر گزار ہوں آپ کا کہ آپ نے میری تحریروں کو اشاعت کا موقع عنایت کیا۔ ماہ نومبر کا ایک ہی ناولٹ پڑھا اور نسرین اختر بھٹی صاحبہ کا 'اس راہِ وفا میں' نہایت ہی پسند آیا۔ اللہ کرے زورِ قلم اور عطا ہو، ایک اور غزل ارسال کر رہا ہوں اُمید کرتا ہوں کہ آپ کی مہربانی سے جلد اشاعت پذیر ہوجائے گی۔

ھ: نیئر بھیا! آپ کی محفل میں باقاعدگی سر آنکھوں پر مگر یہ کیا کہ ابھی نظر بھی سیر نہ ہوئی کہ نامہ بر چل دیا۔

✉: کئی ماہ بعد ہماری ہر دلعزیز اور سینئر لکھاری، شاعرہ ساتھی فرحت صدیقی کی لندن سے محفل میں آمد ہے لکھتی ہیں میں 9 اگست سے لندن میں ہوں نامعلوم وقت کے لیے...... تفصیل شاہدہ شکیل نے بتادی ہوگی۔ سارہ سہگل کے ہاتھ دونوں دوشیزہ وصول ہوئے۔ اگست اور ستمبر کے، جو انہی نے سارہ کو بھجوا دیے تھے۔ بہت انجوائے کیا۔ دونوں قسط اکٹھی پڑھیں۔ تقریب کی تصاویر دیکھ کر ایسا لگا کہ میں دلکشا ہال میں ہی بیٹھی ہوں۔ مجھے رخسانہ کی کمی پتا نہیں کیوں لندن میں بہت محسوس ہو رہی ہے۔ 'رقص جنوں' کہانی بھیج رہی ہوں سارہ 6 اکتوبر کو واپس جا رہی ہے، کراچی سے پوسٹ کردے گی۔ اگست اور ستمبر کے دونوں شمارے رات رات جاگ کر پڑھ ڈالے ہیں ماشاء اللہ دونوں پرچے لاجواب ہیں۔ بے حد خوبصورت کہانیاں، اور اس مرتبہ دو دو قسط اکٹھی پڑھنے کا لطف ہی آ گیا ہے۔ عید نمبر کے حوالے سے ساری کہانیاں ہی خوبصورت تھیں 'بہانے' نے دل دکھا دیا۔ فرح اسلم کی بے حد خوبصورت کہانی۔

ھ: فرحت جی! آپ کی محبت کا شکریہ کیسے ادا کروں۔ بس یہی دعا ہے کہ خدا آپ کو صحت وسلامتی عطا کرے اور میرا یقین ہے۔

رکھتے ہیں جو اوروں کے لیے پیار کا جذبہ
وہ لوگ کبھی ٹوٹ کے بکھرا نہیں کرتے

آپ کی **Mam** بھی سرخرو ہوں گی۔

✉: مسز نوید ہاشمی نارتھ ناظم آباد سے رقم طراز ہیں، پیارے ساتھیوں، السلام وعلیکم! پرچہ ہمیشہ کی طرح شاندار تھا شمسہ فیصل کو پیارے بیٹے کی بہت بہت مبارکباد قبول۔ عقیلہ حق کے بھانجے کے لیے دعاگو ہوں خدا انہیں صحت عطا فرمائیں۔ سنبل کی خالہ کو حج کی بہت بہت مبارکباد، شمع حفیظ کا خط محفل کی جان لگا۔ اچھا کیا آپ محفل میں آئیں۔ کاشی چوہان کی شکرگزار ہوں اتنی اچھی دوست کو محفل میں دوبارہ شامل کرنے پر مجبور کیا۔ سنبل کا خط اتنا پیارا تھا پڑھ کر مزا آیا۔ احمد سجاد کی محبت سے گندھا خط میٹھا میٹھا ہمیں بھی میٹھاس دے گیا۔ خدا کا شکر اور دوستوں کا شکریہ ادا کرنے پر دوستوں کا مان بڑھ جاتا ہے۔ حمیرا خان نے سیلاب پر روشنی ڈالی۔ خدا سب کی حفاظت فرمائے (آمین) کاشی چوہان کے لہجے اور اپنائیت پر روشنی ڈالی واقعی کچھ لوگ ہوتے ہی اپنے ہیں یہ اپنا اپنا کاشی چوہان میرا بھائی سب کا ہے۔ ہمیں فخر ہے جب تک کاشی چوہان ہے انشاء اللہ سچی کہانیاں اور دوشیزہ ایسے ہی ترقی کرتے چلے جائیں گے۔ وہ ڈائجسٹ ایسے ہی جلوہ گر ہوں گے۔ آسمان پر چمکتے چاند کی مانند جو دوسروں کو اندھیرے میں روشنی دیتا ہے۔ نومبر کا رسالہ نہیں ملا آج چھ تاریخ ہوگئی۔ اس لیے تبصرہ صرف اکتوبر کے رسالے کا کر رہی ہوں۔ دردانہ نوشین خان میٹرو بس گاؤں کی جہالت کا ایسا نقشہ ہے۔ ایسا نوحہ ہے۔ جس کا ماتم نہیں کر سکتے۔ نسیم سحر، مینا تاج، فصیحہ آصف خان، نوشین اقبال نوشی کے افسانے پسند آئے۔ ناول نعمان اسحق، فرزانہ آغا کے شاندار تھے۔ سب سے زیادہ شاندار مومنہ بتول کا افسانہ آگہی کا پل تھا۔ ایک سچ جو کڑوا تھا تلخ تھا۔ واجدہ تسنیم کا انتخاب بھی زبردست رہا۔ دوشیزہ گلستان بہت خوبصورتی سے اسماء اعوان سجاتی ہیں، جس کی خوشبو ہر سو مہک جاتی ہے۔ نئے لہجے نئی آوازیں میں یاسمین اقبال، عادل حسین، عنبرین نعیم کی شاعری اچھی لگی۔

زین العابدین کے نٹ کھٹ شرارتی سے جواب پسند آئے۔ الٹراوائلٹ شعاعیں ادار یہ بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے کاشی چوہان نے۔ مگر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ خدا سے رحم کی دعا کر سکتے ہیں۔ خدا ہمارے دل میں محبت ڈال دے۔

ھ: بہت عزیز مسز نوید ہاشمی! اُمید ہے دونوں پرچے مل گئے ہوں گے۔ آپ کی درخواست متعلقہ شعبہ تک پہنچا دی گئی ہے۔ اب یقیناً آپ کو پرابلم نہیں ہوگی۔

☒: کراچی سے جگنجل میتلو محفل میں موجود ہیں، لکھتی ہیں محترم کاشی چوہان صاحب ہمیشہ خوش وخرم رہیے۔ آمین، امید ہے کہ رب پاک تمام دوشیزہ کے اسٹاف تمام لکھاریوں سمیت خوش وسلامت ہو آمین۔ کسی وجہ سے نومبر کا دوشیزہ نہیں پڑھ سکی۔ اس لیے تبصرہ دسمبر میں انشاء اللہ۔ کہانی بھیج رہی ہوں اُمید ہے ضرور حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ آخر میں منزہ سہام کو بہت بہت آداب نیک خواہشات کے ساتھ۔

ھ: جگنجل جی! سلامت رہیے۔ آپ کی مختصر آمد...... خیر اس بار تو معاف کیا مگر آپ جیسے ریگولر محفل کے مہمان ہمارا مان ہوتے ہیں۔

☒: روشانے عبدالقیوم کراچی سے محفل میں براجمان ہیں۔ لکھتی ہیں، مدیر صاحب کیسے ہیں آپ؟ اور تمام اسٹاف، پڑھنے والوں کو سلام، بہت ساری شکایتیں ہیں آپ سے، ایک تو آپ انتظار بہت کرواتے ہیں۔ اب آتی ہوں اپنے افسانوں کی طرف جنہوں نے میرا پہلا اور پھر دوسرا افسانہ (جو کہ دوشیزہ میں پہلی تحریریں تھیں) پڑھا، سراہا، پسند کیا۔ اُن سب کا بہت شکریہ۔ احمد سجاد بابر صاحب کا بے حد شکریہ میری دونوں تحریروں پر اُن کی تعریف میں کبھی نہیں بھلا سکتی۔ بہت خوبصورتی سے انہوں نے تبصرہ کیا میرے دونوں افسانوں پر۔ میری دوسری تحریر کی تعریف میں انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ اس بار روشانے عبدالقیوم تعطل کے بعد آئیں، تو میں عرض کرتی چلوں کہ میں لمبے عرصے کے بعد نہیں آئی کاشی چوہان صاحب لمبا انتظار کرواتے ہیں۔ دوشیزہ بہت اچھا اور خوبصورت رسالہ ہے، اللہ آپ کو اور ادارے کو ساتھ عزت کے قائم و دائم رکھے، آخر میں دھمکی...... میرا خط بغیر سنسر کیے پورا شائع کر دیجیے گا ورنہ...... ابو سے شکایت کر دوں گی (ہاہاہا) اب بس، بہت ہو گیا خدا حافظ۔

ھ: روشانے صاحبہ! آپ کا تبصرہ کاٹنا پڑا کچھ وجوہات بتا نہیں سکتے۔ مگر محفل میں آمد مستقل کریں۔ ورنہ......

☒: شمع حفیظ کی کراچی سے آمد ہے لکھتی ہیں ہمیشہ خوش رہو، اسے افسانہ کہہ لو یا ناولٹ، بھیج رہی ہوں۔ یہ تحریر میں نے بڑے دل سے لکھی ہے اور مجھے اپنی تحریر کردہ اس کہانی سے محبت ہے۔ اُمید کرتی ہوں تمہیں بھی پسند آئے گی اور سناؤ تم کیسے ہو۔ یقیناً مصروف بلکہ بہت مصروف ہوں گے۔ ذمہ داری بھی تو اتنی بڑی اٹھارکھی ہے۔ چلو میں تمہارے لیے دعائے خیر کر رہی ہوں۔ سلامت رہو اور ہر ماہ پڑھنے والوں کو اچھا مواد عطا کر کے دعائیں لیتے رہو۔ ٹھیک ہے نا؟ شمارے پر میرا تبصرہ انشاء اللہ اگلے ماہ سے شامل رہے گا اور ناغہ کبھی نہیں آئے گا۔ خوش رہو، آباد رہو، سلامت رہو۔

ھ: شمع جی! پہلی عورت، آخری مرد تو اسی ماہ شامل اشاعت ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی یہ تحریر بھی دوشیزہ کا حصہ ہوگی۔ تبصرے کا ابھی سے انتظار شروع کر رہا ہوں۔

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

نومبر 2014 کا نتیجہ: قارئین نے مندرجہ ذیل تحریر کو پسند کیا ہے

''محبت اعزاز ہے'' سنبل

آپ کی نظر میں اس ماہ ''دوشیزہ'' کی بہترین تحریر کون سی ہے؟

دوشیزہ — دسمبر 2014

عنوان: ____________

قلم کار: ____________

نام: ____________

پتا: ____________

ماہنامہ دوشیزہ کراچی

✉: چکوال سے یہ آمد ہے نگہت سیما صاحبہ کی۔ یہ ہماری وہ لکھاری ساتھی ہیں جن کی تحریروں کا ہمیں دل سے انتظار رہتا ہے۔ سیما جی لکھتی ہیں، محترم کاشی السلام وعلیکم! میں تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد لاہور سے آئی تو دوشیزہ کے ستمبر اور اکتوبر کے دونوں شمارے اکٹھے دیکھے۔ سب اچھا لکھ رہے ہیں۔ ایوارڈ تقریب کا حال گھر بیٹھے معلوم ہوگیا۔ سب ایوارڈ ونرز کو بہت مبارک ہو۔ اُم مریم کے ناول کی شروع کی اقساط تو نہیں پڑھی تھیں لیکن اب پڑھ رہی ہوں۔ بہت اچھا موضوع چنا انہوں نے۔ اپنے علم اور پرہیزگاری پر نازاں کئی کریکٹرز بریرہ جیسے نظر سے گزرے ہیں۔ تحریر میں بھی روانی ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ...... دوشیزہ کی محفل کو بہت دھیان سے پڑھا لیکن اپنا خط کہیں نظر نہ آیا۔ میں خط نہ پا کر ایسے ہی پریشان ہوئی جسے رضیہ مہدی ہوئی تھیں، غلط جملہ چھپ جانے پر۔ حالانکہ میں نے تو غور ہی نہیں کیا تھا اس جملے پر اور میں نے تو وہی مفہوم نکالا تھا جو رضیہ کہنا چاہتی تھیں۔ رضیہ جی مجھے اپنے متعلق لکھے گئے آپ کے ہر لفظ کو پڑھ کر بہت خوشی ہوئی تھی اور میں نے آپ کی دوستی کی آفر کو دل و جان سے قبول کیا تھا اور اُسی وقت خط بھی لکھا تھا۔ اپنے سچے احساسات کے ساتھ (اب پتا نہیں اُس وقت کیا لکھا تھا یاد نہیں) لیکن خط یا تو کاشی کو ملا ہی نہیں یا پھر ملا تو لیکن کہیں اِدھر اُدھر ہوگیا۔ خیر آپ چکوال ضرور آئیں۔ مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ ایک کہانی ذہن میں ہے۔ جو صرف دوشیزہ کے لیے سوچی ہے۔ وقت ملتے ہی لکھوں گی۔ اُمید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ سب کو درجہ بدرجہ سلام و دعا۔

✍: عزیز ترین نگہت جی! اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ مجھے آپ کی تحریر کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ اب پتا نہیں کب میں آپ کی تحریر سے فیض یاب ہوسکوں گا۔ آپ کا تبصرہ حوصلہ افزائی کا باعث بنتا ہے۔

✉: کراچی سے ہماری ہردلعزیز سنبل عرض کرتی ہیں ڈیئر کاشی! السلام وعلیکم، اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ ہماری طرف سب خیریت ہے اور تم سب کی خیریت و عافیت کے لیے رب کریم سے دعا گو ہوں۔ سب سے پہلے ٹائٹل...... صنم اچھی لگتی ہے اگر اس کی آنکھوں میں کاجل ہوتا۔ ٹائٹل صنم کی آنکھوں کی طرح سویا سویا سا رہا۔ اداریہ غور طلب ہے۔ کاشی تمہاری خالہ کے انتقال کا پڑھ کر شدید دکھ ہوا۔ فون پر تعزیت اس لیے نہیں کی کہ تعزیت میرے لیے دنیا کا سب سے مشکل مرحلہ ہے۔ اللہ تمہاری خالہ کو اپنے بہترین و پسندیدہ بندوں میں جگہ دے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے (آمین) یہی سب کہنا ہے مجھے رضیہ مہدی کے بھائی اور اُم مریم کے ماموں کے لیے۔ اللہ آپ کے پیاروں کو اعلیٰ مقام اور آپ کو صبر عطا فرمائے (آمین) دلشاد نسیم اور زمر نعیم کو سال گرہ مبارک، اب آپ دونوں سے دنیا کا مشکل ترین سوال کروں۔ آپ دونوں نے عمر عزیز کی کتنی بہاریں دیکھ لی ہیں (ہاہاہا) نگہت اعظمیٰ کو کتاب کی اشاعت پر مبارک باد۔ ارے دردانہ جی یہ آپ نے کیا کہہ دیا کہ یہ آخری ملاقات تھی اور میں کہتی ہوں آپ ہر بار آئیں گی کیونکہ

جذبۂ عشق سلامت ہے تو انشاء اللہ
کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بندھے

نگہت جی میں نے آپ کا اور صبیحہ شاہ کا پوچھا تھا کاشی سے، کاشی گواہ ہوناں! مگر تاثرات میں عموماً ہم ان کے بارے میں لکھتے ہیں جن سے تقریب میں ملاقات ہوتی ہے اب تو گلہ دور ہوگیا ہوگا۔ عقیلہ شکریہ کی بات نہیں ہے۔ ہم سب دوشیزہ فیملی کا حصہ ہیں۔ ہمارے کسی فیملی ممبر پر آنچ آئے گی تو ہم اس کے ساتھ یونہی کاندھے

سے کاندھا ملا کر کھڑے ہوں گے۔ ناہید جی آپ نے اچھا لکھا تھا تو ہم نے پسند کیا۔ کاشی مجھے ایوارڈ کی تقریب کی اپنی ایوارڈ لیتے ہوئے اور گروپ کی تصاویر چاہئیں کیا کروں؟ دلشاد نسیم دل کی باتیں خوب کرتی ہیں۔ اگر تم نہ ہوتے اور شناخت! میں بھی شوق سے دیکھتی ہوں، اچھے ہیں۔ صنم جنگ میری فیورٹ ہے سو اچھی لگی۔ دوشیزہ گلستاں کے گل بھی خوب مہکے، نئے لہجے میں سب ہی اچھے جا رہے ہیں۔ مگر سباس گل اور جیجل کی شاعری عنبرین نعیم کے اشعار نے دل کو چھولیا۔ زین لگے رہو منا بھائی، خودکشی اچھی تحریر تھی۔ مختار آپا نیکی کما رہی ہیں۔ کچن کارنر میں بھنا گوشت اور ہنٹر بیف مزے کے تھے۔ حکیم صاحب جڑی بوٹیوں کے نام اس قدر ثقیل ہیں کہ بدہضمی ہو جاتی ہے اور خرم مشیر کی کیا بات ہے وہ تو چھائے ہوئے ہیں ہر جگہ۔ تیرے عشق نچایا نے نیا موڑ لیا ہے جو کہ خوش آئند ہے۔ رحمٰن رحیم میں عبدالغنی کو لاریب سے اجازت تو لینی چاہیے تھی۔ انصاف تو بعد کی بات ہے دوسری شادی غلط نہیں ہے۔ غلط تھا لاریب کو اعتماد میں لیے بغیر اس کے اعصاب پر نیوکلیئر بم داغنا، آئینہ، عکس تیزی سے اور خوبصورتی سے اختتام کی جانب محوسفر ہے ویلڈن، ورکنگ وومین اچھا ناولٹ تھا۔ تہنیت نے اچھی بھلی اپنی خوبصورت لائف کو معاشی جہنم میں جھونک دیا۔ دنیا چل دی نام کی طرح آج کے ماحول کے عین مطابق تھا۔ پرندۂ دل بہت خوبصورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ ویلڈن نعمان (ویسے ایسی سوتنوں سے مجھے بھی ملنا ہے) الماس روحی مرد کی فطرت اور اُس کی سوچ کو واضح کرتا اور عورت کی بے وقوفی کو واضح کرتا افسانہ تھا۔ اب اپنے افسانے کے بارے میں کیا کہوں؟ صدف آصف نے آخر میں سارا زلزلہ شکیل پر گرا دیا حالانکہ بڑی پرانی بات ہے کہ مرد کو اگر گھر کا سکون نہ ملے تو وہ باہر سکون تلاش کرتا ہے۔ عورت کو بیوی ہونا چاہیے ٹیچر یا ڈکٹیٹر نہیں۔ عارف شینؔ، نسرین اختر اور صائمہ حیدر آپ تینوں سے معذرت کہ آپ تینوں کی تحاریر میرے ڈائجسٹ میں موجود نہیں تھیں کیونکہ میرے ڈائجسٹ میں رحمٰن، رحیم، سدا سائیں دو مرتبہ لگا ہوا تھا سو بہت بہت معذرت۔ چائے کی پیالی ایک خوبصورت افسانہ ہے۔ ارتاب احمد نے اپنے ہاتھوں ارینہ کی خالص محبت کھودی۔ اللہ تم سب کو خوش رکھے آباد رکھے۔ اور تمہیں تو خصوصاً کہ تم جو ہم رائٹر کو مان و محبت دیتے ہو۔ ہماری بات سنتے ہو جزاک اللہ۔

ط: بہت عزیز سنبل جی! اتنی ساری دعائیں دے دیں۔ جزاک اللہ اپنا بھی بہت خیال رکھیے گا کہ آپ بھی ہمارے لیے بہت اہم ہیں۔

✉: کراچی سے ثمینہ عرفان لکھتی ہیں محترم کاشی چوہان صاحب السلام وعلیکم!

کسی کا لفظ کسی کا خیال بھی سمجھو
جواب دینے سے پہلے سوال بھی سمجھو

ہم آپ لوگوں سے ناراض ہونے کا تو سوچ بھی نہیں سکتے۔ اتنی محبت اور پیار کرنے والے لوگوں سے بھلا کون ناراض ہوسکتا ہے۔ آپ کو ہمارا تبصرہ ناراضگی سے بھرا لگا۔ تو اس کی وجہ بھی آپ لوگوں کی اپنائیت ہے کیونکہ شکوے شکایت اور گلہ یہ سب کچھ اپنوں سے کیا جاتا ہے۔ بقول شاعر

میں نے تمہیں اپنا سمجھا
اپنوں سے شکایت ہوتی ہے

دل کی باتیں دلشاد نسیم کی تحریر 'قانون' بہت زبردست تھی اور پھر ان کے بابا کی غزل کا تو جواب نہیں۔ منی اسکرین، علی رضا عمرانی شاید صحیح لکھتے ہیں۔ اکثر ڈرامے ہماری تہذیب ثقافت پر طمانچہ ہیں۔ ہم ڈرامے دیکھتے ضرور ہیں کہ ٹیلی ویژن کے 'اربابِ اختیار' سے اگر زندگی میں ملاقات ہو تو پوچھیں کہ آپ کے ڈراموں میں جو دکھایا جارہا ہے۔ وہ ہمارے معاشرے میں کتنے فیصد ہو رہا ہے۔ ویسے کاشی ذرا اپنے کان قریب لائیے ایسا کچھ افسانوں میں بھی لکھا جارہا ہے۔ لیکن ڈراموں کے مقابلے میں افسانوں میں نوعیت کچھ کم ہے اور بھلا نقار خانے میں طوطی کی آواز کس نے سنی۔ صنم جنگ کا انٹرویو اچھا تھا۔ اب دیکھیے نا 'ورکنگ وومین' میں تہنیت کے موڈ کے اُتار چڑھاؤ اور نخرے عام زندگی میں اتنی دور، اتنا کرایہ بھاڑا لگا کر لے جانے والے پاکستانی شوہر یہ سب کچھ برداشت کریں گے؟ ناممکن اور پھر محترمہ کو لندن کا موسم سوٹ نہیں کر رہا تھا۔ گیلا گیلا، سیلا سیلا، وہ تو کراچی کی عادی تھی جہاں بادل 'اکثر' نظر آتے تھے، کہاں بادل...... پچھلے دو سال سے تو بارش کو ترس رہے ہیں۔ موسم میرے پرندۂ دل میں بھی کیا زبردست سوکنیں ہیں۔ محبت اعزاز ہے، سنبل واقعی اعزاز کی مستحق ہیں۔ افسانہ بہت اچھا تھا 'شک' ٹھیک ہی تھا۔ مہنگا سودا، ڈپٹی نذیر احمد کی کہانیوں کے تناظر میں لکھی گئی کہانی اس دور میں ایسا ناممکن ہے۔ ایک دو اور افسانے حقیقی زندگی سے دور، لیکن اگر کچھ کہا ہم نے تو آپ کو لگے گا کہ ہم ناراضگی کی وجہ سے کہہ رہے ہیں۔ نئے لہجے نئی آوازیں، میں شاعری اچھی تھی۔ شاعری بھی ادب کا ایک لازمی حصہ ہونے کے باوجود 'نثر' نگاروں کے مقابلے میں اِسے کیوں نہیں کسی ایوارڈ سے نوازا جاتا ہے۔ اگر مجھے کچھ فرصت کے لمحات ملے تو میں آپ کے پرانے شماروں میں سے ان ناموں کو یکجا کر کے بھیجوں گی جنھوں نے بڑے زبردست موضوعات پر شاعری کی ہے۔ دل کو چھو لینے والی کاشی آپ کے اداریے 'لاج' کے پس منظر پر اپنی شاعری بھیجنے کی جسارت کر رہی ہوں۔ شاید سال گرہ نمبر پر ہماری شاعری کو بھی شامل ہونے کا اعزاز حاصل ہو جائے شکریہ، رضیہ مہدی اور اُم مریم سے دلی تعزیت اُن کے مرحومین کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کے لیے دعا گو۔ دلشاد نسیم اور زمر نعیم کو سال گرہ مبارک اور نگہت اعظمیٰ کو افسانوں کی نئی کتاب کی اشاعت مبارک ہو۔ آپ سب کو بھی بہت دعا اور سلام، خدا تعالیٰ آپ سب کی محنتوں کو بارآور کرے۔ ہم جتنی بھی محنت کر لیں اچھا خط لکھنے پر چائے کا سلسلہ تو ختم بھی ہو گیا۔ اُمید پر دنیا قائم ہے اجازت۔

ج: بہت اپنی، بہت خاص ثمینہ جی! خدا گواہ ہے، میرے دل سے اپنے پیاروں کی سلامتی اور تندرستی کی دعائیں نکلتی ہیں۔ بارگاہِ دل میں آپ سب کا ایک خاص مقام ہے۔ آپ کی باتیں، محبت کی تلخی اور شیرینی لیے ہوئے مجھے بہت پسند ہیں۔ تبصرے کی باقاعدگی کا شکریہ۔ آپ کی شاعری انشاء اللہ سال گرہ نمبر میں بھی شامل ہوگی۔

✉: کراچی سے یہ آمد ہے ہماری لکھاری ساتھی روبینہ شاہین کی لکھتی ہیں، نومبر کا ناولٹ نمبر لیٹ موصول ہوا۔ اتنی دیر کیوں؟ اب بتائیں کب پرچہ پڑھیں کب تبصرہ کریں۔ اس جانب توجہ دی جائے تو بہت سارے قارئین کا بھلا ہو جائے گا۔ اب آتے ہیں پرچے کی طرف۔ کاشی جی! آپ نے 'لاج' لکھ کر بہت سارے چہروں سے پردہ ہٹا دیا۔ زادِ راہ ہمیشہ کی طرح بہت خاص رہا اور اب آ گئی محفل محفل میں خوب رونق لگی ہوئی

تھی۔ کاشی آپ کی خالہ کا بہت افسوس ہوا۔ خدا اُن کی مغفرت کرے آمین۔ دلشاد نسیم کے دل کی باتیں خوب رہیں۔ اور اُن کے فادر کی شاعری کمال تھی۔ صنم جنگ سے ملاقات اچھی رہی۔ دوشیزہ میں شوبز کی شخصیات کو ہائی لائٹ کیا کریں۔ لوگ اچھے ایکٹرز، رائٹرز اور ڈائریکٹرز کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ منی اسکرین خوب تھا۔ ناول دونوں ہی بہتر ہیں۔ خاص طور پر آئینہ عکس اور سمندر خوبصورت ترین طریقے سے اختتامی منازل طے کر رہا ہے۔ ویلڈن عقیلہ حق جی! رحمٰن رحیم سدا سائیں کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ روح جھنجوڑتی دل میں سرایت کرتی یہ تحریر بلاشبہ شاہکار ہے۔ نعمان اسحٰق کا میرے پرندہ دل ایک عام سا ناول ہے مگر نعمان کی گرفت مضبوط ہے۔ جس کے لیے نعمان داد کے مستحق ہیں۔ ناولٹ نمبر میں رضیہ مہدی کی ورکنگ وومن، صائمہ حیدر کی مریم فاطمہ بلاشبہ اعلیٰ پائے کی تحریریں ثابت ہوئیں۔ جبکہ نیلم الماس کی دنیا پٹل دی اور نسرین اختر بھٹی کا ناولٹ اِس راہِ وفا میں بھی بہتر تھیں۔ اس ماہ سب سے زیادہ متاثر کرنے والی تحریر سنبل کی محبت اعزاز ہے رہی۔ واہ سنبل جی! کیا کمال تحریر تھی۔ مزہ آ گیا۔ صدف آصف کی اب اعتبار آیا بھی بہترین رہی۔ مگر الماس روحی کی خوابوں کی دہلیز نے بور کیا۔ جبکہ عارف شین روہیلہ کا مہنگا سودا مناسب لگا۔ انتخابِ خاص میں محمد حامد سراج کی چائے کی پیالی بہت خوبصورت ترین انتخاب ثابت ہوا۔ دھیرے دھیرے گنگناتا ہوا، ندی کی روانی لیے، شوکت جمال صاحب کی خودکشی نے رنگِ کائنات میں خوب رنگ بھرے۔ دوشیزہ میگزین میں اسماء اعوان کا سجایا ہوا دوشیزہ گلستاں ہمیشہ ہی مسرور کر دیتا ہے۔ نئے لہجے، نئی آوازیں میں شاعری بہت بہتر ہے۔

انسان دوست، صحافی اور بہترین شاعر
"محمود شام"
محمود شام جنہوں نے صحافت کو نئی جدت بخشی۔
محمود شام جن کی شاعری دل کو چھو لیتی ہے۔
بہت جلد "سفر نامۂ محمود شام" پہلی بار "سچی کہانیاں" میں نظر قارئین ہوگا۔

زین العابدین کے جوابات کا سلسلہ، یہ ہوئی نا بات بھی خوب ہے۔ لولی وڈ بولی وڈ کا بہت کامیاب سلسلہ ہے۔
نفسیاتی اُلجھنیں، کچن کارنر، حکیم جی! اور بیوٹی گائیڈ سب موثر سلسلے ہیں ان سلسلوں کا مجھے ہر ماہ انتظار رہتا ہے۔
لیجیے جناب تبصرہ ہوا پورا۔ اگلے ماہ پھر ملیں گے اب دیجیے اجازت۔
ھ: پیاری روبینہ جی! تبصرہ شاندار ہے آپ کا مگر اب یہ غیر حاضریاں کیوں؟ بس اب آپ کا تبصرہ مجھے ہر ماہ چاہیے۔

✉: لاہور سے ہماری دوست لکھاری بینا عالیہ محفل میں شریک ہیں۔ عرض کرتی ہیں امید ہے آپ بمعہ دوشیزہ اراکین خیریت سے ہوں گے۔ اس مرتبہ دوشیزہ چودہ نومبر کو ملا شکریہ، آپ کی خالہ کے انتقال پر دلی افسوس ہوا۔ خالائیں بہت پیار کرنے والی ہوتی ہیں خلوصِ دل سے دعا گو ہوں۔ خداوند اُن کے درجات بلند فرمائے آمین۔ اس بار خبریں کچھ تکلیف دہ تھیں۔ رضیہ مہدی کے چھوٹے بھائی کی وفات کی خبر تھی۔ دل بہت اُداس ہوگیا اللہ پاک کسی بہن کو بھائی کا دکھ نہ دکھائے۔ رضیہ جی کے غم میں برابر کی شریک ہوں۔ اللہ پاک حبیبہ سید کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے (آمین) اُم مریم کے ماموں کا بہت افسوس ہوا۔ مریم آپ کے غم میں برابر کی شریک ہوں۔ خداوند انہیں جنت میں اونچا درجہ عطا فرمائے (آمین) دلشاد نسیم اور زمر نعیم کو سال گرہ مبارک۔ زمر اب تمہاری طبیعت کیسی ہے۔ پرچہ ماشاء اللہ زبردست جارہا ہے۔ سب رائٹرز بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ یہ لوگ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ رضوانہ آپی آپ کی طبیعت کیسی ہے۔ نسیم نیازی اکٹھی دو کتابیں شائع ہونے پر ڈھیروں ڈھیر مبارک باد۔ جن دوستوں کو میرا ناول تیرے عشق نچایا پسند آرہا ہے آپ سب کی بے حد ممنون ہوں۔ قارئین کی حوصلہ افزائی ہی مجھے مزید اچھا لکھنے کا حوصلہ بخشتی ہے۔ رخسانہ سہام مرزا آپ کی طبیعت اب کیسی ہے۔ اللہ پاک آپ کو صحت کے ساتھ درازعمر عطا فرمائے آمین۔ منزہ کو سلام، اجازت چاہوں گی۔

ھ: بہت اچھی بینا جی! آپ کی اپنائیت نے ہمارے غم دور کردیے۔ خدا سب کو اپنی امان میں رکھے۔

✉: کراچی سے نسیم سحر کی محفل میں آمد ہے، لکھتی ہیں کاشی بھائی اللہ تعالیٰ آپ اور آپ سے وابستہ ہر شخص کو اپنی امان میں رکھے آمین۔ معذرت خواہ ہوں شماروں پر تبصرہ ارسال نہیں کرسکی۔ خط لکھنے میں ذرا سست واقع ہوئی ہوں۔ لیکن بہر حال اکتوبر اور نومبر دونوں شمارے زبردست رہے۔ نومبر کے شمارے میں سال گرہ نمبر کے بارے میں پڑھا اسی لیے فوری خط لکھا۔ میری بھی دو کہانیاں آپ کے پاس ہیں تیسری اس خط کے ساتھ بھیج رہی ہوں۔ پلیز میری بھی کسی کہانی کو سال گرہ نمبر میں جگہ دیجیے گا۔ آپ کے اداریے بہترین ہوتے ہیں۔ نومبر کا شمارہ ذرا لیٹ ملا ہے۔ پورا نہیں پڑھ سکی ورنہ اس خط کی جگہ تبصرہ روانہ کرتی۔ خیر زندگی رہی تو پھر سہی۔ آپ کو اور تمام اسٹاف کو سلام اور دعائیں۔

ھ: پیاری نسیم! سلامت رہیے، اپنی پہچان کے لیے آپ کی تمہید اچھی نہیں لگی۔ آپ کی تحریر آپ کی پہچان ہوتی ہے۔ اور کچھ نہیں جن صاحب کا آپ نے نام لیا۔ انہیں کون جانتا ہے بی بی۔

✉: لاہور سے یہ ہماری بہت اچھی شاعرہ اور قاری فریدہ جاوید فری رقم طراز ہیں اس مرتبہ دوشیزہ پھر لیٹ ملا چی کہانیاں اور دوشیزہ دونوں ہی میرے فیورٹ ڈائجسٹ ہیں۔ فصیحہ جی کا افسانہ کالا جوتا ہمیں بے حد پسند آیا

"زہرِ عشق"

☆ عشق ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہے گا!

☆ جنات کی حقیقت اللہ کے کلام قران اور دیگر آسمانی کتابوں سے ثابت ہے، لیکن دنیا میں ایسے بہت کم انسان رہے جو جنات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے! ایک جن نے انسانوں کی طرح جینے کی آرزو کی اور یہ کہانی پردۂ اخفا سے ظہور میں آ گئی۔

☆ یہ عشق ہی تھا جس نے اسے ایک لڑکی کا دیوانہ بنایا اور پھر اسی عشق کی آگ کو بجھانے کے لیے اور خود کو انسانوں کی دنیا سے چھپانے کے لیے اس جن نے ایسے ایسے کام اور راستے اختیار کیے کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا چلا گیا۔

☆ خوف اور رگوں میں لہو جما دینے والے مناظر سے بھرپور ایک ایسی ناقابلِ یقین داستان، جس کے بارے میں اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ یہ سچی کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

☆ تو کیا جن باتوں اور چیزوں پر یقین نہ ہو، وہ ہوتی نہیں ہیں؟
یہی وہ سوال ہے جس کا جواب حاصل کرنا ہزاروں سال سے انسان کی جستجو کا مرکز ہے۔

ایک ایسا یادگار ناول جو آپ کو مدتوں یاد رہے گا

بہت جلد "سچی کہانیاں" کے صفحات پر جلوہ گر ہو رہا ہے

اگر عنوان گولڈن جوتا ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔ فصیحہ آصف میری بہت پیاری دوست اور افسانہ نگار ہیں۔ اور سب نے ہی بے حد اچھا لکھا۔ رضوانہ کوثر اور سنبل جی کا تبصرہ ہمیں بے حد اچھا لگتا ہے۔ عادل حسین آپ تبصرہ بھی شاندار کرتے ہیں اور آپ کی تحریریں بھی بہت اچھی ہوتی ہیں اور شاعری تو کمال کی کرتے ہیں۔ اُم مریم کا مکمل ناول بے حد اچھا لگا۔ ورکنگ وومین، میرے پرندۂ دل، بینا عالیہ اور عقیلہ حق کے ناول تو بے حد اچھے لگے۔ نیلم الماس کا دنیا پلٹ دی، واہ کیا کمال کا ناولٹ تھا۔ سنبل جی کا افسانہ محبت اعزاز ہے نے تو کمال کر دیا سنبل جی خوش رہو۔ آج کل ہم بے حد بیمار ہیں مگر دوشیزہ پڑھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہماری طرف سے سنبل جی عقیلہ حق، فصیحہ آصف خان، نگہت غفار، رضوانہ کوثر، بینا عالیہ، منزہ جی کو بے حد سلام اور دعا بس ہمارے لیے دعا کرتے رہا کریں۔ 24 اکتوبر کو ہمارے مجموعہ کلام محبت یاد رکھوں گی کی تقریب رونمائی الحمرا ادبی بیٹھک میں منعقد ہوئی صدارت ملک کے نامور شاعر اعتبار ساجد نے کی اور مہمان خصوصی ایم اے راحت تھے۔ جس میں نسیم نیازی زمر نعیم اور رضوانہ کوثر نے بھی شرکت کی۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ہوا۔ میں تو کچھ بھی نہیں۔ اچھا جی اللہ حافظ اگلے ماہ پھر حاضر ہوں گے۔

ﷺ: فریدہ جی! آپ کی صحت کے لیے دعا گو ہیں اور کتاب کی پذیرائی پر مبارکباد، تبصرہ جتنا بھی کیا اچھا لگا۔

✉ کراچی سے خولہ عرفان کی محفل میں پہلی آمد ہے لکھتی ہیں پہلی دفعہ آپ کی محفل میں شامل ہونے کی جسارت کر رہی ہوں کیوں کہ پہلی محفل دیکھی ہے جہاں مدعو اور بن بلایا مہمان دونوں بلا تخصیص معتبر ٹھہرتا ہے۔ جیسے جیسے دوشیزہ اس کی محفل میں آگے بڑھتی گئی، ویسے ویسے یہ احساس قوی ہوتا گیا کہ شاید میں ایک ایسی صحرا نوارد ہوں جسے اچانک نخلستان نظر آ گیا ہو یا ایک ایسی مسافر ہوں جو رستہ بھٹک کر خوش قسمتی سے ایک ایسے چمن میں آ گیا ہو جہاں رنگا رنگ پھول اپنی مہک کی بہار دکھا رہے ہوں۔ اور اس ایک لمحے کو زمانے کے سرد گرم کو بھول کر اس نخلستان کی سرسبزی یا پھلواری کے رنگ و بو میں گم ہو جائے، جب محفل برخاست ہوئی، تب بھی ایک خوش کن احساس دل و ذہن کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھا لہٰذا قلم نے حوصلہ پکڑا اور اس نازک کاغذ کے ناتواں کندھوں پر ذہن و دل اپنے احساسات اور خواہشات کا بوجھ منتقل کرنے پر مجبور ہو گیا جس رات آپ کے شاعری کے مجموعے اور تم...... کا مطالعہ کیا تھا اس وقت شاید ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ آپ سے کسی بھی قسم کی ملاقات کا موقع مل سکتا ہے نہ بالمشافہ، نہ قلمی لیکن ایک محسن کی محبت نے دوشیزہ سے متعارف کرایا اور دوشیزہ نے آپ سے قلمی ملاقات کا موقع فراہم کر دیا۔ جہاں تک آپ کی شاعری کا تعلق ہے بہترین غزلیں اور نظمیں خوبصورت جذبوں کی خوبصورتی سے ترجمانی کرتی اور زندگی کی حقیقتوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے نظر آئیں اور جہاں تک دوشیزہ کا تعلق ہے تو یقین کریں تقریباً ہر رسالے کے مطالعے کا موقع ملتا ہے لیکن دوشیزہ کے جیسا کشادہ دامن کسی کا نہیں دیکھا تھا، جو اپنے پرانے اور نئے سب لکھنے والوں کو اپنے رسالے میں مساوی درجہ دیتا ہو۔ نئے لکھنے والوں کو اتنی گرم جوشی سے خوش آمدید کہا جاتا ہے کہ ان کے حوصلے بلند ہو جاتے ہیں اور وہ زیادہ جوش اور جذبوں کے ساتھ لکھنے کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ اس رسالے کے افسانوں سے لے کر ناول تک جتنا مطالعہ کیا ہر تحریر اپنی جگہ انصاف رکھتی ہے اور ہمارے ماحول کی صحیح ترجمانی کرتی نظر آئی۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو مصنف لفظوں کی چاشنی میں ڈبو کر اس طرح قاری کے ذہن میں اتارا ہے وہ غیر محسوس

طریقے سے اس تحریر کی حقیقت کو اپنے خون میں شامل ہوتا محسوس کرتا ہے۔ دوشیزہ کے باقی سارے سلسلے بھی بہت عمدہ ہیں اگرچہ طویل خط لکھنے کا پروگرام تھا لیکن سوچا کہ اگر ہر سلسلے کا الگ الگ ذکر کروں گی تو خط طوالت اختیار کرلے گا اور یہ احساس بھی ہے کہ آپ کا وقت بہت قیمتی ہے۔ آپ پر ذمہ داری بھی بہت بڑی ہے اس لیے ابھی اتنا ہی کافی ہے یہ میرا پہلا خط ہے امید ہے کہ اس کو ضرور اپنی محفل میں جگہ عنایت فرمائیں گے۔ انشاء اللہ خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھوں گی۔ آپ اور آپ کے اس رسالے دوشیزہ کے لیے نیک تمناؤں اور دعاؤں کے ساتھ۔

ﮪ: بہت اچھی خولہ جی! ہمیں آپ سے ملاقات یاد ہے مگر وہ آپ کی محسن ہماری عزیز ترین لکھاری اور شاعرہ ساتھی بھی ہیں۔ اب آپ کو خوش آمدید کہنے کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ نوارد ہیں دوشیزہ فیملی میں آپ کو بہت پہلے خوش آمدید کہا جا چکا ہے۔

✉: اسلام آباد سے ہماری بہت اچھی قاری ساتھی فرح عالم رقم طراز ہیں نومبر کا شمارہ صنم جھنگ کے خوبصورت ٹائٹل سے آراستہ ملا۔ ناولٹ نمبر کا ٹیگ سجائے۔ اداریہ 'لاج' بہترین رہا۔ منورہ نوری خلیق کا زادِ راہ واقعی زندگی کو آسان باعمل اور ایمان افروز بنانے کا روشن سلسلہ ہے۔ سچ کہتے ہیں کہ انسان دنیا سے پردہ ضرور کرلیتا ہے لیکن اپنی زندہ جاوید تحریروں کے باعث ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ منورہ جی کے ساتھ بھی یہی کچھ ہے۔ وہ اتنی دور جانے کے باوجود بھی ہمارے دلوں میں روزِ اول کی طرح زندہ ہیں۔ محفل میں رونقیں عروج پر تھیں۔ رفعت سراج کے ناول کے ہمیں بہت انتظار ہے۔ پلیز ذرا جلدی شروع کردیجیے۔ مجھے یقین ہے کہ اس ناول کا میری طرح اور بھی بہت سارے قاری انتظار کررہے ہوں گے۔ محفل کے بعد دلشاد نسیم اپنے دل کی باتیں لے کر ہاتھوں میں قانون لیے اعلیٰ پائے کی تحریر کے ساتھ موجود تھیں۔ دلشاد جی مجھے آج بھی آپ کی تحریریں بے تحاشا پسند ہیں۔ منی اسکرین میں علی رضا عمرانی واقعی بے لاگ تبصرہ کرتے ہیں۔ س سے سوال میں صنم جھنگ جیسی ہردلعزیز اداکارہ کو شائع کرکے آپ نے دل جیت لیے۔ کیپ اٹ اپ۔ تیرے عشق نچایا بینا عالیہ اپنے اس ناول کو بہت سیج کرلے کر چل رہی ہیں۔ تیرہویں کڑی بھی بہت زبردست رہی۔ ناولٹ میں مجھے رضیہ مہدی کی ورکنگ دومین نے بہت متاثر کیا۔ رضیہ جی آپ کے بھائی کی وفات کا سُن کر بھی بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی فیملی کو اس غم کو جھیلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ کاشی بھائی یہی مجھے آپ سے بھی کہنا ہے۔ آپ کی خالہ کا سن کر بھی دل بہت اداس ہوا۔ خدا ریحانہ وسیم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین۔ صائمہ حیدر، مریم فاطمہ کے ساتھ آئیں۔ صائمہ آپ کی یہ تحریر بہت زبردست رہی۔ لیکن اس تحریر میں مجھے آپ کی پچھلی تحریروں کی طرح گرفت زیادہ مضبوط نظر نہیں آئی۔ پلیز مائنڈ نہ کیجیے گا۔ میں آپ کی تحریروں کا بہت انتظار کرتی ہوں۔ اس کے بعد نعمان اسحٰق صاحب کی میرے پرندہ دل دوسرے حصے میں بھی ٹھیک ہی رہی۔ کہانی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ لیکن نعمان آپ کا مشاہدہ تحریر میں چٹکی کھاتا ہے۔ مجھے آپ کی رفتار دیکھ کر اور آپ کے اسلوب کو دیکھ کر یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ آپ کل کا روشن ستارہ ہیں۔ نیلم الماس نئی رائٹر ہیں لیکن نیلم نے اپنے ناولٹ 'دنیا چل دی' میں چونکایا ضرور ہے۔ نسرین اختر بھٹی کا ناولٹ 'اس راہِ وفا میں' بہتر تھا۔ لیکن نسرین آپ کو بہترین کی طرف جانا ہے اس لیے امید ہے کہ اگلی بار آپ یقیناً کوئی یادگار تحریر ہماری بصارتوں کا

رزق کریں گی۔اب آتے ہیں افسانوں کی طرف افسانوں میں مجھے الماس روحی کا خوابوں کی دہلیز، عارف شین روہیلہ کا مہنگا سودا، صدف آصف کا اب اعتبار آیا اور سنبل کا محبت اعزاز ہے میں سے سنبل صاحبہ بازی لے گئیں۔محبت اعزاز ہے نے چونکا کر رکھ دیا۔افسانے پر کمال کی گرفت اور موضوع...... سنبل جی جیو اور ہمیشہ کی طرح اِس بار بھی بازی لوٹنے پر مبارکباد قبول فرمائیں۔انتخاب خاص میں چائے کی پیالی بہت زبردست رہی۔ مجھے اب بھی اُس گمنام محبت کی لپٹیں جو دھواں بن کر ایک دوسرے میں مدغم ہوگئیں۔اپنے اردگرد محسوس ہو رہی ہیں۔رنگ کائنات میں شوکت جمال کی خودکشی نے محظوظ کیا۔دوشیزہ میگزین میں اسماء اعوان خوب دوشیزہ گلستاں سجاتی ہیں۔نئے لہجے نئی آوازیں میں نئی شعراء خوب رنگ جمائے ہوئے ہیں۔زین العابدین آپ کے برجستہ جوابات بہت لطف دیتے ہیں۔لولی وڈ بولی وڈ ڈی خان صاحب آپ بہت خوبصورت طریقے سے خبروں کو اِس کالم میں سموتے ہیں۔مزہ آجاتا ہے۔مختار بانو طاہرہ کا سلسلہ نفسیاتی الجھنیں مجھے بہت پسند ہے۔نادیہ طارق کا کچن کارنر بہت کچھ سکھاتا ہے۔نادیہ جی ایک بات سچ سچ آپ کو بتا رہی ہوں۔آپ کی ریسپیز کے ذریعے میں اکثر و بیشتر داد و تحسین سمیٹتی ہوں۔دوشیزہ میگزین کا نیا سلسلہ حکیم جی واقعی بہت مفید اور جامع سلسلہ ہے۔اس سلسلے کے ذریعے ہم گھر بیٹھے بہت ساری بیماریوں سے چھٹکارا پاسکتے ہیں۔بیوٹی گائیڈ میں ڈاکٹر خرم مشیر نے اس ماہ قارئین کے بھیجے گئے سوالات کے جواب دیے۔میں چاہتی ہوں کہ ڈاکٹر صاحب ہر ماہ قارئین کے مسائل حل کیا کریں۔کیا ایسا ممکن ہوسکتا ہے۔مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب اِس بارے میں ضرور کوئی مثبت جواب دیں گے۔آخر میں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ ماہِ نومبر کا دوشیزہ مکمل ترین پرچوں میں ایک اور اضافہ ہے۔اگلے ماہ انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی ان ہی صفحات پر اگر خدا لایا تو۔خدا حافظ۔

ﷺ: بہت عزیز فرح عالم صاحبہ! یہ حقیقت ہے کچھ قارئین ایسے ہوتے ہیں جو اپنے بے لاگ تبصرے کے ذریعے ہر دل عزیز ہو جاتے ہیں۔آپ کا تبصرہ آپ کو ہر دلعزیز بنا چکا ہے صرف اتنا کہنا ہے کہ اب محفل سے آپ کی غیر حاضری ہمیں بہت کھلتی ہے۔

ساتھیو! یہ تو تھے وہ خطوط جواب تک ہمیں موصول ہوئے۔انشاء اللہ اب اگلے برس ان ہی صفحات پر ملاقات ہوگی۔اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

آپ کا ساتھی

کاشی چوہان

توجہ طلب

قارئین خط و کتابت کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں۔

آئندہ خطوط اسی پتے پر ارسال کریں۔ (شکریہ)

88-C II خیابانِ جامی فیز 7۔ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

0333-2269932 / 0300-2313256

ای میل pearlpublications@hotmail.com

ماہنامہ دوشیزہ کراچی ڈائجسٹ میں اشتہار کیوں دیا جائے؟

- ...... پاکستان کا یہ واحد رسالہ ہے، جس کا گزشتہ چالیس برس سے چار نسلیں مسلسل مطالعہ کررہی ہیں۔
- ...... اِس لیے کہ جریدے میں شائع ہونے والے اشتہارات پر قارئین بھرپور اعتماد کرتے ہیں۔
- ...... اِس میں غیر معیاری اشتہار شائع نہیں کیے جاتے۔
- ...... پوری دنیا میں پھیلے اِس کے لاکھوں قارئین متوسط اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، جو مستند اور معیاری مصنوعات کی خریداری کو ترجیح دیتے ہیں۔
- ...... اِس لیے کہ دوشیزہ ڈائجسٹ کو گھر کا ہر فرد یکساں دلچسپی سے پڑھتا ہے۔
- ...... جریدے کے ہر شمارے کو قارئین سنبھال کر رکھتے ہیں۔
- ...... اِس جریدے کے بڑی تعداد میں مستقل خریدار ہیں، جو اندرون اور بیرون ملک پھیلے ہوئے ہیں۔
- ...... آپ کی مصنوعات کے اشتہار باکفایت اُن تک پہنچ سکتے ہیں۔
- ...... جریدے کی اعلیٰ معیار کی چھپائی آپ کے اشتہار کی خوب صورتی میں اضافہ کرتی ہے۔

شعبہ اشتہارات: دوشیزہ

110 آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ، بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی

فون نمبرز: 021-34939823 - 34930470

معصوم صورت اداکارہ

مومل شیخ

ذیشان فراز

☆وہ نام جو شناخت کا باعث ہے؟

♥:مومل شیخ۔

☆گھر والے کیا کہہ کر پکارتے ہیں؟

♥:بچپن میں گڑیا اور اب سب مومو کہتے ہیں۔

☆وہ مقام جہاں سے آشنا ہو کر آنکھ کھولی؟

♥:لاہور۔

☆زندگی کس برج (star) کے زیر اثر ہے؟

♥:ثور (Taurus)۔

☆علم کی کتنی دولت کمائی؟

♥:Aلیول کیا اور پھر مارکیٹنگ اِن ایڈور ٹائزنگ (لندن سے)۔

☆کتنے بھائی بہن ہیں۔ آپ کا نمبر؟

♥:ایک بھائی ہے شہزاد اور میں۔

☆برسر روزگار ہو کر پریکٹیکل لائف میں داخل ہو گئیں؟

♥:بالکل۔

☆موجودہ کیریئر (مقام) سے مطمئن ہیں؟

♥:ابھی نہیں۔ ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔

☆اداکاری کے لیے اپنی طبیعت اور مزاج کے برعکس موڈ بنانا ضروری ہوتا ہے؟

♥:بالکل۔ یہ حقیقت ہے۔

☆اس زندگی میں کون سا کام سب سے مشکل ہے؟

♥:اپنے لیے وقت نکالنا۔

☆:کوئی ایسی خواہش جواب تک پوری نہ ہوئی ہو؟

♥:اداکاری میں ایسا کردار ادا کرنا چاہتی ہوں جو یادگار ہو جائے۔

☆:کون سی چیز کی کمی آپ آج محسوس کرتی ہیں؟

♥:اللہ کا شکر ہے، اللہ نے سب کچھ دیا اور وقت پر دیا۔

☆:اپنی کون سی عادت بہت پسند ہے؟

♥:بہت جلد معاف کر دینے والی اپنی عادت پسند ہے۔

☆:اپنی کون سی عادت سخت ناپسند ہے؟

♥:بہت جلد معاف کر دینے والی عادت ہی مجھے سخت ناپسند بھی ہے۔

☆: زندگی میں کون سے رشتوں نے دُکھ دیے؟

♥: اگر آپ اچھے ہیں تو رشتے دکھ نہیں، سکھ دیتے ہیں۔

☆: لباس جگ بھاتا پہنتی ہیں یا من بھاتا؟

♥: میں 'ایونٹ' کے حساب سے لباس پہنتی ہوں۔

☆: اردو والے ''سفر'' کا ذریعہ کیا ہے؟

♥: اپنی گاڑی۔

☆ صبح کا آغاز کس طرح کرتی ہیں؟

♥: ناشتا کرتی ہوں اور پھر کام پر جانے کی تیاری۔

☆ دن کا کون سا پہرا اچھا لگتا ہے؟

♥: صبح کا وقت پسند ہے۔

☆: حساس ہیں یا......؟

♥: بہت زیادہ۔

☆: کون سے ایسے معاشرتی رویے ہیں جو آپ کے لیے دکھ اور پریشانی کا باعث بنتے ہیں؟

♥: منافقت بہت دکھ دیتی ہے۔

☆: دولت، عزت، شہرت، محبت اور صحت اپنی ترجیح کے اعتبار سے ترتیب دیجیے۔

♥: عزت، صحت، محبت، دولت، شہرت۔

☆: سمندر کو دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟

♥: خدا کی قدرت کمال ہے۔

☆: پہلی ملاقات میں ملنے والے کی کس بات سے متاثر ہوتی ہیں؟

♥: اخلاق سے۔

☆: خودستائشی کی کس حدتک قائل ہیں؟

♥: جتنا ہر انسان کو ہونا چاہیے۔

☆ یاد کا کوئی جگنو جو تنہائی میں روشنی کا باعث بنتا ہو؟

♥: یاد نہیں آ رہا۔

☆: غصے میں کیا کیفیت ہوتی ہے، خاموشی یا چیخ و پکار؟

♥: میری کوئی کیفیت نہیں ہوتی کیونکہ چھ سات منٹ بعد غصہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔

☆: لوگوں کی نظر میں آپ کی شخصیت کیسی ہے، اعلیٰ، اچھی، بس ٹھیک؟

♥: سب کہتے ہیں میں بہت ہائپر ہوں۔

☆: موت خوف کا باعث ہے؟ اور اس کے علاوہ ڈرنے کی کوئی وجہ؟

♥ :موت سے بالکل بھی ڈر نہیں لگتا۔

☆ :فراز کے اس خیال پر کس حد تک یقین رکھتی ہیں کہ دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا؟

♥ :یقین تو ہے مگر عمل نہیں ہو پاتا۔ انسان، انسان پر ہی بھروسہ کرتا ہے۔

☆ :کھانا گھر کا پسند ہے یا باہر کا فاسٹ فوڈ؟

♥ :گھر کا۔

☆ زندگی کے معاملات میں آپ تقدیر کی قائل ہیں یا تدبیر کی؟

♥ :دونوں کی۔

☆ :کون سے الفاظ عام بات چیت میں زیادہ استعمال کرتی ہیں؟

♥ :کبھی غور نہیں کیا۔

☆ :زندگی کا وہ کون سا پل تھا جس نے یکدم زندگی ہی تبدیل کر دی؟

♥ :شادی کے بعد زندگی یکدم ہی تبدیل ہو جاتی ہے۔

☆ :ویک اینڈ کیسے گزارتی ہیں؟

♥ :سسرال جاتی ہوں۔ پھر امی کے گھر اور پھر دوستوں میں۔

☆ :لوگ کس چیز کی زیادہ تعریف کرتے ہیں؟

♥ :لوگوں کو چھوڑیں، مجھے اپنے لیے اپنے شوہر کی تعریف اچھی لگتی ہے، ویسے وہ میری تعریف اکثر کرتے رہتے ہیں۔

☆ شہرت، رحمت ہے یا زحمت؟

♥ :پوزیٹو وے میں لیں تو رحمت ہے شہرت۔

☆ :کیا آپ اچھی رازداں ہیں؟

♥ :بالکل۔

☆ :اگر آپ میڈیا پر نہ ہوتیں تو کیا ہوتیں؟

♥ :ایڈورٹائزنگ فیلڈ میں نام کما چکی ہوتی۔

☆ :آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟

♥ :آئینہ ضرورت کے تحت دیکھا جاتا ہے۔ اتنی فرصت کس کے پاس ہے کہ آئینے کے سامنے جا کر کچھ سوچا جائے۔

☆ :''یہ زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا'' کس حد تک عمل کرتی ہیں؟

♥ :میں اکثر دوسروں کی مدد کرتی رہتی ہوں۔

☆ اس بات پر یقین رکھتی ہیں کہ موسیقی روح کی غذا ہے؟ اگر ہے تو کیسی موسیقی؟

♥ :موڈ پر ڈپینڈ کرتا ہے کہ کس وقت کیا سنا جائے۔

☆ :زندگی کب بری محسوس ہوتی ہے؟

♥ :جب **Ups & Downs** آئیں تو زندگی بری لگنے لگتی ہے کہ یہ کیوں اور کیسے ہو گیا۔ مگر میں چیلنج سمجھ کر مقابلہ کرتی ہوں۔

☆ :محبت کا اظہار کس طرح کرتی ہیں؟

♥ :میں کوئی شرمیلی نہیں ہوں۔ ویسے موڈ پر انحصار کرتا ہے۔

☆ :اپنے ملک کی کوئی اچھی بات؟

♥ :ہمارے ملک میں قانون کی پابندی ہو جائے تو سب کچھ اچھا ہو جائے گا۔

☆ :کیا ہم آزاد ہیں؟

♥ :اللہ کا شکر ہے کہ ہم اس نعمت سے سرفراز ہیں۔

☆ :لوگوں کی کوئی عادت جو بہت بری لگتی ہے؟

♥ :لوگ منہ پر جھوٹ بولتے ہیں۔

☆ :خودکشی کرنے والا بہادر ہوتا ہے یا بزدل؟

♥ :بزدل۔

☆ :مطالعہ عادت ہے یا وقت گزاری؟

♥ :عادت۔

☆ :کن چیزوں کے بغیر سفر ممکن نہیں؟

♥ :بیگ! چونکہ سب چیزیں اُسی میں ہوتی ہیں۔

☆ :حرف آخر کیا چاہنا چاہیں گی؟

♥ :لوگوں کی مدد کریں، اللہ آپ کی مدد کرے گا۔

☆☆......☆☆

منی اسکرین پر پیش کیے جانے والے مقبولِ عام ڈراموں پر بے لاگ تبصرہ

علی رضا عمرانی

اس وقت پاکستان میں تقریباً بیسیوں چینل عوام کی دسترس میں ہیں۔ اس الیکٹرانک خوشحالی میں جہاں عوام کے پاس معیاری ڈراما دیکھنے کا کال نہیں، وہیں ڈراموں کی بہتات نے بہتر سے بہترین، معیار اور کوالٹی کے لیے چوائس آسان کردی ہے۔ منی اسکرین میں ہم مقبولِ عام ڈراموں پر بے لاگ تبصرہ شائع کریں گے۔

دے اجازت جو تُو

ہم ٹی وی سے ہر پیر اور منگل کو پیش کیا جانے والا یہ ڈرامہ سیما غزل کے قلم کی کارستانی ہے۔ ڈرامے کی کہانی تو ایک روایتی لو اسٹوری سے شروع ہوئی ہے مگر خوبصورت اسکرپٹ، جاندار جملے اور آج کے دور کے نمائندہ کردار اس ڈرامے کو انفرادیت بخشتے ہیں۔ کہانی کے مطابق عائلہ ایک مڈل کلاس گھرانے سے تعلق رکھتی ہے جو گھر بھر کی لاڈلی بھائی، بھابی اور ابو کی آنکھ کا تارا ہے۔ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے مگر معصومیت کسی School Going بچی کے جیسی ہی ہے۔ بھابی کا بھائی عائلہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ عائلہ اور بھابی کے بھائی (فیضی) میں بے تکلفی کو محسوس کر کے تمام لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ اُن دونوں کے بیچ میں محبت ہے مگر عائلہ فیضی کو صرف ایک اچھا دوست سمجھتی ہے۔ ایک دن حادثاتی طور پر عائلہ کی ملاقات سرمد سے ہوتی ہے جو کہ بوروژوا کلاس سے تعلق رکھتا ہے اور تنہائی کا شکار ہے

کیونکہ اس کے باپ نے زندگی بھر صرف دولت کے انبار جمع کیے ہیں اور اپنے بچوں کو بالکل بھی ٹائم نہیں دیا۔ سرمد کی ماں سوتیلی ہے جو اپنے دل میں اس بات کو رکھتی ہے

اور اپنے سگے بیٹے اور سرمد میں فرق رکھتی ہے۔ سرمد کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے۔ عائلہ اس کی مدد کرتی ہے۔ بعد میں پتا چلتا ہے کہ سرمد عائلہ کی ہی یونیورسٹی میں پڑھتا ہے یہاں سے اُن دونوں کے درمیان محبت شروع ہوجاتی ہے۔ مگر طبقاتی فرق کی وجہ سے دونوں کا ملن ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔ عائلہ کے بھائی کو سرمد کا امیر ہونا کھلتا ہے۔ بھابی کو اپنے بھائی کی چاہت کا علم ہے اور وہ چاہتی ہے کہ عائلہ اُس کی بھابی بنے مگر عائلہ کا باپ (وجاہت) صرف اپنی بیٹی کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھنا چاہتا ہے۔ ممکن ہے کہ وجاہت عائلہ کے لیے Stand لے اور ان دونوں کی شادی کروادے۔ ڈرامے کی کہانی ابھی یہیں تک کھلی ہے اُمید ہے آگے بھی کئی موڑ ایسے آئیں گے جو ناظرین کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز بنیں گے۔ نمایاں کاسٹ میں سوہائے علی ابڑو (عائلہ) سرمد (فرحان سعید) بھائی (عاطف راٹھور) اور وجاہت (طارق جمیل) صاحب ہیں۔ اس ڈرامے کی خاص بات یہ بھی ہے کہ جل بینڈ کے معروف سنگر فرحان سعید اس ڈرامے میں بطور اداکار پہلی مرتبہ کام کررہے ہیں اور اپنی اچھی اداکاری سے یہ ثابت کررہے ہیں کہ وہ نہ صرف اچھے سنگر بلکہ اچھے اداکار بھی ہیں۔

گویا

ARY ڈیجیٹل سے پیش کی جانے والی نئی ڈرامہ

سیریل 'گویا' ہر ہفتے کی شام 8 بجے دیکھی جاسکتی ہے۔ اس تیزی سے مقبولیت حاصل کرنے والے ڈرامہ گویا کی ڈائریکشن فرخ فیض نے دی ہیں، جب کہ اس سیریل کے مصنف محمد احمد ہیں۔ اس ڈرامے کی کاسٹ میں ثناء جاوید، عثمان خالد بٹ، فرح شاہ، فرقان قریشی، ماریہ خواجہ اور حرا ترین نے اپنے اپنے کردار اس خوبصورتی سے نبھائے ہیں کہ عوام فوری طور پر اس ڈرامے کی جانب راغب ہوگئے ہیں۔ امید ہے کہ ڈرامہ سیریل 'گویا' بھی اے آر وائی ڈیجیٹل کی کامیاب سیریل ثابت ہوگی۔

نزدیکیاں

جمعرات شب 9;00 بجے پیش کی جانے والی اے آر وائی ڈیجیٹل کی ڈرامہ سیریل نزدیکیاں اس وقت

فیملیز میں بے حد پسند کی جارہی ہے۔ محمد افتخار افی کی ڈائریکشن اور ماہین شکیل کے لکھے اس ڈرامے میں ماریہ واسطی، واسع چوہدری اور ماہین خالد نے اپنی شاندار اداکاری سے عوام کے دل جیت لیے ہیں۔ اس وقت ریٹنگ کے حساب سے ڈرامہ سیریل "نزدیکیاں" ٹاپ پر ہے۔ عفان وحید، نائلہ جعفری، گوہر رشید اور رحمہ علی نے بھی اس ڈرامے میں جم کر اداکاری کی ہے۔

☆☆......☆☆

عشق کی راہداریوں، طبقۂ اشرافیہ اور اپنی مٹی سے جڑے
لوگوں کی عکاسی کرتے سلسلے وار ناول کی چودھویں کڑی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ملک قاسم علی جہان آباد کے مالک تھے۔ ان کا شمار ضلع خوشاب کے جانے مانے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ ان کے دو بیٹے ملک عمار علی اور ملک مصطفیٰ تھے۔ عمار علی ریاست کے امور میں دلچسپی لیتے تھے جبکہ ملک مصطفیٰ علی چھوٹی بہن امل کے

ساتھ تعلیم کے سلسلے میں لاہور رہائش پذیر تھے، ملک عمار علی کی شادی ان کی کزن ماہین سے ہوئی تھی۔ وہ اٹھارہ سالہ لڑکی خود سے عمر میں کئی سال بڑے ملک عمار علی کو ذہنی طور پر قبول نہ کر سکی تھی۔ وہ کانوینٹ سے پڑھی ہوئی اور خاصے آزاد خیالات رکھتی تھی، جو لائف بھرپور طریقے سے انجوائے کرنا چاہتی تھی۔ اُمّ فروا اُمّ زارا اور اسماعیل بخش مولوی ابراہیم کی اولادیں ہیں۔ ام فروا کی شادی بلال حمید سے ہوئی ہے جو میڈم فیری کے لیے کام کر رہا ہے۔ میڈم فیری کا تعلق اس جگہ سے تھا جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ بلال حمید اُم فروا کو پہلی بار میکے لے کر آیا تھا کہ میڈم فیری کی کال آ گئی......

میڈم فیری نے بلال عرف بالو کو باور کرایا کہ جلد اُمِ فروا کو ان کے حوالے کر دے۔ بلال حمید کے لیے یہ ناممکن سا ہو گیا تھا کیونکہ وہ اُم فروا سے واقعی محبت کرنے لگا تھا۔ ماہین اپنے دیور مصطفیٰ علی میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ اہل کی تعلیم مکمل ہوتے ہی اُس کی شادی اُس کے کزن محمد علی کے ساتھ ہونے کی تیاریاں ہونے لگی تھیں لیکن اہل کے خیالات کسی اور طرف بھٹکنے لگے تھے۔

ماہین اپنے بچپن کے دوست کاشان احمد سے ملتی ہے تو پتا چلتا ہے کاشان بچپن ہی سے اُس میں دلچسپی لیتا تھا مگر کبھی محبت کا اظہار نہ کر پایا۔ ماہین اپنے آئیڈیل کے اس طرح بچھڑ جانے پر دکھی ہے۔ کاشان احمد ملک سے باہر جانے سے پہلے ماہین سے محبت کا اظہار کر دیتا ہے۔ ماہین ملک عمار علی سے ویسے ہی ناخوش ہے اس پر کاشان احمد کا اظہارِ محبت اُس کی زندگی میں ہلچل مچا دیتا ہے۔

ماہین کے دل میں کاشان احمد کی محبت بھی جڑ پکڑ رہی ہے اور اب وہ عمار علی کی شدتوں سے مزید خائف ہونے لگی ہے۔ اہل کی شادی اس کے کزن محمد علی کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ محمد علی اُسے محبتوں کی بارش میں نہلا دیتا ہے اور یوں فوجی افسر کی بیوی بن کر وہ اپنی پہلی محبت کی یادوں سے پیچھا چھڑا لیتی ہے۔ ماہین اور عمار علی کے بیچ میں تکرار ہونے لگی ہے۔ میڈم فیری بلال کو اُم فروا پر کڑی نظر رکھنے کا کہتی ہے۔ ایک دن اچانک بلال کی ملک مصطفیٰ علی سے ملاقات ہو جاتی ہے اور......

(اب آگے پڑھیے)

''ملک صاحب وہ تو میرے سامنے آنے سے بھی کتراتی ہے۔ کہہ رہی تھی مجھے میکے جانا ہے۔ وہ یہاں نہیں رہنا چاہتی۔ میں نے اُسے سمجھایا ہے کہ والدین کو پریشان نہ کرو۔ مناسب وقت پر انہیں بھی بتا دیں گے۔ ابھی فیری کا مسئلہ نمٹ جائے۔''

''بلال اُس عورت کی تم فکر نہیں کرو۔''

''ملک صاحب وہ بہت کمینی عورت ہے۔ ایسی عورتیں کسی کی دوست نہیں ہوتی ہیں۔ وہ اپنی اولاد کے ساتھ اچھا نہیں کرتیں تو کسی کے ساتھ کیا بھلائی کریں گی۔''

''بلال تم بس اُمِ فروا کا خیال رکھو۔'' اُن کا دھیان تو صرف اُم فروا کی طرف تھا، وہ بلال حمید کی باتیں بھلا کہاں سن رہے تھے۔ وہ اندر سے اُم فروا کے لیے فکر مند تھے لیکن بلال حمید کے سامنے اظہار نہ کرنا چاہتے تھے۔

''بلال تم ایسا کرو فون پر اس کے گھر والوں سے بات کرا دو تا کہ اسے کچھ ڈھارس ملے۔ اسے یہ ضرور سمجھانا کہ اُن سے ایسی ویسی کوئی بات نہ کرے، جس سے وہ پریشان ہو جائیں۔ تم نے مولوی صاحب کو اپنے یہاں شفٹ ہونے کے متعلق بتایا؟''

''جی ہاں کل میں نے فون کر کے بتا دیا تھا۔ چند دن اور گزر جائیں تب انہیں یہاں آنے کی دعوت دوں گا تا کہ انہیں بیٹی کو دیکھ کر تسلی ہو جائے۔ تب تک اُم فروا کی حالت بھی سنبھل جائے گی۔''

''اُمِ فروا سے کہنا وہ کھانا نہ بنائے۔ کھانا حویلی سے ہی آیا کرے گا۔''

''ملک صاحب اس تکلیف کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ راشن موجود ہے۔ ہم خود ہی کچھ کر لیں گے۔''

''فی الحال تو حویلی سے ہی کھانا آئے گا۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ ملک صاحب ایک اور بات بھی مجھے پریشان کر رہی ہے۔''

"کیا؟"

"فیری فلیٹ میں ہمیں موجود نہ پا کر مولوی صاحب کے گھر ہی نہ پہنچ جائے۔"

"بلال وہ ایسا کچھ نہیں کرے گی۔ پہلے وہ تم لوگوں کو تلاش کرے گی۔ ہم کل ہی اُس کے پاس چلے جاتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے ملک صاحب!"

"اب میں چلتا ہوں، تم سے رابطہ رہے گا۔ ہاں سنو!" انہوں نے رُک کر بلال حمید کی طرف دیکھا۔

"بلال اُم فروا کا خاص خیال رکھنا۔ اُسے تم سے کسی قسم کی شکایت نہ ہو۔" جانے وہ بار بار ایسا کیوں کہہ رہے تھے۔

"ملک صاحب آپ بے فکر رہیں۔ اُسے اب کبھی مجھ سے شکایت نہیں ہوگی۔"

☆......☆......☆

گرمیاں رخصت ہو رہی تھیں۔ اوائل اکتوبر کی خوشبوؤں اور نرمیوں میں گھلی ارغوانی شامیں بہت خوبصورت ہوگئی تھیں۔ سیکنڈ سمسٹر کے بعد ماہین چند دنوں کے لیے جہان آباد آ گئی تھی۔ قاسم علی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ ماہین زیادہ تر وقت اُنہی کے ساتھ گزارتی۔ اُن کی میڈیسن اور کھانے پینے کا خاص خیال رکھتی۔ انہیں نیوز پیپر پڑھ کر سناتی، اُن کا دل کتب خانہ میں بیٹھنے کو چاہتا تو انہیں وہاں لے جاتی۔ وہ چند کتابوں کا ذکر کرتے تو ماہین وسیع و عریض کتب خانے کے مختلف ریکوں سے اُن کی مطلوبہ کتابیں ڈھونڈ نکالتی، تب وہ ماموں جان کو پڑھ پڑھ کر سناتی۔ کتابوں پر، لکھاریوں پر بے لاگ تبصرے ہوتے۔ مغربی لکھاری برنارڈ شاہ کے انشائیے، برجستہ جملے فقرے مزے لے لے کر سناتی۔ آئن اسٹائن کی تھیوریز کے کئی کئی حوالے دیتی۔ تب ملک قاسم علی بہت خوش ہوتے۔

ماہین کی دیر تک روتی رہی تھی۔ اس نے کبھی نہ چاہا تھا اس کی بے فکر زندگی کے خوبصورت موسموں میں یہ موسم بھی آئیں جن میں چلنے والی ہوائیں اسے نوحے سناتی ہوں۔ گرد آلود کارواں اسے پامال کرتے، اپنا اتا پتا چھوڑ کر نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں، تب اس کے چاکلیٹ ہاؤس کے در و بام وقت اور موسموں کی دہکتی بھٹی میں جھلس راکھ کا ڈھیر بن جائیں۔

وہ اپنی خالی ہتھیلیوں کو گھورتی۔

"کیا ان میں کاشان احمد کے نام کی کوئی ریکھا نہیں ہے۔ کئی راتیں وہ سو نہ سکی تھی۔ اسے ممی پاپا پر غصہ آتا، کبھی اُن کی مجبوریاں اس کی سوچوں کو آگ بگولہ ہونے سے بچاتیں۔ وقت کا یہ تلوار کی تیزی جیسا دھارا تھا جو اس کی آشائیں، اس کی امنگوں بھرے جذبے بہا کر لے گیا تھا۔ بس اپنی اپنی جگہ خوش و مطمئن تھے۔ سارے لوگ اپنے نرم گرم بستروں میں سکون سے سوتے تھے۔ بے سکون تھی تو صرف ماہین، جب اس کی بے سکونی حد سے کمپنی اور باتوں سے اُن کی آدھی بیماری تو دور ہوگئی تھی۔ کتب خانے میں وقت گزرنے کا پتا نہ چلتا۔ اقبال، غالب، مرتقی میر، سودا، سب کو وہ کھنگال ڈالتی۔ اکثر ملک عمار علی اسے کہتے۔

"ماہی بابا جان کے علاوہ یہاں ہم بھی رہتے ہیں۔ تم سارا دن بابا جانی کے ساتھ ہی گزار دیتی ہو۔" وہ مسکراتی ہوئی کہتی۔

"مسٹر عمار علی، آپ کے بابا جانی میرے ماموں ہوتے ہیں، سمجھے آپ؟" ماہین جا رہی تھی۔ ملک قاسم علی کچھ دن لال حویلی میں چل کر رہیں۔ چند دن بعد اس کی نئی کلاسیں شروع ہونے والی تھیں۔ اسے دو دن تک لاہور جانا تھا۔

''ماموں جان آپ 'مراد ولا' چلیں۔ وہاں مصطفیٰ علی آپ کو کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے کر جائیں گے۔ آپ کا تفصیلی چیک اپ ہونا چاہیے۔ کچھ دن لال حویلی رہیں۔ وہاں کے لوگ آپ کو یاد کرتے ہیں۔ اُن مزارعوں کا اب جہان آباد آنا کم کم ہی ہوتا ہے۔''

''پُتر میں سوچ رہا ہوں وہاں چکر لگانے کے بارے میں لیکن ابھی یہاں کچھ ضروری کام ہیں، وہ نمٹ جائیں۔ وہاں کچھ پرانے دوستوں سے بھی ملوں گا۔ عمار علی اکیلا یہاں اتنی بڑی ریاست کو نہیں سنبھال سکتا۔ رعایا کے سو بکھیڑے ہوتے ہیں۔ ان غریبوں کے سر پر ہم ہاتھ نہیں رکھیں گے تو کون رکھے گا۔ سب کو ان کے حساب کے مطابق ڈیل کرنا ہوتا ہے۔ تمہارا خاوند بہت نرمی دکھاتا ہے۔ کچھ ہاریوں کے بیٹے شہر میں پڑھ کر کچھ زیادہ ہی جوشیلے بن گئے ہیں۔ لیکن ان کے بزرگ اب تک پرانے تعلق نباہ رہے ہیں۔ ہمارے وفادار ہیں لیکن یہ نئی جنریشن بہت جذباتی ہے۔ ہٹ دھرم قسم کی، میری موجودگی میں سب سیٹ رہتے ہیں۔ ان کے دلوں میں ایک ڈر ہے میرا۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ دبدبہ ان کے دلوں سے نکلے ورنہ ہمیں خسارہ اٹھانا پڑے گا۔ گاؤں کے کئی خاندان شہروں میں بس گئے ہیں۔ اب وہ جہان آباد کا رخ بھی نہیں کرتے۔'

اس وقت ماہین ٹیرس پر بنے لان میں کھلے آسمان تلے کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی کتابیں سامنے ٹیبل پر پڑی ہوئی تھیں۔ پڑھنے کی غرض سے وہ بکس یہاں اٹھا لائی تھی۔ لیکن اس نے انہیں کھول کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ ہلکی ہلکی خنکی اُتر رہی تھی۔ پہلے وہ اور امل یہاں بیٹھ کر ڈھیروں باتیں کیا کرتی تھیں۔ اب وہ تنہا تھی اور وہ اس تنہائی سے اُوب گئی تھی۔ ورنہ کبھی کبھی اسے خود کے ساتھ رہنا بہت اچھا لگتا تھا۔ ملک مصطفیٰ علی اپنی فیکٹری میں مصروف رہتے۔ شہزادی ان دنوں جہان آباد گئی ہوئی تھی اور گلنار سے وہ کتنی باتیں کر سکتی تھی؟ ویسے بھی ماہین نوکروں سے زیادہ بات چیت نہیں کرتی تھی۔ بیو اور ڈری کے کبھی کبھار فون آ جاتے۔ اس کی کلاس فیلوز زنیرہ اور عظمیٰ سے بھی اس کی بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ بوریت حد سے بڑھی تو اس نے تنہائیوں میں انٹرنیٹ کا سہارا لے لیا۔ ہر روز شام کے بعد ماہین کی کاشان احمد سے بھی بات ہوتی۔ اپنے روز و شب اپنی روٹین ایک دوسرے سے شیئر کرتے۔ کاشان احمد ہمیشہ اُسے سمجھاتا کہ ماہی خوش رہا کرو۔ اگر تم خوش رہو گی تو مجھے بھی اچھا لگے گا۔ میں تمہیں ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔'' وہ مسکرا کر کہتی۔

''شان میں خوش ہی تو ہوں تمہارے بن میں خوش رہتی ہوں، تم کیوں نہیں یقین کرتے۔''

''ہاں تم کہتی ہو تو میں یقین کر لیتا ہوں، ماہی میں بھی تمہارے بغیر بہت خوش ہوں۔ ہنستا ہوں، دوستوں کے ساتھ گپ شپ لگاتا ہوں، کبھی رات کو اُن کے ساتھ پارٹیز میں بھی چلا جاتا ہوں کسی بار میں چہل قدمی کرنے پہنچ جاتا ہوں۔''

''اے مسٹر! بار میں لوگ چہل قدمی کے لیے نہیں جاتے بلکہ وہاں کی بار ڈانسرز دیکھنے جاتے ہیں۔''

''ہاں بھئی میں نے بار ڈانسرز کا ذکر ذرا شریفانہ انداز میں کیا ہے ناں۔ ماہی اب ذرا آگے بھی سن لو۔ کبھی کبھار دوستوں کے اُکسانے پر کچھ پی پلا بھی لیتا ہوں۔ انگریز دوشیزاؤں کے ساتھ ڈانس بھی کر لیتا ہوں۔ اُن کے مذاق اور اشاروں پر سیٹیاں بھی بجاتا ہوں۔ یار یہاں کی لائف اسٹائل کے کیا کہنے۔ میں تو بھرپور طریقے سے زندگی انجوائے کر رہا ہوں۔''

''تو شان تم مجھے بھول گئے ہو؟'' اس کی آواز میں شکوہ تھا۔

''ماہی تم تو میری اچھی دوست ہو۔ تمہیں بھلا میں بھول سکتا ہوں۔ تمہیں میں ہمیشہ یاد کرتا ہوں۔ تم بھولنے والی دوست تو نہیں ہو۔'' کاشان کے لفظوں میں تھکن ٹوٹ کر بھرتی جا رہی تھی۔ تبھی ایک تھرتھراہٹ ماہین کے اندر پھیلی۔

''تو تم ایسے گھٹیا شوق اپنائے ہوئے ہو؟''

''تو اور کیا! یار زندگی ایک بار ملتی ہے، کیوں نا اسے بھرپور طریقے سے انجوائے کیا جائے۔'' وہ یہ سب جان بوجھ کر ماہین سے کہہ رہا تھا ورنہ اُس نے ایسا کوئی واہیات شوق نہیں پال رکھا تھا۔ وہ پھر بولا۔

''ماہی زندگی کو انجوائے کرنا سیکھو۔ تم اپنے مجازی خدا سے خوب ساری محبت کرو۔ اُس کی سنگت میں زندگی کو بھرپور طریقے سے بسر کرنے کی کوشش کرو۔ جانے کب اوپر والے کا بلاوا آ جائے، تب زندگی کی شام ہو جانے پر جانا تو لازماً پڑے گا۔ کوئی بہانہ، کوئی حجت نہیں چلے گی۔'' وہ ماہین کو اُداس دیکھ کر ہنسانے کی کوشش کرتا۔ وہ بے کل ہو کر کہتی۔

''شان میں ملک عمار علی کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکتی۔''

''ماہی آخر تم کیوں خوش نہیں رہ سکتیں؟'' کاشان سمجھانے کے انداز میں اُس سے پوچھتا۔

''کیونکہ مجھے اُس سے محبت نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ گیلی سُلگتی لکڑی کے کسیلے دھویں کی طرح ہوتا۔

''چلو تم اُس سے محبت نہ کرو۔ پر اُس کے ساتھ خوش تو رہو کیونکہ وہ تمہارا شوہر ہے۔''

''شان وہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

''ماہی وہی تو کہہ رہا ہوں۔ وہ تمہیں اچھا نہیں لگتا، تمہیں اُس سے کسی قسم کا انس نہیں ہے، کوئی بات نہیں۔ تم بس یہ کرو کہ اپنے ساتھ، اُس کے ساتھ، زندگی کے ساتھ کمپرومائز کر لو۔ وہ تو تم سے محبت کرتا ہے ناں۔''

''لیکن میں نہیں کرتی ناں۔ شان میں تو بس اتنا جانتی ہوں مجھے تم سے محبت ہے۔''

''ہاہاہا۔'' اُس نے اسکرین پر لکھا۔ لیکن وہ اندر سے رو رہا تھا۔

اُس کی بھی ٹین ایج کی محبت تھی۔ کہتے ہیں کہ کچی عمر کی محبتیں یاد نہیں رہتیں، بے شک ٹین ایج کی محبت جلدی بھلا دی جاتی ہے۔ لیکن پہلی محبت انسان کبھی نہیں بھول سکتا بھلے جتنے بھی ماہ و سال بیت جائیں۔ ماہی اُس کے دل میں تھی۔

''شان میری محبت تم ہو۔ جس کا ادراک اُس رات ہوا جب میرے ہاتھوں کو تم نے اپنی آنکھوں سے لگایا تھا، میرے ہاتھ تمہارے آنسوؤں سے غسل لیتے رہے تھے۔ تب میرے اندر کی عمیق گہرائیوں کی دیواروں سے بازگشت ٹکرائی تھی کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ کاشان میں ہمیشہ خود فریبی میں مبتلا رہی۔ اپنے اندر کی آواز کو کچلتی رہی کہ تم صرف میرے اچھے دوست ہو۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ تب مجھے اپنے وجود کے ریشے ریشے میں کسک بھرا الہام ہوا کہ یہی ہے وہ محبت...... جو مجھے کاشان احمد سے ابھی ابھی ہوئی ہے۔''

''ماہی تم تو پاگل ہو۔'' وہ پھر ہنسا۔

''اچھا اب بات چیت بند، میں مغرب کی نماز پڑھنے جا رہی ہوں۔ تم بھی کوئی اچھا کام کر لو۔ کسی بار میں جانے کے بجائے اپنے رب کو یاد کیا کرو۔ اُس کی وحدانیت کو پکارو۔ اُس سے اپنے اور میرے لیے بھی ہدایت مانگو۔''

وہ چیٹ باکس Log Out کرتی لیپ ٹاپ بند کر دیتی۔ ماہین جب تک روزانہ کاشان احمد سے چیٹنگ پر بات نہ کر لیتی بے چین رہتی۔ ایک گھنٹہ وہ اُس سے چیٹ کرتی۔

فرائی ڈے کو ملک عمار علی آتے تھے اور پیر کی دوپہر واپس جہان آباد چلے جاتے۔ اس دوران ماہین کی کاشان احمد سے بات نہ ہو پاتی۔ وہ کھوئی کھوئی دکھائی دیتی۔ کسی بات میں اُس کا دل نہ لگتا۔ ملک عمار علی اسے لانگ ڈرائیو پر لے جاتے۔ دونوں ڈنر بھی باہر کرتے تب چپکے سے کاشان احمد کی باتیں اس کی سماعتوں میں اترتیں۔ وہ اس سے کہتا تھا۔

''ماہی ملک عمار علی تمہارے شوہر ہیں، اُن کا خیال رکھا کرو۔ اُن کی طرف دھیان دوگی تو وہ خود بخود تمہیں اچھے لگنے لگیں گے۔ دیکھو ماہی کہیں دیر نہ ہوجائے۔ وہ تمہیں چاہتے ہیں۔ تم اُن کی چاہت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتیں تو کم از کم اُن پر تھوڑی توجہ ہی دے لیا کرو۔ اُن سے اچھی طرح بات کیا کرو۔ یار کل کس نے دیکھا، کل کا کوئی پتا نہیں۔ دوبارہ زندگی میں آئے نہ آئے۔''

شان کی باتیں یاد کرتے ہوئے اس وقت ماہین ڈرائیونگ کرتے ملک عمار علی کو کن اکھیوں سے دیکھ رہی تھی، جن کی شہد آگیں آنکھوں میں اس وقت جگنو تیر رہے تھے۔ صرف اس لیے کہ زیست سے چرائی گئی یہ ساعتیں اُن کی اور صرف اُن کی ماہین کی مکمل جاگیر ہوتی تھیں۔

وہ دونوں تنہا ہوتے اور اُن کے آس پاس صرف اُن کی گرم نرم حدت بھری سانسوں کی سائیں سائیں سنائی دے رہی ہوتی۔ اس وقت لاہور کی چکا چوند روشنیوں میں نرمیاں گھلی ہوئی تھیں۔ اُن کی گاڑی نہر کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ دوسرے روڈ پر گاڑیوں کی روشنیاں پانی پر اپنا عکس چھوڑ رہی تھیں۔

''ماہین کل ڈاکٹر صبا کے کلینک چلتے ہیں۔'' خاموشی میں ہلکا سا ارتعاش پھڑ پھڑایا۔ ملک عمار علی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو ہاتھ میں پکڑا چپس کا بڑا سا پیکٹ کھول رہی تھی۔

''عمار میں ڈاکٹر صبا کے پاس کتنی مرتبہ تو جا چکی ہوں۔ ہر بار وہ اس بات کی فیس لے لیتی ہیں کہ آپ تو بالکل ٹھیک ہیں۔''

''اس بار تم اُن سے کہو کہ تمہاری میڈیسن تبدیل کرے۔ ماہی تم صحیح طرح استعمال کرتی ہو ناں میڈیسن۔''

ملک عمار علی نے چپس کھاتی ماہین کو دیکھا۔

''ہاں آخر آپ کیوں بار بار پوچھ رہے ہیں۔'' حالانکہ اُس نے ایک دن بھی دوا نہیں کھائی تھی۔ وہ دوائیں فلش میں بہادیا کرتی تھی۔

☆......☆......☆

دوسرے روز شام کو ملک عمار علی اُسے زبردستی ڈاکٹر صبا کے کلینک لے آئے تھے۔ معمول کے چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے اس کی میڈیسن تبدیل کردی تھی۔ ملک عمار علی بار بار ماہین سے کہتے۔ ''ماہی دوائیں باقاعدگی سے استعمال کیا کرو اور اپنی خوراک کا بھی خاص خیال رکھا کرو۔''

سنڈے کی اس صبح ناشتے کی ٹیبل پر ملک مصطفیٰ علی بھی موجود تھے جو خاموشی سے ناشتہ کررہے تھے۔ اب ماہین کے ساتھ وہ زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ دو چار مرتبہ ملک مصطفیٰ علی کے کمرے میں جا کر وہ جس طرح اپنے جسم کے خدوخال اُن پر واضح کرنے کی کوشش کرچکی تھی۔ تب ملک مصطفیٰ علی نے اُسے بُری طرح جھاڑا بھی تھا، تب سے وہ ماہین سے کنی کترانے لگے تھے اور پھر کاشان احمد سے آخری ملاقات کے بعد ماہین نے خود بخود ملک مصطفیٰ علی کا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔ کاشان احمد کی محبت میں گرفتار ہوکر اس نے ملک مصطفیٰ علی کا راستہ چھوڑ دیا

تھا۔ ماہین تو صرف مصطفیٰ علی سے دل لگی کر رہی تھی۔ چھنو واپس جا چکی تھی کیونکہ وہ اب انہیں پھیکی چائے کی طرح لگنے لگی تھی۔ ملک مصطفیٰ علی بہت مصروف رہنے لگے تھے۔ دس بجے وہ آفس جاتے، رات گئے لوٹتے۔ سنڈے کو وہ گھر پر ہوتے تھے۔ عمار علی آئے ہوئے تھے۔ اس لیے ملک مصطفیٰ علی آج جلدی اُٹھ گئے تھے۔ ماہین اس وقت فریش اورنج جوس کے سپ لے رہی تھی جبکہ اُن دونوں بھائیوں نے ناشتے کے ساتھ چائے لی تھی۔

''لالہ بابا جان سے کہیں کچھ دنوں کے لیے لاہور آ جائیں۔ یہاں سرجن اقبال سکندر کو دکھائیں گے انہیں۔''

''مصطفیٰ میں نے اس بار بھی بہت اصرار کیا کہ آپ میرے ساتھ لاہور چلیں لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ میں سرگودھا میں اپنے دیرینہ دوست سرجن وقار شاہ ہی کو دکھاؤں گا۔ مجھے صرف اس کی تجویز کردہ دوائیں سوٹ کرتی ہیں۔ یہاں آ جاتے تو تھوڑا ماہی کا دل بھی لگا رہتا۔ پہلے تو امل کی کمپنی تھی اب تو یہ اکیلی بور ہو جاتی ہوگی۔'' گلاس میں اسٹرا گھماتی ماہین کی طرف دیکھتے ہوئے عمار علی نے کہا۔

''ماہی تم بور تو ہوتی ہوگی۔'' اب ملک عمار علی اس کی جانب متوجہ تھے۔

''عمار بھلا میں کیوں بور ہوں گی۔ مجھے اکیلے رہنے کی عادت ہے۔ دو بجے یونیورسٹی سے آتی ہوں، پھر ٹائم گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔ چار پانچ دن بعد آپ آ جاتے ہیں۔ بس ٹائم اچھا گزر جاتا ہے۔'' ملک مصطفیٰ علی نے ایک اچٹتی نگاہ ماہین پر ڈالی اور دوبارہ اپنی پلیٹ کی طرف توجہ مبذول کر لی۔

اس رات وہ کاشان احمد سے بات کرتے ہوئے بہت اُداس تھی۔

''تم کب آ رہے ہو شان؟''

''انشاء اللہ آئندہ سال، ماہین اتنا عرصہ ہم نے ایک دوسرے سے رابطہ نہیں رکھا تو اچھا ہی ہوا۔ اُس روز ایسے ہی ریان نے تم سے میری بات کرا دی۔ یقین جانو میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بمشکل خود کو سنبھالا تھا۔ میں اپنی اور تمہاری عادت خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چند دن بعد تمہارا فون آ گیا، تب میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ ماہی آئندہ مجھے فون نہ کرنا کیونکہ میرے دفتری امور ڈسٹرب ہوتے ہیں۔ میں نے تب ہنس کر تم سے کہا تھا۔ اگر تم میرے دماغ پر مسلط رہو گی تو میں دوسری حسین خواتین کو کیسے دیکھ پاؤں گا۔ اُس وقت تم تھوڑا سا بگڑیں، چند روز بعد پھر تمہارا فون آ گیا، تب مجھے تمہارا یوں فون آنا اچھا لگنے لگا۔ تم نہیں جانتی ہوا اتنا عرصہ میں خود پر جبر کرتا رہا تھا وہ سب تمہارے بار بار فون آنے سے دھرے کا دھرا رہ گیا۔''

''شان میں نے بھی اتنا عرصہ تم سے بات نہیں کی تو سکون میں تھی صبر آ گیا تھا۔ مگر اب ہر وقت تم یاد آتے ہو۔ تمہارا احساس میرے قریب منڈلاتا ہے۔ پل پل تم میرے دماغ پر سوار رہتے ہو۔ اچانک سے مہیب سناٹے مجھے ڈسنے لگتے ہیں۔ تب میں ملک عمار علی کی بجائے تمہاری مضبوط بانہوں کا سہارا تلاشتی ہوں۔ تب میں دل کی آنکھ سے تمہاری آنکھوں کی پتلیوں پر تھرکتی اپنی شبیہہ محسوس کر کے گہری طمانیت کی آغوش میں چلی جاتی ہوں۔ قطرہ قطرہ گزرتے پل خیالوں میں مجھے تمہارے بے حد قریب لے جاتے ہیں۔ عذاب لمحے تب مجھے ڈسنا بند کر دیتے ہیں۔ میں بہت بڑی حرماں نصیب ہوں، جس کا نصیب تم کبھی نہیں بن سکتے۔ میرے دل کے دریچے پر اب بھی جدائیوں کے موسم میری حالت زار پر مسکاتے ہیں۔ میری نم آنکھوں میں تمہاری محبت کی جوت دائروں کی صورت رقص کرتی ہے۔ آخر میں کب تک تنہائیوں میں پناہیں ڈھونڈتی پھروں گی۔''

''ماہی ان آنکھوں میں اُمیدوں کی شمعیں کبھی بجھنے نہ دینا۔ تمہارے سامنے تمہاری پوری زندگی پڑی ہے۔ تم

بچے خدا سے بہتری کی دعا کیا کرو۔ جب تمہارے بچے ہو جائیں گے تو تم خود ہی بہل جاؤ گی۔ تم ٹین ایج کی لڑکی نہیں رہی ہو، بلکہ اکیس سالہ دوشیزہ ہو، کم عمر لڑکیوں والی پاگل باتیں بھول جاؤ۔'' وہ ہمیشہ کی طرح اس بار پھر یہی راگ الاپ رہی تھی۔

''شان میں اپنی مرضی کے مطابق شاندار زندگی جینا چاہتی ہوں، چاہے وہ تھوڑی سی ہی کیوں نہ ہو۔''

''ماہی ایسا نہ کہو خدا تمہیں ہزاروں سال کی زندگی دے۔''

''واہ کاشان صاحب کیا بات کی ہے آپ نے! آج کل انسان سو سال بھی زندہ نہیں رہتا۔ اس چھوٹی سی زندگی میں اتنے تلخ تجربات سے گزر چکی ہوں، ہزاروں سال زندہ رہ کر کیا کروں گی۔'' وہ ہاہاکر کے پھر ہنسی۔

''ماہی تم جارحانہ انداز میں اپنے بارے میں کیوں سوچتی ہو؟''

''شان میرے لیے اب زندگی میں کشش نہیں رہی۔''

''ماہی ایسا نہیں کہتے۔ یہ خدا کی عطا کردہ بہت بڑی نعمت ہے۔ اس نعمت کا شکر ادا کیا کرو۔''

''ہاں شان شکر تو میں اُس مالک کا ہمیشہ ادا کرتی ہوں۔''

''اچھی بات ہے۔''

''شان۔''

''ہاں بولو۔''

''میں اب ملک عمار علی کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ میں کافی دنوں سے یہی سوچ رہی ہوں کہ اب مجھے ملک عمار علی سے الگ ہو جانا چاہیے۔''

''ماہی تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔ تم کیا بکواس کر رہی ہو۔''

''شان اچانک تم کیوں پریشان ہو گئے ہو۔''

''ماہی میں تمہاری کم عقلی پر پریشان ہوا ہوں۔ تم اپنی ہنستی بستی زندگی اجاڑنے پر تلی ہوئی ہو۔ کس قسم کا سودا کر رہی ہو تم اپنی ذات کے ساتھ۔ اس میں خسارہ ہی خسارہ ہے۔ عمار علی تم سے بہت محبت کرتا ہے، تمہیں اس بات کا احساس نہیں ہے، تمہیں کبھی ہوگا بھی نہیں۔ ماہی یہ نہ ہو بعد میں تمہیں اپنے فیصلے پر پچھتانا پڑے۔''

''شان تم مجھے یہ سارا لیکچر اس لیے دے رہے ہو کہ تم سمجھ رہے ہو، ایسا میں تمہاری خاطر کر رہی ہوں۔''

''ماہی تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔ میں تمہارا دوست ہوں۔ کبھی تمہارے لیے برا نہیں چاہوں گا۔ میں خود اذیت اٹھا لوں گا لیکن ایسا کبھی نہیں چاہوں گا کہ تمہیں کوئی پرابلم ہو۔''

''شان مجھے کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔ اگر تم میرا ساتھ دو تو۔''

''سوری ماہی میں اس سلسلے میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ تمہارے اندر ابھی تک بچپنا ہے۔ تم انتہائی جذباتی لڑکی ہو۔ پلیز...... پلیز ماہی تم ایسا کچھ نہ کرنا کہ اس کے بعد تمہیں صرف پشیمان ہونا پڑے۔ تم اتنی محبتیں کھو کر خوش رہ پاؤ گی۔ تم میرے لیے اب بھی متبرک ہو۔ میں تمہیں اسی طرح چاہتا رہوں گا۔ تم ایسا کوئی فیصلہ نہ کرنا کہ تم اتنے خوبصورت رشتے کھو کر ایک دم سے اکیلی پڑ جاؤ۔ ذرا انگلیوں پر شمار تو کرو تمہارے اس اقدام پر کتنے لوگ دکھی ہوں گے۔''

''کیا تم مجھے اپنانے کے لیے تیار نہیں ہو؟''

"اب تم عمار علی کی بیوی ہو اور وہ تمہارا شوہر، وہ تمہیں بہت چاہتا ہے۔ تم اُس کی محبت کی قدر کرو۔"

"شان میں اُس بزرگ نما شوہر سے کبھی محبت نہیں کر سکتی۔ شان لگتا ہے تم بھی دوسرے لوگوں کی طرح ہو۔ مجھ سے تمہیں محبت ہے ہی نہیں۔ اگر ہوتی تو تم یوں بہانے نہ بناتے۔"

"دیکھو ماہی گھر بہت مشکلوں سے بنتے ہیں، ٹوٹنے میں پل نہیں لگتا۔"

"شان تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ تمہیں برتی ہوئی عورت قبول نہیں۔"

"ماہی ایسا نہیں ہے میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میری خاطر اپنا گھر نہ توڑو۔"

"کاشان تمہاری خاطر میں ایسا قطعی نہیں کر رہی۔ اگر تم سے مجھے محبت نہ ہوتی تب بھی میں نے ملک عمار علی کے ساتھ نہیں رہنا تھا۔ یہ سب تو میں نے پہلے دن سے سوچ لیا تھا۔"

ان پلوں میں وحشتیں ماہین کی آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں۔ متحرک لب خشک ہو گئے تھے۔ وہ تو کاشان احمد کے ساتھ مل کر ایک چھوٹا سا چاکلیٹ گھروندہ بنانا چاہتی تھی۔ جس کی سفید چھتیں اور چاکلیٹ دیواریں تھیں۔ جہاں آتش دان میں چیڑ کی لکڑیاں جل کر موٹے موٹے لال انگاروں میں تبدیل ہوتی تھیں۔ جہاں گداز ایرانی قالینوں کی فرل میں پیر چھپائے فلور کشن پر شان کے ساتھ بیٹھے وہ دونوں ڈرائی فروٹ کھاتے ہوئے خوش گپیوں میں محو رہتے۔ اسے تو بس ایسی زندگی چاہیے تھی جہاں ایک دوجے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گلنار وادیوں کی سیروں کو وہ دونوں نکل جاتے۔ درمیان میں اُن کی محویت توڑنے والا کوئی نہ ہوتا۔

"شان کیا تم کسی اور کو پسند کرتے ہو؟" تھوڑی دیر خاموشی کے بعد اس نے چیٹ باکس میں لکھا تھا۔

"نہیں ماہی میں کسی کو پسند نہیں کرتا۔ تم بدگمانیوں کو دل میں جگہ مت دو۔" شان نے جواب دیا تھا۔

"شان تم نہ مانو مگر ایسا ہی ہے۔" وہ بے آواز آنسو گراتی رہی۔ اس کی انگلیوں کی پوریں تیزی سے کی بورڈ پر تھرک رہی تھیں۔

"تم استعمال شدہ عورت کو کیسے قبول کر سکتے ہو؟"

"کیا بکواس ہے یار! کیوں بار بار ایسا کہہ رہی ہو۔ تم واقعی ڈفر ہو۔ میں پھر تم احمق لڑکی سے یہی کہوں گا کہ اپنے شوہر سے دل لگانے کی کوشش کرو۔ ایسا تمہارے لیے دشوار ضرور ہے ناممکن نہیں ہے۔ اسی میں تمہاری بھلائی و بقا ہے۔ میں بھی ان ہی مردوں میں سے ہوں جو اپنی قدآور روایات کی پاسداری کرتے ہیں۔ تم اب اپنی اسٹڈی پر بھی توجہ دو۔ اپنا دھیان اِدھر اُدھر سے ہٹاؤ۔ میں تمہارا اچھا دوست ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔" بے قراری کی صلیبیں اسے اپنے گرد جکڑ رہی تھیں۔

اُس شب کاشان احمد سے بات کرنے کے بعد ماہین دیر تک روتی رہی تھی۔ اس نے کبھی نہ چاہا تھا اس کی بے فکر زندگی کے خوبصورت موسموں میں یہ موسم بھی آئیں جن میں چلنے والی ہوائیں اسے نوحے سناتی ہوں۔ گرد آلود کارواں اسے پامال کرتے، اپنا اتا پتا چھوڑ کر نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں، تب اس کے چاکلیٹ ہاؤس کے در و بام وقت اور موسموں کی دہکتی بھٹی میں جھلس کر راکھ کا ڈھیر بن جائیں۔

وہ اپنی خالی ہتھیلیوں کو گھورتی۔

"کیا اِن میں کاشان احمد کے نام کی کوئی ریکھا نہیں ہے۔ کئی راتیں وہ سو نہ سکی تھی۔ اسے ممی پاپا پر غصہ آتا۔ کبھی اُن کی مجبوریاں اس کی سوچوں کو آگ بگولہ ہونے سے بچاتیں۔ وقت کا یہ تلوار کی تیزی جیسا دھارا تھا جو

اس کی آشائیں اس کی امنگوں بھرے جذبے بہا کر لے گیا تھا۔ بس اپنی اپنی جگہ خوش و مطمئن تھے۔ سارے لوگ اپنے نرم گرم بستروں میں سکون سے سوتے تھے۔ بے سکون تھی تو صرف ماہین۔ جب اس کی بے سکونی حد سے بڑھی تو وہ وضو کر کے خدا کی بارگاہ میں کھڑی ہو کر نوافل پڑھنے میں مشغول ہو گئی۔

جوں جوں وہ خدا کی حمد و ثناء میں گم ہوتی جا رہی تھی، اُس کی روح، اُس کے دل کو گہری طمانیت میسر آ رہی تھی۔ وقت کے تھال میں لمحے، دن، ماہ تیزی سے گرتے رہے۔

☆......☆......☆

ماہین نے انگلش میں ماسٹرز مکمل کر لیا تھا۔ اس دوران کاشان احمد بھی پاکستان آ گیا۔ ماہین کا اُس سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ کاشان اب بہت بڑی پوسٹ پر تھا۔ انکل احمد ریٹائرڈ ہو چکے تھے۔ کاشان کی پوسٹنگ کراچی ہو گئی تھی۔ اس لیے اپنا گھر کرائے پر دے کر انکل آنٹی بھی کراچی شفٹ ہو گئے تھے۔ یہ سب اسے دُری نے بتایا تھا۔

وہ اکثر غیر شعوری طور پر کاشان کے فون کی منتظر رہتی۔ اس کے پاس کاشان کا نیا نمبر نہیں تھا۔ افرا آنٹی نے بھی شاید اپنی سم بدل لی تھی۔

اُس روز ماہین شاپنگ کے لیے نکلی تو واپسی پر کاشان کے گھر آ گئی۔ اندر سے کوئی اجنبی خاتون نکلیں۔

''السلام وعلیکم جی مجھے احمد انکل اور افرا آنٹی سے ملنا ہے۔''

''وہ لوگ تو کراچی شفٹ ہو گئے ہیں۔''

''اچھا!'' ماہین جانتی تھی اس نے سوچا ممکن ہے اُن کے کرائے دار سے اُن کا کوئی کونٹیکٹ نمبر مل جائے۔

''آپ کے پاس اُن کا کونٹیکٹ نمبر ہے تو پلیز مجھے دے دیں۔'' خاتون اچھی تھیں فوراً مان گئیں۔

''مسز احمد کا نمبر ہے میرے پاس۔ میں آپ کو ابھی دیتی ہوں۔'' وہ اپنا موبائل لینے اندر چلی گئیں۔

نمبر حاصل کرنے کے بعد وہ بوجھل دل سے تھکے تھکے قدم اٹھاتی گاڑی کی طرف بڑھ گئی جہاں ڈرائیور اس کا منتظر تھا۔ وہ راستے ہی میں تھی جب ملک عمار علی کا فون آ گیا۔

''ماہی بابا جان کو فالج کا اٹیک ہوا ہے لیفٹ سائیڈ پر۔ تم مصطفیٰ علی کے ساتھ جلدی آ جاؤ۔ میں نے مصطفیٰ علی کو بھی فون کر دیا ہے۔ وہ فیکٹری سے نکل چکا ہے۔''

''عمار آپ ماموں جان کو لاہور لے آئیں۔''

فی الحال تو انہیں سرگودھا اسپتال میں ایڈمٹ کیا ہے۔ ماہی دعا کرنا بابا جان ٹھیک ہو جائیں۔'' ملک عمار علی بہت پریشان تھے۔

''گھر پہنچ کر اُس نے جلدی سے پیکنگ کی۔ ماہین پریشان تھی۔ خدا سے ملک قاسم علی کی صحت کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ اللہ پاک انہیں صحت کے لمبی عمر دے۔'' ملک مصطفیٰ علی بھی فیکٹری سے آ گئے تھے۔

''ماہین تیار ہو جاؤ۔ ہمیں ابھی نکلنا ہے۔''

''مصطفیٰ بھائی میں تو تیار ہوں۔'' وہ لاؤنج میں بیٹھی مصطفیٰ علی کا ہی انتظار کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

وہ رات گیارہ بجے سرگودھا سرجن وقار شاہ کے کلینک پہنچے تھے۔ ریسپشن سے پتا کر کے وہ اوپر سیڑھیاں طے کرنے لگے۔ ملک عمار علی انہیں کوریڈور میں ہی مل گئے۔ اُن کے ساتھ ملک قاسم علی کے چچازاد ملک اکبر خان

اور اُن کا بیٹا عامر خان بھی تھے۔
''کیسی طبیعت ہے بابا جانی کی۔'' ملک مصطفیٰ علی نہایت تیزی سے عمار علی کے قریب آئے۔
''طبیعت ٹھیک نہیں ہے بابا جان کی۔ اُن کا پورا دایاں حصہ متاثر ہوا ہے۔ ہارٹ اٹیک کا حملہ بھی ہوا ہے۔ تم لوگ دعا کرو۔''
''عمار آپ نے دیکھا ماموں جان کو؟''
''نہیں وہ آئی سی یو میں ہیں۔ وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ انکل وقار شاہ اُن کے پاس ہی ہیں۔ ڈاکٹرز کا پورا پینل وہاں موجود ہے۔ بس تم لوگ دعا کرو۔'' ملک عمار علی گلوگیر لہجے میں بولے۔ اُن کی آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔ وہ بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ ماہین کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔
''ماہی تم اِدھر بیٹھ جاؤ۔'' ملک عمار علی نے اُسے صوفے پر بٹھا دیا۔ ماہین کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ خدا سے ملک قاسم علی کی زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔
''مالک رحم فرما دے! اپنا کوئی معجزہ دکھا دے۔'' ملک عمار علی ماہین کے قریب آ کر بیٹھ گئے۔
''حوصلہ رکھو ماہی! خدا ضرور رحم کرے گا۔'' ملک عمار علی نے اُس کا کندھا آہستگی سے دبایا۔
''امل آپی کو بتا دیا ہے؟''
''محمد علی کو میں نے فون کر دیا تھا۔ امل کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ محمد علی کہہ رہا تھا صبح اُسے بتاؤں گا اور ہم لوگ صبح ہی صبح یہاں سے چل پڑیں گے۔ چچا جان آپ بھی گھر چلے جائیں۔ مصطفیٰ تم بھی ماہین کو لے کر جہان آباد چلے جاؤ، میں ہوں یہاں پر۔''
''ہاں آپ لوگ جا کر آرام کریں میں ہوں یہاں عمار لالہ کے پاس۔'' عامر خان اُن کے قریب آ کر بولا۔
''ٹھیک ہے لالہ میں فون پر آپ سے رابطہ رکھوں گا۔''
''ماں جی کو تسلی دینا کہ بابا جان کی طبیعت پہلے سے بہتر ہے۔'' ملک مصطفیٰ علی نے اثبات میں سر ہلایا۔
''چلو ماہین۔'' محمد علی نے ماہین کو بغور دیکھا۔ دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور ملک مصطفیٰ علی کے پیچھے چلنے لگی۔

☆......☆......☆

ملک قاسم علی کا بی پی بہت نیچے گر گیا تھا۔ جس کی وجہ سے آہستہ آہستہ اُن کا باقی ماندہ جسم بھی متاثر ہو رہا تھا۔ ڈاکٹروں کی اَن تھک کوشش کے باوجود بھی جہان آباد کے سب سے بڑے ملک قاسم علی اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔
وہ ملک قاسم علی جن کے آباؤ اجداد قد آور شخصیات تھیں۔ جنہوں نے ہمیشہ اپنے وقار اور مرتبہ کا خیال رکھا۔ اپنی مدبرانہ روایات کا پاس رکھا۔ اُن کے دادا ملک شاہ جہاں، والد ملک مراد علی اور پھر ملک قاسم علی نے کبھی اپنے محکوم مزارعوں، ہاریوں کے ساتھ زیادتی نہ ہونے دی۔ ہر مشکل میں جہان آباد کی رعایا کا بھرپور طریقے سے ساتھ دیا۔ اُن کی محنت سے بڑھ کر انہیں اُجرت دی۔ جب بھی فصل کم ہوئی مزارعوں کے آبیانے معاف کر دیے جاتے۔ کھاد اور فصلوں کے اسپرے کے اخراجات بھی ملک قاسم علی خود برداشت کرتے۔ اُن پر اللہ کا بڑا احسان و کرم تھا۔ اُن کی نسل میں کوئی شخص ظالم، جابر پیدا نہیں ہوا تھا۔ سب ہی سے پُرشفقت رویہ رہتا اِن ملکوں کا۔ جہان آباد کے لوگوں کے ساتھ بھی بزرگوں نے مرنے سے پہلے اپنی اولادوں کو نصیحت کی تھی کہ گاؤں کے

غریبوں کا خیال رکھنا۔ انہیں ہماری اور ہمیں اُن کی ضرورت ہے۔ ملک مراد علی نے خاص طور پر ملک قاسم علی کو باور کرایا تھا کہ ان مزارعوں کے ساتھ کبھی زیادتی نہ ہونے دینا۔ قاسم پتر اس طرح ضرورت مندوں کی مدد کرنا کہ تمہارے دوسرے ہاتھ کو بھی علم نہ ہونے پائے۔ دینے والوں کو خدا بہت دیتا ہے۔

اور واقعی یہ سچ تھا۔ ان کی فصلیں ہر سال پہلے کی نسبت بہت زیادہ ہوتیں، ساتھ والے سیدوں کے گاؤں سے بھی زیادہ۔ جن کی زمین ان کی زمین کے ساتھ لگتی تھی۔ دس مربع زمین ملک قاسم نے وہاں سے اور خریدی تھی۔ اس میں ہر سال دو باغات بھی لگوا دیتے تھے۔ جن میں جامن، آم، کنو، مالٹا، امرود، آلو بخارے کے درخت تھے۔ ملک عمار علی باہر سے لٹریچر منگوا کر اُن کی مدد سے اُن باغات کی دیکھ بھال کراتے تھے۔ اچھی دیکھ بھال کا نتیجہ تھا کہ وہ پودے پانچ سالوں میں تناور درخت بن چکے تھے۔ اُس سال اُن پر بُور آ رہا تھا اور پھول بھی۔

آج پورا جہان آباد سوگوار تھا۔ کھیت کھلیان، درخت، سبھی افسردہ تھے۔ چپ کی بکل مارے نڈھال لمحوں میں دبکے رنجیدہ تھے۔ آج اُن کا بڑا مالک چلا گیا تھا۔ جن کا اس دنیا سے دانا پانی اُٹھ چکا تھا۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ قرآن پاک میں بار بار ارشاد فرمایا گیا ہے کہ نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔" اس مالک نے اپنا وعدہ قیامت تک سچ کر دکھانا ہے۔ کوئی بادشاہ ہے یا گداگر ہے، سبھی نے موت کی تلخی کا چہرہ دیکھنا ہے۔ یہ کڑوا گھونٹ پینا ہے چاہے ملک قاسم علی ہوتے یا اُن کے شکاری کتوں کی رہائش گاہ کی صفائی کرنے والا کوئی عام آدمی ہوتا۔ ملک قاسم علی کسی کو تکلیف نہ پہنچانے کی کوشش کرتے۔ وہ درختوں پر بھی پیار کا ہاتھ پھیرتے تھے۔ کھیتوں کھلیانوں میں کھڑی فصل کو اس پیار سے دیکھتے جیسے وہ اُن کی اولاد جیسی ہوں۔

اُن کے سفید براق شفاف نہایت خوبصورت کسرتی سراپے والے قد آور نایاب نسل کے دونوں گھوڑوں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ ان کے سامنے آج بھی صبح اُن کے خدمت گار عباس نے کالے چنے کا دلیہ جس میں اصلی دیسی گھی اور گڑ ملا ہوتا تھا، رکھا پڑا تھا۔ لیکن اُن دونوں نے اُس کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ اُن کی داہنی آنکھوں میں پانی جمع تھا۔ یہ گھوڑے ملک قاسم علی کے قریبی دوست شیخ سفیان بن حارث نے کچھ عرصہ پہلے جدہ سے خاص ان کے لیے بھجوائے تھے۔ اس سے پہلے سلطان بن عقبہ نے جو دو گھوڑے بھجوائے تھے۔ وہ اُن کے بے حد قریبی دوست چیف منسٹر کو پسند آ گئے تھے تو ملک قاسم علی نے انہیں دے دیے تھے۔ اب یہ دونوں گھوڑے سفید تھے۔ ایک کا نام انہوں نے شمشیر اور دوسرے کا حیدر رکھا تھا۔ دونوں گھوڑے اُن کے وفادار تھے۔ ملک قاسم علی کو دیکھتے ہی وہ دونوں کھل اٹھتے، شمشیر جسے وہ شمو کہتے تھے۔ اُن کے دل کے بہت قریب تھا اور حیدر کے دل کے قریب ملک قاسم علی تھے۔ شمو کو وہ زیادہ تر اپنے ساتھ ہی رکھتے تھے۔ اس پر ملک قاسم علی نے خوب سواری کی تھی۔ ملک قاسم علی شمو اور حیدر کو اپنے بچے کہتے تھے۔ ان دونوں کو خاص خوراک دی جاتی۔ دیسی گھی اور شہد ملا دودھ پلایا جاتا۔ روزانہ اُن دونوں کا خاص ملازم عباس اُن کی مالش کر کے انہیں نہلاتا، اُن کے بالوں پر برش پھیرتا۔ سردیوں میں روئی سے بھری دُلائیاں اُن پر ڈالی جاتیں، گرمیوں میں اُن کے اصطبل میں روم کولر لگے ہوتے تھے۔ صفائی کا خاص خیال رکھا جاتا۔ شمو اور حیدر نہایت نفیس گھوڑے تھے۔ وہ کبھی فرش پر گندنہ کرتے، صبح شام عباس اُنہیں باہر کھلی جگہ پر لے جاتا جہاں جا کر شمو اور حیدر فریش ہو جاتے۔ ایک گھنٹے تک کھیتوں کے ساتھ ساتھ بنی پگڈنڈیوں پر عباس انہیں گھماتا۔ چند دنوں سے شمو اور حیدر کی پیٹھ ملک قاسم علی کے لمس سے محروم تھی۔ وہ دونوں بے قرار تھے اپنے مالک کو دیکھنے کے لیے۔

آج صبح جب عباس شمو اور حیدر کے پاس آیا تو وہ سر جھکائے کھڑے تھے۔ اُن کے چہروں پر گہرا دکھ جھلک رہا تھا۔ اُن دونوں کی آنکھیں بھی گیلی تھیں۔ عباس شمو سے لپٹ کر دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ عباس کے آنسو شمو کے سر پر گر رہے تھے۔ آج وہ دونوں عباس کو دیکھ کر ہنہنائے نہیں تھے بلکہ اُن دونوں نے گردنیں اور جھکا لی تھیں۔

''شمو! حیدر! تمہارے ملک قاسم علی اس دنیا میں نہیں رہے۔ وہ ہم سب کو چھوڑ گئے۔''

شمو اور حیدر، عباس سے بہت مانوس تھے۔ عباس کی چھاتی کے ساتھ اب حیدر کا سر لگا ہوا تھا۔ وہ دونوں بہت ہی خاموش تھے۔ اُن کے چہروں پر اُداسی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ اب بھی سر جھکائے ہوئے تھے۔

''یار دیکھ ہمارا مالک چلا گیا۔ اب وہ کبھی نہیں آئیں گے۔ ہمیں وہ یتیم کر گئے۔'' دونوں عباس کی زبان بخوبی سمجھتے تھے۔ ان دونوں کی مالش کرتے ہوئے عباس اُن سے خوب باتیں کیا کرتا تھا۔ جب تک دونوں دانہ کھاتے رہتے، عباس اُن کے سامنے موڑھا ڈالے بیٹھا رہتا۔ اُن دونوں سے راز و نیاز کی باتیں کرتا۔ جب عباس کی اپنی بیوی سے لڑائی ہو جاتی وہ بھی ان دونوں کو آ کر بتاتا۔

''یار میں نے تمہاری بھرجائی سے روٹی مانگی۔ اُس نے غصے میں آ کر مکھن سے چوپڑی روٹیوں کی چنگیر میرے سامنے پٹخ دی۔ سبزی کی کٹوری بھی میرے آگے پھینک دی۔ آج کل جانے اُسے کیا تپ چڑھی ہوئی ہے۔ میں نے بھی یہ چپل اٹھائی اور کس کر اُس کی پیٹھ پر جڑ دی۔ وہ ٹرٹر کرنے لگی میں بھی بک بک کرتا رہا۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے سے دو دن سے نہیں بول رہے۔ ہم دونوں چاہ رہے ہیں اب ہماری صلح ہو جائے لیکن صلح کرائے کون؟'' وہ دونوں اُس کی باتوں پر اِدھر اُدھر سر مارتے ہنہناتے۔ ایک پاؤں فرش پر رگڑتے۔

اب عباس کندھے پر رکھے کپڑے سے آنسو پونچھتا۔ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ حیدر تو سامنے کی دیوار پر نگاہیں جمائے کھڑا رہا۔ شمو اب باقاعدگی سے اِدھر اُدھر سر مارنے لگا تھا۔ پھر اُس نے سخت فرش پر کھر مارنے شروع کر دیے۔ عباس اُسے دیکھتا رہا۔ آہستہ آہستہ اُس کے کھر مارنے میں تیزی آتی چلی گئی۔ وہ اس سفاکی سے فرش پر کھر پٹخ رہا تھا کہ فرش پر دراڑیں پڑنی شروع ہو گئی تھیں۔ اب وہ دراڑیں اور کھلی ہو رہی تھیں۔

''اُداس نہ ہو شمو! نہ میرے یار، یہ تو کیا کر رہا ہے۔'' عباس نے اُسے خود سے لپٹانا چاہا۔ شمو نے عباس کو دور پٹخ دیا۔

☆......☆......☆

آج گاؤں کا بچہ بچہ ملک قاسم علی کی موت پر نوحہ کناں تھا۔ گاؤں کے کسی بھی گھر میں فوتگی ہو جاتی۔ پہلی روٹی، کفن قبر کا خرچ ملکوں کا ہوتا۔ کسی کی بیٹی کی شادی ہوتی تو دس ہزار روپے، ایک بوری چاول، ایک بوری گندم کی دی جاتی۔ کسی کے ہاں بھی بیماری یا آپریشن ہوتا تو ملک قاسم علی کی طرف سے خرچہ دیا جاتا۔ بڑے ملک کے دم سے گاؤں کی رونقیں آباد تھیں۔ آج ہر آنکھ اشکبار تھی۔ گھر والے، عزیز و اقارب، گاؤں کی رعایا بھی غم سے نڈھال تھے۔

فوزیہ کو فوری طور پر ٹکٹ نہیں مل سکا تھا وہ چار دن بعد پہنچی تھیں۔ اکلوتی بہن کا اکلوتا بھائی اس دنیا سے جا چکا تھا۔ بہن نے بھائی کا آخری چہرہ بھی نہ دیکھا۔ فوزیہ کے آنسو خشک نہیں ہو رہے تھے۔ ماہین تو اپنے حواسوں میں تھی ہی نہیں۔ اُس کی نیلی آنکھوں میں اتنا پانی جانے کہاں سے اکٹھا ہو آیا تھا، جو آنکھوں سے نکل کر چہرے کا سفر طے کرتا ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ مہر النساء نے ایک لمبی چپ سادھ لی تھی۔ وہ خشک آنکھوں سے پُرسہ کرنے والے ہر شخص کو ٹکر ٹکر دیکھتی رہتیں۔ ملک قاسم علی نے جہان آباد کی متبرک ملکانی کا مان سمان گاؤں کے لوگوں میں

انہیں بخشا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی دلاری مہر النساء کی عزت کی تھی۔ ملک قاسم علی دھیمے مزاج کی بردبار شخصیت تھے، جنھوں نے باہر سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ اَن پڑھ بیوی کو یوں جانا جیسے آسمان پر چمکنے والا سب سے روشن ستارہ مہر النساء ہی ہیں۔ نہ ہی انہوں نے مہر النساء کے ساتھ کبھی بے وفائی کی۔ ہمیشہ ایک بھرپور اعتماد انہوں نے بیوی کو بخشا۔ کبھی انہوں نے کسی دوسری عورت کو مہر النساء کا شراکت دار نہ ٹھہرایا۔ مہر النساء ہی اُن کی پہلی و آخری محبت تھی۔

امیروں، وڈیروں کی خصلتوں میں عیاشیاں خود بخود، نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن ملک قاسم علی میں ایسی کوئی برائی نہیں تھی۔ اُن کی طرح ملک عمار علی بھی شریف النفس آدمی تھے جبکہ ملک مصطفیٰ علی نے چند عیاش دوستوں کی صحبت میں پڑ کر دل کھول کے عیاشیاں کیں، باہر بھی اور حویلی کے اندر بھی۔

ملک عمار علی بھائی کی عادات سے بخوبی واقف تھے اکثر ہنس کر ملک مصطفیٰ علی کے کندھے پر چپت لگاتے۔

''یار تم تو اپنے دادا ملک مراد علی پر گئے ہو۔ میرے خیال میں پوتا دادا سے نمبر لے گیا ہے۔'' ملک مراد علی کو شادی کے بعد ایک مزارعے کی بیٹی سے دھواں دھار قسم کا عشق ہو گیا تھا۔ گلبدن شادی شدہ تھی۔ ملک مراد علی کا اپنی جانب رجحان دیکھ کر گلبدن نے ان کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے کھیل ہی کھیل میں اپنا آپ ملک مراد علی کے حوالے کر دیا۔ مراد علی واقعی اُس پر دل و جان سے فدا ہو چکے تھے۔ شاید انہیں گلبدن سے پیار ہو گیا تھا۔ مرد کے دل کے بھی کیا کہنے، بڑا وسیع ہوتا ہے۔ بیک وقت کتنی محبتیں، کتنے پیار، اپنے اندر سمیٹنے کی قدرت رکھتا ہے۔ وہ لڑکی تھی یا ٹھنڈی مٹی سے بنی شراب کی بھری ہوئی صراحی جس نے اپنے اندر بے تحاشا کشش سمیٹی ہوئی تھی۔ گلبدن کو اپنے کالے کلوٹے خاوند سے سچا عشق تھا۔ اُس کا خاوند دوبئی جانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اُسے پیسہ درکار تھا۔ گلبدن نے ملک مراد علی کو ایسے اپنی خوبصورت سبز آنکھوں کی زمرد بھری وادیوں میں مقید کیا کہ وہاں سے باہر نکلنے کا راستہ ہی بھلا دیا۔

جب ملک شاہ جہاں کو اپنے بیٹے کے کارناموں کا علم ہوا تو انہوں نے مراد علی کو سختی سے تنبیہ کی۔ ملک شاہ جہاں کا ایک شفیق شخصیت کے ساتھ غصہ بھی قہر آلود تھا۔ ملک شاہ جہاں نے گلبدن کے باپ کو بلوا کر سمجھا دیا تھا کہ بیٹی کو لگام ڈالو۔ غلام محمد تم ایک نیک و شریف انسان ہو۔ یہ تمہاری عزت برباد کر رہی ہے۔ میرے پاس اس کی شکایتیں آ رہی ہیں۔'' انہوں نے ملک مراد علی کا نام درمیان سے غائب کر دیا تھا۔ غلام محمد نے ملک صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ گلبدن خوب پیسہ اکٹھا کر چکی تھی۔ تب اُس نے اپنے مرد کو دوبئی بھجوا دیا اور خود اپنے ساس سسر کے پاس شہر چلی گئی۔ ملک مراد علی نے وقت اور پیسہ ایک دھوکے باز عورت پر لٹایا تھا، انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ تب انہوں نے سچے دل سے اپنے خدا سے توبہ کی، گڑگڑا کر معافیاں مانگیں۔ انہیں ایسا سبق ملا تھا کہ پھر کبھی باہر کی عورت دیکھ کر منہ نہ مارا تھا۔

☆......☆......☆

ملک قاسم علی کا چالیسواں بھی ہو چکا تھا۔ اس دوران یاہین اچانک ملک قاسم علی کی بیماری کا سُن کر جلدی میں لاہور سے آتے ہوئے اپنی میڈیسن ساتھ رکھنا بھول گئی تھی۔ یہاں آ کر وہ ملک قاسم علی کی بیماری اور فوتگی میں ایسی گھن چکر بنی کہ اُسے کئی دنوں تک یاد ہی نہ رہا وہ دوائیں اسے ہر صورت استعمال کرنی ہیں ورنہ ناغہ کی صورت میں اُسے پریگنینسی ہو سکتی تھی۔ چند راتیں ملک عمار علی کے ساتھ رہنے کے بعد اُسے اچانک خیال آیا کئی دنوں سے وہ میڈیسن کھا ہی نہیں رہی۔ وہ چکرا کر رہ گئی۔ ایسا کوئی قابلِ اعتبار بندہ بھی نہیں تھا جس سے کہہ کر وہ شہر

سے دوائیں منگوالیتی۔ اگر کسی ملازم کو کہتی تو ہوسکتا تھا گھر کے کسی فرد کو پتا چل جاتا۔ ممی ابھی تک اِدھر ہی تھیں۔ پاپا نہیں آئے تھے۔ آیان اور ارسل آئے ہوئے تھے۔ کافی عرصہ بعد وہ ان سب سے ملی تھی۔ ممی سے اُس نے ڈھیروں شکوے کیے تھے۔ ماہین چاہ رہی تھی ممی کے ساتھ امریکہ چلی جائے۔ ابھی تک اس کا رزلٹ نہیں آیا تھا۔ ممی نے اُسے سمجھایا۔

''ماہین تم اس گھر کی بڑی بہو ہو۔ ابھی تو تمہارے ماموں کا چالیسواں بھی نہیں ہوا۔ میں چالیسویں تک یہاں نہیں رہ سکتی کیونکہ پیپر ہی صرف پندرہ دن کے بنے ہیں۔ بیٹا تمہیں ابھی سسرال میں رہنا چاہیے۔ امل کے ہاں بھی عنقریب ڈیلیوری ہونے والی ہے۔ اب تمام ذمے داریاں عمار اور تم پر ہیں۔ جنہیں تم دونوں نے خوش اسلوبی سے نبھانا ہے۔ ماہی تمہاری شادی کو پانچ سال ہوچکے ہیں۔ میں ہر وقت تمہاری گود ہری ہونے کی دعائیں کرتی ہوں۔ بیٹا اولاد میں بڑی کشش ہوتی ہے۔ یہ رشتوں کو اور مضبوط کرتی ہے۔''

ماہین کو ماں کی یہ باتیں اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ اس کے چہرے کا تناؤ بڑھ گیا تھا۔ آنکھیں چیخ رہی تھیں۔ شدید بیزاری اس کے چہرے پر قابض تھی۔

''ممی آپ کیوں نہیں چاہتیں کہ میں امریکہ جاؤں؟''

''ماہی تم ہزار بار آؤ کچھ عرصہ گزر جانے دو۔ پھر تم عمار کے ساتھ آنا۔ بیٹا تمہاری پھوپی اماں بالکل اکیلی ہوگئی ہیں۔ امل اپنے گھر کی ہے۔ مصطفیٰ کی ابھی شادی نہیں ہوئی کہ دوسری بہواُن کا خیال رکھ لے۔''

''ممی میں یہاں پر خوش نہیں ہوں۔'' غیر ارادی میں ماہین کے منہ سے نکل گیا۔

''ماہی کیا کہہ رہی ہو تم؟'' فوزیہ پریشان ہوگئیں۔ ورنہ وہ سمجھ رہی تھیں یہ صرف ہمارے لیے اُداس ہے، اس لیے یہ اس طرح کی باتیں کرتی رہتی ہے۔

''بیٹا کوئی پرابلم ہے تو کھل کر بات کرو۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں آپ سب کے لیے بہت اُداس رہتی ہوں، اس لیے میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔''

''بیٹا جو بات بھی ہے کھل کر بتاؤ۔ عمار تمہارے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرتا یا پھوپی ماں ٹھیک نہیں رہتیں۔''

''ممی آپ نے میری بہت بے جوڑ شادی کی ہے۔ اتنی بڑی عمر کے مرد سے آپ نے سترہ سالہ لڑکی کو بیاہ دیا۔ آخر آپ نے اتنی جلدی کیوں کی؟ کیا میں بوجھ تھی آپ پر؟'' اتنے عرصہ بعد آج شکوہ اُس کی زبان پر آ ہی گیا۔

''بیٹا ہم مجبور تھے تمہارے پاپا قطعی نہیں مان رہے تھے کہ جوان، کنواری بیٹی کو امریکہ لے کر جائیں۔ وہاں کے حالات بہت خراب ہیں۔ وہ لوگ مسلمانوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔ وہاں کا بچہ بچہ نفرت کرتا ہے مسلمانوں سے۔ نائن الیون کے بعد تو اُن کے اندر شدید زہر بھر گیا ہے مسلم کمیونٹی کے لیے۔ تمہارے پاپا تو تین ماہ پہلے سے اُدھر ہی تھے۔ وہ وہاں کے حالات کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اُن ہی کے اپارٹمنٹ میں کراچی کی فیملی کی جوان خوبصورت بیٹی کو دن دھاڑے گن پوائنٹ پر لے جا کر گینگ ریپ کیا اور پھر برہنہ حالت میں پھینک گئے۔ وہاں کی پولیس نے بھی کچھ نہ کیا۔''

''ممی اگر آپ کو میری اتنی ہی فکر تھی تو آپ امریکہ نہ جاتیں۔ اگر میری شادی کرنی ہی تھی تو کسی میرے ہم عمر، مزاج شناس سے کرتیں۔'' آج ماہین دل کے پھپھولے پھوڑنے پر تلی ہوئی تھی۔ اُس کے اندر الاؤ کی

صورت اکٹھی ہوئی برداشت اب ختم ہو چکی تھی جبھی وہ اس طرح ری ایکٹ کر رہی تھی۔

"ماہی تمہارے بھائیوں نے پڑھنا تھا۔" فوزیہ اپنی صفائیاں دے رہی تھیں۔

"بیٹوں کی تعلیم کی خاطر آپ نے بیٹی کی تعلیم ادھوری رہنے دی۔ ممی آپ مان کیوں نہیں لیتیں کہ آپ نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے۔ آپ نے کبھی بھی میرے ایموشنز کا خیال نہ کیا۔"

"بیٹا اب تمہیں اسی گھر میں ایڈجسٹمنٹ کرنی ہوگی۔ تم یہیں پر دل لگاؤ۔ اب تو تمہارے ماموں بھی نہیں رہے۔ تمہیں ان سب کا خیال رکھنا چاہیے۔ میں عمار سے کہوں گی تمہیں کچھ عرصہ بعد امریکا کا چکر لگوا لائے۔ میرا بچہ اب تم نے بالکل پریشان نہیں رہنا، تمہاری وجہ سے میں بھی پریشان رہتی ہوں۔" وہ اس موضوع پر ماہین سے مزید بات نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ واقعی اُن سے غلطی ہوئی تھی۔ اتنی جلدی انہیں ماہین کی شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ بہت زیادہ فرق تھا اسلام آباد اور جہان آباد کے ماحول میں۔ تمام عمر شہر میں رہنے والی لڑکی کو اس گاؤں میں ڈال دیا گیا۔ وہ بھی اُس سے عمر میں بہت بڑے مرد سے بیاہ کر۔ ہم لوگ چند فائدوں کے لیے بڑے بڑے نقصان کر لیتے ہیں۔

☆......☆......☆

دوسرے روز ممی چلی گئیں۔ اُن کے جانے کے بعد ماہین اور اُداس ہوگئی تھی۔ اُس کی پیاری سی ناک ضبط سے سرخ ہوئی جا رہی تھی۔ سب مہمان رخصت ہو چکے تھے۔

امل کا پہلے بیٹا تھا اب دوبارہ اُس کی ڈلیوری نزدیک تھی۔ اُس نے چالیسویں کے بعد جانا تھا۔ آج کل محمد علی کی پوسٹنگ پنڈی میں تھی۔ دن پلک جھپکتے گزر رہے تھے۔ وقت میں ایسی کٹھور اُداسی جانے کہاں سے بھر گئی تھی۔

ملک قاسم علی کا چالیسواں بھی ہوگیا تھا۔ ملک مصطفیٰ علی لاہور واپس آ گئے تھے۔ اُن کی غیر موجودگی میں فیکٹری میں شدید بے ترتیبی ہوگئی تھی۔ ملک عمار علی اپنے تعطل میں پڑے زرعی امور پر دوبارہ توجہ دینے لگے تھے۔ مزارعے ابھی تک بڑے ملک صاحب کے صدمے سے باہر نہیں نکلے تھے۔ ہر بات میں اُن کا ذکر ڈھونڈ نکالتے۔ اُن کی اچھائیوں، اُن کی کرم نوازیوں کے گن گاتے۔ بیوہ عورتیں جن کے ملک صاحب نے وظیفے مقرر کر رکھے تھے۔ وہ بھی فکر مند تھیں کہ اب جانے ملک عمار علی اُن کا خیال رکھیں نہ رکھیں۔

اس صبح جب ملک عمار علی مردان خانے میں دالان میں بیٹھے مزارعوں کے مسائل سن رہے تھے۔ ایک بوڑھی عورت اُن کے پاس چلی آئی۔

"چھوٹے ملک ہم تو ایک دم سے ہی بے سہارا ہوگئے ہیں بڑے ملک کے جانے سے۔ وہ پورے گاؤں کو یتیم کر گئے ہیں۔ ہر پہلی تاریخ کو مجھے گھر بیٹھے وظیفے کے پیسے مل جاتے تھے۔ بڑے مالک نے کہا تھا مائی فتح بیگم ساون کا مہینہ گزر جائے تو میں تمہیں شہر بھجواؤں گا تاکہ تمہاری بائیں آنکھ کا موتیا کا آپریشن کرایا جاسکے۔ چھوٹے ملک میں بہت غریب ہوں۔ ایک میرا بیٹا کمانے والا ہے اور آٹھ جی کھانے والے ہیں۔ سردیوں میں تو وہ کام کر ہی نہیں سکتا۔ وہ بیچارہ دمے کا مریض ہے۔ پہلے بڑے ملک صاحب بہت مدد کر دیتے تھے۔ اُن کی ناگہانی موت پر پورے گاؤں کو اپنی اپنی فکر پڑی ہوئی ہے۔ بڑے ملک صاحب کی خدا ترسی سے گاؤں والوں کے دو وقت کے چولہے جلتے تھے۔"

"مائی فتح تم فکر نہیں کرو، اللہ مالک ہے۔ تمہاری آنکھوں کا آپریشن بھی ساون کے بعد ضرور ہوگا اور آئندہ تمہیں وظیفہ بھی ہر پہلی کو ملے گا بلکہ سب کو ملے گا۔ ابھی میں سب کے ناموں کے اندراج والے رجسٹر چیک نہیں

کر سکا اور پھر بابا جان کی وفات کی وجہ سے تمہیں وظیفہ ملنے میں تاخیر ہوئی، آج تمہارے گھر میں وظیفے کی رقم پہنچ جائے گی۔ مائی تم بے فکر ہو کر اپنے گھر جاؤ۔ فلکو تمام رجسٹر یہاں لے کر آؤ اور جو فریادی آئے تمام کے مسائل نوٹ کرواور روزانہ صبح کے وقت مجھے بتاؤ۔"

"جی بہتر ملک صاحب۔" اُن کی پیٹھ پیچھے کھڑے فلکو نے جواب دیا۔ 'بڑے ملک جو کام میرے ذمے لگا گئے ہیں انشاء اللہ اُن میں کبھی لاپروائی نہیں برتی جائے گی۔ اللہ پاک میری مدد کرنا' ملک عمار علی نے دل میں دعا مانگی۔

☆......☆......☆

دو دن سے ماہین کی طبیعت عجیب سی ہو رہی تھی۔ شدید قسم کی بے کلی اُس کے اندر پھیلی ہوئی تھی۔ وہ خود کو بیزار اور کاہل محسوس کر رہی تھی۔ اُس کا سر بھی چکرا رہا تھا۔ بہو ہونے کے ناتے اچانک اُس پر ذمے داریوں کا پہاڑ آن گرا تھا۔ وہ ایسے کاموں کی عادی ہی نہیں تھی۔ نوکروں کی فوج کے باوجود پھوپی ماں کا حکم تھا کہ تم خود مہمانوں کو دیکھو۔ تقریباً روزانہ گاؤں کی عورتیں ایک چکر ضرور بڑی حویلی کا لگاتی تھیں۔ یہ عورتیں بڑے مالک کی وفات کے بعد ہی سے چھوٹی ملکانی کو مراد محل کی اندرونِ خانہ کی سربراہ سمجھنے لگے تھیں۔ مہر النساء بیگم کی صحت، اب اُن کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ بھی چاہتی تھیں کہ ماہین یہاں کے لوگوں سے گھل مل جائے اور اُن سب بے لوث محبت کرنے والوں کو اتنی ہی محبت دے۔ آج کے افراتفری کے دور میں جہان آباد واحد ریاست تھی جہاں کی رعایا اپنے مالکوں سے خوش تھی کیونکہ یہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا تھا، کسی کا حق نہیں مارا جاتا تھا۔ یہاں کے مکینوں کی دادرسی پراولیت دی جاتی تھی۔ پھر اُن کی فلاح کے لیے فوری طور پر اقدام اٹھائے جاتے تھے۔ یہاں پر عقوبت خانے بھی تھے، اگر غلطی سے کوئی نوعمر لڑکا چوری یا کسی دوسرے معاشرے کے بگاڑ کے فعل میں یہاں کا ماحول خراب کرنے کی کوشش کرتا تو یہاں بنائے گئے عقوبت خانوں کی اُسے سیر ضرور کرائی جاتی تاکہ دوبارہ کوئی ایسی جرأت نہ کر سکے اور اس طرح باقی لوگ بھی محتاط ہو جاتے۔ اگر کوئی دوسری بار کسی بھی قسم کی غلطی کر جاتا تو فوری طور پر اُسے جہان آباد چھوڑ دینے کا پروانہ جاری کر دیا جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں امن وامان تھا۔ کوئی جرم کرنے سے پہلے دس بار ضرور سوچا جاتا۔ یہاں پر آپس میں دشمنیاں بھی نہیں تھیں کیونکہ یہاں کسی دوسری پارٹی کی زمین نہیں تھی۔ یہاں کی تمام ریاست ملک شاہ جہاں کی نسلوں کی تھی۔ جنہوں نے آج تک اپنی ریاست کا ایک مرلہ بھی نہیں بیچا تھا۔ یہاں رہنے والوں کو رہائش کے لیے جگہ دی گئی تھی۔ ملک شاہ جہاں کے زمانے سے لکھ کر دے دیا گیا تھا کہ ہمیشہ تم اور تمہاری آنے والی نسلیں جس طرح چاہیں یہاں رہیں لیکن تم میں سے کوئی بھی تاحیات یہ جگہ بیچ نہیں سکتا۔ کیونکہ اس جگہ کی مالک شاہ جہاں کی نسلیں ہوں گی۔ لوگ بے فکر ہو کر یہاں رہ رہے تھے۔ اُن پر کسی قسم کا جبر مسلط نہیں تھا۔ جہاں عدل ہو، خدا کے بتائے گئے احکامات کی پیروی کی جائے، وہاں مسائل زیادہ پیدا نہیں ہوتے۔

"مہر النساء بیگم بار بار یہی باتیں، ماہین کو سمجھاتیں۔ وہ مراد محل کی ملکانی تھیں، کبھی تکبر وغرور کا شائبہ اُن میں دکھائی نہیں دیا تھا۔ خداوند نے بے دریغ رزق سے انہیں نوازا۔ وہ چاہتا تو پل بھر میں سب لے سکتا تھا۔ زمین پر بسنے والوں کا دانا پانی کا ذمہ خدا نے خود لیا ہوا ہے، پھر انسان کون ہوتا ہے دوسرے انسان پر اپنی برتری جتانے والا۔" یہ تمام باتیں بزرگ اپنی نسل کو ذہن نشین کرواتے چلے آ رہے تھے۔

اب مہر النساء بیگم ماہین کو سمجھا کر خود پر عائد فرض نبھا رہی تھیں۔ ماہین کو پھوپی ماں کی ایسی باتیں ناگوار محسوس ہوتیں۔ دل میں سوچتی آپ بے شک لیکچر دیتی رہیں، میں نے یہاں رہنا ہی نہیں تو ان باتوں پر عمل کیوں کروں بھلا۔

ماہین آج کل بہت سست ہو رہی تھی۔ بستر سے اٹھنے کو اُس کا دل نہ چاہتا۔ وہ بولائی بولائی اِدھر اُدھر پھرتی رہتی۔ اسے فکر کھائے جا رہی تھی کہ اگر وہ پریگیننٹ ہوگئی تو کیا ہوگا؟

اُس روز وہ پھوپی ماں کے پاس برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ گاؤں کی چند عورتیں بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ سبھی اپنے اپنے مسائل بیان کر رہی تھیں۔

ماسی وزیراں بہت رو رہی تھیں۔ بھتیجے سے اُس نے اپنی سولہ سالہ بیٹی بیاہی تھی۔ وہ شہر میں نوکری کرتا تھا اور نو بیاہتا دلہن کو گاؤں میں رکھا ہوا تھا۔ سب کے مجبور کرنے پر وہ اُسے اپنے ساتھ شہر لے گیا تھا۔ وہاں جا کر ماسی وزیراں کی بیٹی کو پتا چلا کہ اس کے خاوند نے پہلے بھی شہر میں بیاہ رچا رکھا ہے اور اس کی ایک بیٹی بھی ہے۔

وہ رو رو کر اپنی کہانی سُنا رہی تھی۔ پھوپی ماں اور ماہین اُسے دلاسے دے رہی تھیں۔ اچانک ماہین کے منہ کا ذائقہ بگڑنے لگا تھا۔ اُس کا سر چکرایا اور اُسے متلی آنے لگی تو وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔

''چھوٹی مالکن کب سے الٹیاں کر رہی ہیں؟'' جہاندیدہ رحمت مائی نے پوچھا۔

''کل بھی کہہ رہی تھی مجھے چکر آ رہے ہیں، ساتھ ہی متلی ہونے لگی۔'' پھوپی ماں نے بتایا۔

''مبارک ہو بڑی ملکانی۔ آپ دادی بننے والی ہیں۔ چھوٹی ملکانی کا رنگ آپ نے نہیں دیکھا۔ سرسوں کے پھول جیسا ہو رہا ہے۔ آنکھوں میں سفیدی ہے۔ بہت بہت مبارکاں وڈی ملکانی جی!'' سب عورتیں انہیں مبارک باد دے رہی تھیں۔ وہ تمام بھرپور طریقے سے اپنی خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔ تاکہ اتنی بڑی خوشی کے موقع پر وہ ان غریب عورتوں کو کچھ عنایت کر دیں۔

''خیر مبارک! خیر مبارک!'' مہر النساء بیگم بہت خوش تھیں۔

''اللہ پاک تم سب کی زبان مبارک کرے۔'' انہوں نے فرشی چاندنی پر بیٹھی عورتوں کو سو سو کے نوٹ پکڑا دیے۔ انہوں نے لال نوٹوں سے مٹھی گرم کی اور دعائیں دینے لگیں۔ یہاں کے لوگوں کی دعائیں ہی تو تھیں جو ملکوں کے اس خاندان کو اللہ پاک نے بے تحاشا نوازا تھا۔

ملک عمار علی پوری رعایا کے دلوں میں بستے تھے۔ گاؤں کا بچہ بچہ ملک عمار علی کی نرینہ اولاد کے لیے دعائیں کرتا۔ ان لوگوں کی دعائیں فیض یاب ہوگئی تھیں۔ ملک شاہ جہاں کی نسل کے ایک اور وارث کی اُمید لگ گئی تھی۔ وہ عورتیں دعائیں دیتی چلی گئی تھیں۔

''ماہین کو تو دیکھوں۔'' مہر النساء گھٹنوں کو پکڑتے ہوئے بمشکل اُٹھ پائیں اور طویل راہداری عبور کرتی ماہین کے کمرے میں آ گئیں۔

''پتر طبیعت تو ٹھیک ہے۔ کیوں اُلٹیاں آ رہی ہیں؟'' وہ بیڈ پر لیٹی تھی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''پھوپی ماں شاید کچھ اُلٹا سیدھا کھا لیا ہوگا۔'' وہ گلے پر ہاتھ پھیرتی گلا صاف کرتے ہوئے بولی۔ اُس کی آنکھیں گلے کی خراشوں کی وجہ سے پانی سے بھر رہی تھیں، جنہیں وہ ٹشو پیپر سے صاف کرنے لگی۔

''اچھا تم لیٹ جاؤ میں گلنار کو تمہارے پاس بھیجتی ہوں۔'' پھوپی ماں نے اُس سے کوئی بات نہ کی وہ چاہ رہی تھیں کہ پہلے لیڈی ڈاکٹر سے چیک اپ کرا لیا جائے۔

''پھوپی ماں کھٹی چیز کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔''

''ماں صدقے۔'' اب مہر النساء رہ نہ سکیں اور فٹ اُس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔

"پھر میں ابھی امل بھجواتی ہوں۔" وہ تیزی سے باہر نکل گئیں۔
ڈرائیور کو خوشاب بھجوا کر لیڈی ڈاکٹر صدف کو ملک عمار علی نے بلا لیا تھا۔ اچھی طرح چیک اپ کے بعد ڈاکٹر صدف نے باہر آ کر بتایا۔
"ملک صاحب بہت بہت مبارک ہو۔ آپ باپ بننے والے ہیں۔" ملک عمار علی کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھے۔ ماہین کو بیڈ سے ہلنے نہیں دیا جا رہا تھا۔ ملک عمار علی اب پہلے سے بھی زیادہ ماہین کا خیال رکھنے لگے تھے۔ اُسے دیکھ کر ہنستے، خوش ہوتے۔ آج کل اُن کے پاؤں ہی زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ وہ بار بار خدا کا شکر ادا کرتے۔
ملک قاسم علی کی وفات کے بعد سب نے پہلی مرتبہ ملک عمار علی کو یوں خوش دیکھا تھا۔ اس ریاست کا نیا وارث آنے والا تھا، خوش کیسے نہ ہوتے۔
یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے گاؤں میں پھیل گئی تھی۔ صدقے کے بکرے دیے جا رہے تھے۔ زردے کی دیگیں پکوا کر غربا میں تقسیم کی گئی تھیں۔ ریاست کے لوگ خیریت سے نئے مالک کے آنے کی دعائیں مانگ رہے تھے، خوشی منا رہے تھے جیسے آج کوئی غیر معمولی دن ہو۔
اسی روز دن دہاڑے ساتھ والے شاہوں کے گاؤں میں دو قتل ہوئے تھے۔ وہاں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ جہان آباد میں خوشی کے شادیانے بج رہے تھے۔ حکمران اگر ایماندار اور عدل کرنے والا ہو تو وہاں کبھی بھی تشدد جنم نہیں لیتا، جہاں لوٹ مار کا بازار گرم ہو، حکمران اپنی تجوریاں بھرنے میں لگے ہوں، وہاں ناحق، نادار کا خون بہا تو ہوتا ہی ہے۔ چھوٹی چھوٹی لڑائیاں طول اختیار کر جاتی ہیں۔

☆......☆......☆

امل نے سُنا تو وہ بہت خوش ہوئی۔ اُس کے بھی مبارک باد کے فون آئے۔ اُس کی پریگننسی کا آخری ماہ چل رہا تھا۔ ماہین کی وجہ سے مہر النساء بھی امل کے پاس نہیں جا سکتی تھیں۔ امل کی ساس اور نند اُس کے پاس آ گئی تھیں کیونکہ امل کا بیٹا اذہان بمشکل ایک سال کا تھا۔ مہر النساء کو امل کی طرف سے تسلی تھی۔ امل کے اپنے سسرال والوں کے ساتھ بہت اچھے تعلقات تھے، جبھی تو وہ بہت جلد اور آسانی سے وہاں ایڈجسٹ ہو گئی تھی۔
ماہین کسی صورت ماں نہیں بننا چاہتی تھی۔ 'یہ سب کیوں ہو گیا ہے۔' دن میں کئی بار یہ بات اس کے ذہن میں پارے کی طرح پھیلتی۔ 'مجھے عمار علی کے ساتھ نہیں رہنا، اب دوسرا مسئلہ شروع ہو گیا ہے۔' وہ اُس وقت کو کوستی جب لاہور سے آتے ہوئے وہ اپنی میڈیسن ساتھ رکھنا بھول گئی تھی۔ اسے بیڈ سے ہلنے نہ دیا جاتا۔ ڈاکٹر صدف ہر ہفتہ آ کر اسے چیک کرتی۔ اُس روز ڈاکٹر صدف ملک عمار علی سے کہہ رہی تھیں۔
"ملک صاحب صبح شام اِن کو ہلکی پھلکی واک کرایا کریں۔" لیکن مہر النساء لان میں ماہین کے چلنے پھرنے سے وہم کرتی تھیں۔ ہر وقت مراد محل میں گاؤں کی عورتیں آتی رہتی تھیں، بعض عورتوں پر طرح طرح کے پرچھاویں ہوتے ہیں۔ وہ باغ میں اسے بھیجنے سے اس لیے ڈرتی تھیں کہ گھنے درختوں پر جن، بھوت پریت کا بسیرا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں وہاں جانا ٹھیک نہیں۔ اپنے کمرے یا طویل راہداری میں چہل قدمی کر لیا کرے۔ کیونکہ گاؤں کی عورتوں کو حویلی کے کمروں میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔

☆......☆......☆

اہل نے ایک پیاری سی بچی کو جنم دیا تھا۔ ماں اور بچی دونوں خیریت سے تھیں۔ محمد علی بہت خوش تھے کہ اُن کے گھر خدا کی رحمت آئی تھی۔ سب خوش تھے کہ دو سال کے اندر اندر ان لوگوں کی فیملی مکمل ہوگئی۔

بچی کا نام مریم رکھا گیا تھا۔ میجر محمد علی ہنستے۔

''احمد اور مریم...... کس قدر خوبصورت نام ہیں میرے بچوں کے۔''

مہرالنساء نے پورے گاؤں میں خیرات تقسیم کرائی تھی۔ اس موقع پر ملک قاسم علی سب کو بہت یاد آرہے تھے۔

ماہین کا کافی عرصہ سے کاشان سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ دُری، اور بیبو کے فون آجاتے۔ زنیرہ کی شادی ہوچکی تھی۔ منزہ بھی کبھار نیٹ پر بات کرلیتی۔ لاہور اُسے جانے نہیں دیا جارہا تھا کیونکہ لال حویلی میں سیڑھیاں چڑھنے کا مسئلہ تھا۔ ممی بھی فون کرتی رہتیں اور اسے مکمل ریسٹ کا مشورہ دیتیں۔ Skype پر بھی اُن سے بات ہوتی رہتی تھی۔ وہ پاپا، آیان اور ارسل سے بھی باتیں کرتی۔ اُن سے گپ شپ کے دوران ماہین کا ٹائم اچھا گزر جاتا۔ وقت اپنا سفر طے کررہا تھا۔

☆......☆......☆

خوشبوؤں کے پیرہن میں لپٹی، میٹھی اوس کے قطروں میں بھیگی صبح جب ہر طرف موذن کی آواز میں 'اللہ ہو اکبر اللہ ہو اکبر' کی صدائیں پھیل رہی تھیں۔ گلبرگ میں ڈاکٹر صبا کے کلینک میں ماہین نے ایک چاند سے بیٹے کو جنم دیا۔

ڈاکٹر صبا نے جب سب کو خوشخبری سنائی تو اُن کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ملک عمار علی اُسی وقت قریبی مسجد میں جاکر خدا کے حضور شکرانہ سجدے میں گر گئے۔ دیر تلک وہ شکرانے کے نوافل پڑھتے رہے۔

جہان آباد خبر پہنچ چکی تھی۔ وہاں خوشی کے شادیانے بج رہے تھے۔ لوگ جوق در جوق مراد محل میں مبارک باد دینے کے لیے اُمڈ رہے تھے۔ ملک عمار علی کا حکم تھا کسی کو خالی ہاتھ نہ بھیجا جائے۔ ملک مصطفیٰ علی بھی بہت خوش تھے بار بار عمار لالہ کے گلے مل رہے تھے۔ اہل دو دن پہلے سے ماہین کے پاس تھی۔ ماں جی آج دوپہر جہان آباد چلی گئی تھیں۔ بیبو نے اس کی سب دوستوں کو بتا دیا تھا۔ سب کے مبارک باد کے فون آئے تھے۔

ماہین بچے کی آمد سے پہلے ہر لمحے یہی سوچتی رہتی کہ یہ بچہ کیوں آرہا ہے۔ میں نے تو اس کی کبھی خواہش نہیں کی پھر بن بلائے کیوں آرہا ہے۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے عمار علی کے ساتھ رہنا ہی نہیں ہے تو آخر اسے درمیان میں آنے کی کیا ضرورت تھی۔'' شروع سے لے کر آخر تک وہ یہی سوچتی رہتی تھی۔ کسی طرح اسے ختم کروادوں۔ اُسے ہر صورت کاشان سے شادی کرنی تھی۔ اس نے پختہ ارادہ کرلیا تھا۔ اُسے آنے والے بچے پر بہت غصہ آتا۔

بچے کا نام 'حسان علی' رکھا گیا، جس کی شکل ہو بہو باپ دادا جیسی تھی۔

حسان علی اب دو ماہ کا ہوچکا تھا۔ جب وہ گول گول آنکھیں گھما کر قلقاریاں بھرتا تو اس کے ننھے ننھے گلابی گال پھول جاتے۔ اُس کے آتشی ہونٹ کھلکھلاتے اور وہ ماہین کو دیکھ کر زور زور سے بانہیں چلاتا۔ ماہین ہونٹوں کو سختی سے بھینچے اُسے ایک ٹک دیکھتی رہتی۔ غیر ارادی میں اُس کی آنکھوں میں تناؤ بھرنے لگتا۔

''ماہین پتر اُٹھا لو اِسے، دیکھو تو کیسے تمہیں دیکھ رہا ہے۔'' مہرالنساء نے کہا۔ تب ماہین نے اُسے اٹھالیا۔

''پتر اسے اندر لے جاکر دودھ پلاؤ۔ بھوک لگی ہوگی اسے۔''

(عشق کی راہداریوں میں، زندگی کی سچ بیانیوں کی چشم کشائی کرتے اِس خوبصورت ناول کی اگلی قسط، انشاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

''ویسے تو اکثر مرد غصے کے تیز ہوتے ہیں لیکن اریج کا مزاج تو تم جانتے ہو۔ گھر میں کوئی تیز آواز میں بات کرے تو اُس سے برداشت نہیں ہوتا۔ اس کے لیے تو کوئی بہت دھیمے مزاج اور نرم لہجے میں بولنے والا شخص ہونا چاہیے۔'' چاچی آپ اتنا مت سوچیں۔ سمیر بہت......

بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا، ایک یادگار افسانہ

جس دن پہلی مرتبہ سمیر نے اُس پر ہاتھ اُٹھایا تھا۔ اُس نے فوراً ہی یہ فیصلہ کرلیا تھا۔ سمیر کے گھر سے نکلتے ہی اُس نے ضروری سامان ایک سوٹ کیس میں رکھا اور تینوں بچوں کو لے کر امی کے گھر آ گئی۔

سمیر غصے کا بہت تیز تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر چیخنا، دھاڑنا، اس کا معمول تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بے دریغ گالیاں بکتا تھا۔ اب تک تو وہ خاموشی سے برداشت کرتی رہی تھی اِس لیے کہ اُسے سمیر سے بہت محبت تھی۔ لیکن اب بات بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ کسی صورت یہ برداشت نہیں کرسکتی تھی کہ اِس کے بچوں کے سامنے اُس کی اِس طرح بے عزتی کی جائے جبکہ بات بھی اتنی بڑی نہیں تھی۔

سمیر اس کے چچازاد بھائی تنویر کا دوست تھا۔ اُس سے سمیر کا رشتہ بھی تنویر کی کوششوں سے ہوا تھا۔ شادی کے بعد سمیر اور تنویر نے ایک ساتھ کاروبار شروع کیا۔ کاروبار نیا نیا تھا، دونوں جان توڑ محنت کررہے تھے اور جب کاروبار اچھا خاصا جم گیا تو لوگوں نے دونوں کے درمیان شدید قسم کی غلط فہمیاں پیدا کردی جو بالآخر اِس انجام کو پہنچ گئیں کہ سمیر نے تنویر کو کاروبار سے الگ کردیا کہ انویسٹمنٹ ساری سمیر کی تھی۔ اُس نے تنویر کو نہ صرف کاروبار سے الگ کیا بلکہ اُس سے اور اُس کے گھر والوں سے قطع تعلق کرلیا۔ اُس پر بھی پابندی عائد کردی کہ وہ اُن لوگوں سے نہ ملے۔ اُس کے لیے یہ پابندی کسی قیامت سے کم نہیں تھی۔ اُس کے میکے میں مشترکہ خاندانی نظام تھا۔ اُس کے باپ اور چچا ساری زندگی ایک ہی گھر میں رہے۔ ساس، جیٹھانی، دیورانی اور نندوں میں مثالی محبت تھی۔ چھوٹی موٹی رنجشیں بھی دلوں میں فاصلے نہ پیدا کرسکیں۔ دونوں بیٹے اور بہوئیں دادی کا بے حد احترام کرتے تھے اور یہی سب اُن کے بچوں نے سیکھا تھا۔ وہ سب چار بہن بھائی

تھے اور چچا کے تین بچے تھے۔ وہ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ گھر میں باپ کی بھی لاڈلی تھی اور چچا اور پھوپیوں کی بھی، بلکہ اُسے لگتا چاچو اُسے اپنے بچوں سے زیادہ چاہتے ہیں۔ اُس کی بچپن سے یہ عادت تھی کہ اگر کوئی اُس سے سخت لہجے میں بھی بات کرتا تو وہ پہروں روتی رہتی۔ حدیہ

کہ اگر امی بھی کسی بات پر سرزنش کرتیں تو وہ اُن سے ناراض ہوکر چاچو کے پاس آ جاتی۔ چاچو بہت توجہ سے اُس کی شکایت سنتے، اُسے سمجھاتے پھر امی کے پاس لے جا کر صلح صفائی کروا دیتے۔ امی اکثر یہی کہتیں۔

''تم اِس کو بگاڑ دو گے۔ لڑکی ذات ہے، اتنی نازک مزاجی اچھی نہیں ہوتی۔ نہ جانے کیسا گھر ملے۔ اگر اسی طرح ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہونے کی عادت پڑ گئی تو سسرال میں کیسے گزارا کرے گی۔'' اور امی کے اِن جملوں پر چاچو ہنس کر کہتے۔

''بھابی آپ دیکھیے گا، ہم اپنی شہزادی کے لیے ایسا شہزادہ تلاش کریں گے جو ہماری شہزادی کو کبھی ناراض نہیں ہونے دے گا۔'' اور امی چاچو کی بات پر دل میں ''آمین'' کہتیں۔

''خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو۔'' اور چاچو پورے یقین سے کہتے۔

''آپ فکر نہ کریں ایسا ہی ہوگا۔''

اور جب چاچو کے بیٹے تنویر کے ذریعے سمیر کا رشتہ آیا تو سب سے زیادہ پُرجوش چاچو تھے۔ سمیر لندن سے ایم بی اے کر کے آیا تھا۔ وہ تنویر کا باس تھا۔ لیکن تنویر سے اس کی اچھی خاصی بے تکلفی ہوگئی تھی۔ سمیر کی آدھی سے زیادہ فیملی باہر رہتی تھی۔ صرف سمیر ہی ماں کے ساتھ پاکستان میں رہتا تھا۔ اُس کا گھر بہت بڑا اور عالیشان تھا۔ پیسے کی فراوانی تھی۔ دیکھنے میں بھی بہت خوبرو تھا۔ اُس نے تنویر کے گھر کسی فنکشن میں 'اُسے' دیکھ لیا تھا اور اسکارف پہنے، گلابی رنگت اور سنہرے بالوں والی نازک سی لڑکی اُسے اتنی اچھی لگی کہ اُس نے اُسی وقت اُسے اپنانے کا فیصلہ کرلیا۔

سمیر نے جب تنویر سے اُس کے بارے میں پوچھا اور رشتے کی بات کی تو تنویر تو گویا ہواؤں میں اُڑنے لگا۔ اتنا بڑا خاندان اور اتنے پیسے والے لوگ...... وہ تو اِس رشتے پر اتنا خوش تھا کہ جب امی نے اس سے سمیر کے مزاج کے بارے میں پوچھا تو وہ اس کے غصے کے بارے میں جانتے ہوئے بھی انجان بن گیا۔

''مزاج کا تو بہت اچھا ہے۔ بس غصے کا ذرا تیز ہے۔'' امی یہ سُن کر تھوڑا متفکر ہوگئیں۔

''ویسے تو اکثر مرد غصے کے تیز ہوتے ہیں لیکن ایرج کا مزاج تو تم جانتے ہو۔ گھر میں کوئی تیز آواز میں بات کرے تو اُس سے برداشت نہیں ہوتا۔ اس کے لیے تو کوئی بہت دھیمے مزاج اور نرم لہجے میں بولنے والا شخص ہونا چاہیے۔''

''چاچی آپ اتنا مت سوچیں۔ سمیر بہت اچھا لڑکا ہے، اور اگر وہ غصہ کرتا ہے تو جائز بات پر کرتا ہے، کبھی غلط بات پر غصہ نہیں کرتا۔'' تنویر نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

''بھابی میں نے بھی سمیر کے بارے میں جہاں جہاں معلومات کی ہیں۔ سب ہی نے تعریف کی ہے۔ پھر میں اُس سے خود ملا ہوں۔ بہت مہذب اور پڑھا لکھا شخص ہے۔'' چاچو نے بھی تنویر کی طرف داری کی۔

پھر سب کے باہمی مشاورت سے یہ رشتہ پکا ہوگیا۔ اور دو ماہ کے اندر ہی وہ بیاہ کر سمیر کی زندگی میں شامل ہوگئی۔

زندگی ایکدم بدل گئی تھی۔ بے حد خوبصورت گھر، نوکر چاکر، اور اِس چھوٹی سی مملکت کی وہ بلاشرکت غیرے مالکن تھی۔ گھر میں صرف اُس کی ساس تھیں۔ جو اکثر و بیشتر ملک سے باہر دوسرے بچوں کے پاس ہوتیں اور جب پاکستان میں

ہوتیں تب بھی اُن کا آنا جانا اتنا زیادہ ہوتا کہ انہیں گھر میں رہنے کا موقع کم ہی ملتا۔

اُسے سب کچھ بہت اچھا اور نیا نیا لگ رہا تھا۔ پھر سمیر کی محبت جو ہر وقت نشے کی طرح اُس کے حواسوں پر چھائی رہتی۔ سمیر اُسے دیوانہ وار چاہتا تھا۔ وہ اُسے ہنی مون کے لیے ملائیشیا، سنگاپور لے گیا تھا۔ جہاں ایک مہینہ گزار کر جب وہ واپس آئی تو اتنی حسین ہوگئی تھی کہ اُس کے چہرے پر نظر نہیں ٹکتی تھی۔

''یار تم نے تو مجھے بالکل نکما کر دیا ہے۔ اب نہ آفس جانے کو دل چاہتا ہے اور نہ کام کرنے کو۔ دل چاہتا ہے ہر وقت تمہیں دیکھتا رہوں۔ تم ایک لمحے کے لیے بھی نظروں سے دور ہو جاتی ہو تو دل بیٹھنے لگتا ہے۔'' وہ اس کی دیوانگی پر سرشار ہو جاتی لیکن بظاہر خفگی سے کہتی۔

''رہنے بھی دیں، باتیں نہ بنائیں۔ کوئی بھی خوبصورت لڑکی آپ کے سامنے آجائے آپ اُسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتے ہیں۔''

''ہاں دیکھتا ہوں اور اِس لیے غور سے دیکھتا ہوں کہ شاید کوئی ایسی صورت نظر آجائے جو تم سے زیادہ خوبصورت ہو...... لیکن کیا کروں ...... ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔'' وہ شرارت سے قہقہہ لگا کر کہتا۔

''اور ہوگی بھی نہیں۔'' وہ ناز سے اٹھلا کر کہتی۔

''کیوں بھلا......؟''

''اِس لیے کہ وہ غیر لڑکیاں ہوتی ہیں اور میں آپ کی بیوی ہوں اور شریف مردوں کو اپنی بیوی کے سوا اور کوئی لڑکی حسین نہیں لگتی۔'' وہ بھی شوخی سے کہتی۔

''اوہو! اِس صدی کا سب سے بڑا جوک (Joke)۔'' وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔

''میں شریف مردوں کی بات کر رہی ہوں۔''

''اِس کا مطلب ہے آپ کا شوہر دنیا کا سب سے شریف مرد ہے۔'' وہ ہونٹ دبا کر مسکرایا۔

''اس میں کیا شک ہے؟'' وہ بھی سراپا ناز بن کر مسکرائی۔

''خدا آپ کے اِس یقین کو سلامت رکھے۔'' اُس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

شادی کے بعد ایک ماہ تک وہ تتلی بنی زندگی کے پھولوں سے خوشیاں کشید کرتی رہی۔ ہر طرف بہار ہی بہار تھی۔ خوشیوں کے سارے رنگ جیسے زمین پر اُتر آئے تھے۔ ابھی تک سمیر کی زبان سے پھول برس رہے تھے۔ اُس کا لہجہ محبت کے امرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ لیکن پورے ایک ماہ بعد جب اُس نے پہلی دفعہ اریج کے سامنے گالی بکی تو وہ جیسے پتھر کی ہوگئی۔

وہ دونوں ملائیشیا سے پاکستان آرہے تھے۔ رات کے کھانے کے بعد جب چائے سرو کی جارہی تھی تو نہ جانے کیسے وہ نوجوان لڑکا لڑکھڑایا اور اُس کے ہاتھ میں موجود کیتلی سے چائے سمیر کے سفید کھڑکھڑاتے ہوئے شلوار قمیض پر چھلک گئی۔ سمیر کا دماغ بھنا گیا۔ اُس نے بلا جھجک گالیاں بکنی شروع کر دیں۔ جہاز کا سارا عملہ جمع ہوگیا۔ چیف اسٹیورڈ نے معافی مانگی لیکن اُس کا غصہ کم نہیں ہوا۔

''سالا...... الو کا...... (گالی)......!'' وہ سیٹ پر بیٹھا مسلسل گالیاں بک رہا تھا اور وہ سب مسافروں کے سامنے شرم سے پانی پانی ہوئی جارہی تھی۔

''تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ تم کیوں اتنی زرد

ہو رہی ہو۔'' اُس کا غصہ کم ہوا تو اُس نے اریج کی طرف دیکھا اور اُس کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔

''مجھے...... مجھے تو کچھ نہیں ہوا۔'' وہ تھوک نگل کر بڑی مشکل سے بولی۔ اُس کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

''شکل دیکھو برسوں کی بیمار لگ رہی ہو۔'' وہ اپنا غصہ بھول کر اُس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''مجھے آپ کے غصے سے خوف آرہا ہے۔ میں نے کبھی کسی کو اس طرح چلاتے نہیں سُنا۔'' اس کا لہجہ ابھی تک سہما ہوا تھا۔

''اوہو! تو تم میرے غصے سے ڈر گئیں۔ اچھا وعدہ! آئندہ کبھی تمہارے سامنے غصہ نہیں کروں گا۔'' اس نے جھک کر سرگوشی کی۔

اُس کا دل تھوڑا سا قابو میں آگیا۔ شاید میری محبت اِن کے مزاج کی تپش کو کم کردے لیکن یہ اُس کی خام خیالی تھی۔ پاکستان آنے کے دو دن بعد ہی وہ صبح ہی صبح ڈرائیور پر برس پڑا، جس نے گاڑی میں آئل تبدیل نہیں کروایا تھا اور جب اُس نے گاڑی اسٹارٹ کی تو گاڑی میں سے آواز آنے لگی۔

''آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ غصہ نہیں کریں گے، پھر بھی آپ اتنی سی بات پر اتنا گرم ہو گئے۔'' جب وہ اچھی طرح گرج برس کر گھر میں داخل ہوا تو اُس نے اُس کا خوشگوار موڈ دیکھ کر اُسے اُس کا وعدہ یاد دلایا۔

''اوہ!'' میں تو بھول ہی گیا تھا کہ میں نے اپنی بہت پیاری نئی نویلی دلہن سے یہ وعدہ کیا ہے، اچھا سوری! آئندہ بالکل ایسا نہیں ہوگا۔ اگر غصہ آ بھی گیا تو تمہارے سامنے بالکل نہیں کروں گا۔ مجھے معلوم نہیں تھا جتنی نازک میری بیوی ہے اُس سے کہیں نازک اُس کا دل ہے۔'' اُس نے بچوں کی طرح اُس کے سامنے کان پکڑ لیے۔

وہ اس کے وعدے پر خوش ہوگئی۔ لیکن پھر ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ وہ فون پر کسی کو باتیں سنانے لگا اور غصے میں نہ جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔ وہ گھبرا کر کچن میں چلی گئی۔

''تمہیں پتا ہے یہ کون تھا۔'' فون رکھ کر وہ اُس کے پیچھے پیچھے کچن میں آگیا۔ اور اُسے لرزتا کانپتا دیکھ کر اُسے پانی پلایا، پھر لاؤنج میں صوفے پر بیٹھا کر نرم لہجے میں بولا۔

''جو بھی تھا...... انسان تو ہوگا۔'' اُس نے ہمت کرکے یہ جملہ کہہ دیا۔

''یہ انسان نہیں ہیں، سب جانور ہیں۔ بے ایمان، دھوکے باز، یہ اکاؤنٹس میں ہے، بڑے گھپلے کرتا ہے۔ اِن کے ساتھ سختی نہ برتی جائے تو یہ مالکوں کو بیچ کر کھا جائیں۔''

''ایسا تو نہیں ہے۔ میرے چاچو بھی اکاؤنٹنٹ ہیں۔ اُن کے اونر تو اُن کی بہت عزت کرتے ہیں۔''

''سب ایک جیسے نہیں ہوتے، تمہارے چاچو یقیناً شریف انسان ہیں، یہ لیکن بہت بڑا...... ہے۔ اِس...... کو بار بار ڈوز دینی پڑتی ہے۔''

''اگر وہ ایسا ہے تو آپ اُسے فارغ کردیں۔'' اس نے سادگی سے مشورہ دیا۔

''میں کیسے فارغ کردوں۔ میری فرم تھوڑی ہے۔ یہ مالکوں کا بہت سر چڑھا ہے۔ پھر کسی وزیر کی سفارش سے آیا ہے۔ مالکان بھی اِسے نہیں نکال سکتے۔ اِن جیسے لوگوں کو نکالنا آسان نہیں۔ یہ کالی دیمکیں ہیں جو ہمارے سارے نظام کو اندر ہی اندر کھوکھلا کررہی ہیں۔''

''مجھے تو اِن باتوں کی سمجھ نہیں آتی یہ کرپٹ لوگ ہیں اور انہیں کوئی نکال بھی نہیں سکتا۔'' وہ

اُلجھ کر بولی۔

''تو تم سے کس نے کہا ہے کہ اپنے نرم و نازک دماغ کو اِن باتوں میں اُلجھاؤ۔'' وہ مسکرا دیا۔

''آپ میرے سامنے اِس طرح بات نہ کیا کریں۔ مجھے گھبراہٹ ہوتی ہے۔'' اُس نے موقع غنیمت جان کر اُسے سمجھایا تو اُس نے پھر وعدہ کرلیا۔

''چلیں جو آپ کا حکم! ہم تو آپ کے حکم کے غلام ہیں۔'' وہ پھر اُس کے وعدے پر اعتبار کرلیتی۔ ابھی تک یہ غنیمت تھا کہ وہ سب پر غصہ کرتا، سب پر چیختا، دھاڑتا لیکن اُس نے کبھی اُس سے تیز آواز میں بات نہیں کی تھی۔ اُس سے بات کرتے ہوئے تو اُس کے لہجے سے شہد ٹپکتا، ایک ایک لفظ محبت کی امرت میں بھیگا ہوتا۔ اُس کے گھر والوں کے سامنے وہ اس قدر خوبصورت گفتگو کرتا کہ وہ حیران رہ جاتی۔ گھر والے اُس کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے تھے۔ وہ بھی میکے میں اُس کا بھرم قائم رکھے ہوئے تھی۔

☆......☆......☆

پھر سال کے اندر ہی خدا نے اُس کی گود بھر دی۔ عمیر ہو بہو اُس کی تصویر تھا۔ اسی کی طرح سرخ و سفید، اُسی کی طرح خوبصورت۔ وہ گویا اُس پر فدا تھا۔ اُس کی ذرا ذرا سی بات پر بے حد خوش ہوتا لیکن رات کو جب وہ روتا تو وہ ایک دم بپھر جاتا۔

وہ سب کچھ برداشت کرتی لیکن بچوں کے سامنے ایسی زبان اس کے لیے برداشت کے قابل نہ تھی۔ وہ غصے میں آجاتی، پھر اُن دونوں کی بات چیت بند ہوجاتی۔ وہ اُس کے اِس طرح خاموش ہونے پر بہت اُلجھتا تھا، چڑتا تھا۔ اُس کا غصہ ملازموں پر نکلتا پھر بالآخر وہی گھر کے سکون کی خاطر ناراضگی ختم کر دیتی۔

اِسی دھوپ چھاؤں جیسی زندگی میں اُس کے تین بچے ہوگئے۔ سمیر نے ملازمت چھوڑ کر کاروبار کرلیا اور تنویر سے اُس کا جھگڑا ہوگیا۔ وہ اپنے باپ کے گھر جاتی لیکن پڑوس میں چاچو کے گھر نہیں جاسکتی تھی اور نہ ہی اُن کے گھر کی کسی تقریب میں جانے کا وہ سوچ سکتی تھی۔ وہ تو محفل میں اُن کی فیملی کا کوئی فرد مل جائے تو وہ کنی کترا کر نکل جاتی۔

تنویر کی شادی ہوئی جو اُسے اپنے بھائیوں کی طرح پیارا تھا۔ وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ تنویر سے چھوٹے کی منگنی ہوئی، جو اس کا ہم عمر تھا اور ایک ہی کلاس میں تھا۔ دونوں ہمیشہ ساتھ اسکول جاتے، ساتھ پڑھتے، اُس نے فون پر بڑی لجاجت سے کہا تھا۔

''اریج تم نہیں آؤ گی تو مجھے یہ خوشی ادھوری لگے گی۔''

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن سارا دن گھر میں روتی رہی۔ رات کو جب سمیر آیا اور اُس کی سوجی ہوئی آنکھیں دیکھیں تو گھبرا گیا۔

''خیریت ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔''

''امی کا فون آیا تھا۔ کل شاہ میر کی منگنی ہے۔''

''اوہ! تو تمہیں اُس تقریب میں شرکت نہ کرنے کا غم ہے۔'' سمیر نے گہری سانس لی۔

''سمیر...... میں اور شاہ میر ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے۔'' اُس نے اس سے اجازت لینے کے لیے تمہید باندھنی شروع کی۔

''ہاں میں جانتا ہوں۔ تم کئی دفعہ یہ بات بتا چکی ہو۔'' سمیر نے اُس کی بات کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ ویسے بھی اب شادی کو چھ سال گزر چکے

تھے۔ ناز اٹھانے اور چاؤ چونچلوں کا زمانہ بیت چکا تھا۔

''شاہ میر کی منگنی ہال میں ہو رہی ہے۔ میں ہال سے ہی گھر آ جاؤں گی۔'' اُس نے ہمت کر کے بالآخر دل کی بات کہہ ہی دی۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حیرت ہے تم اب تک میرا مزاج نہیں سمجھیں۔ میں بہت ضدی ہوں۔ جو بات ایک بار کہہ دوں اُس پر ہمیشہ قائم رہتا ہوں۔ تم اگر اُن لوگوں سے ملنا چاہتی ہو تو شوق سے ملو۔ اُن کے گھر جاؤ، شاہ میر کی منگنی میں شریک ہو۔ لیکن......'' وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا اور وہ جیسے سولی پر لٹک گئی۔

''لیکن......!'' اُس کی زبان گنگ تھی لیکن پورا وجود سوال کر رہا تھا۔

''لیکن پھر میرے گھر نہ آنا!'' اُس نے پھندا گلے میں ڈال کر پوری قوت سے کھینچ لیا اور سیکنڈوں میں اُس کا جسم بے جان ہو گیا۔ سمیر یہ کہہ کر فریش ہونے واش روم میں چلا گیا اور وہ خالی جسم لیے کچن میں آ گئی۔

شام کی چائے کے لیے سموسے تلتے، کباب بناتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں بار بار نمکین پانی آتا رہا اور وہ سب کچھ بھلانے کی کوشش کرتی رہی۔ اُس نے شام کی چائے تیار کر کے اپنے آپ کو بھی فریش کیا کہ سمیر کو روتی ہوئی صورتیں سخت ناپسند تھیں۔

☆......☆......☆

تنویر کے گھر شادی کے تین سال بعد بیٹا پیدا ہوا۔ اُس نے فون پر ہی مبارکباد دے دی۔ لیکن جب سے اُسے چاچو کی بیماری کا پتا چلا تھا۔ اُسے ایک پل قرار نہیں تھا۔ چاچو کو کینسر ہو گیا تھا۔ انہیں علاج کے لیے باہر لے جایا جا رہا تھا۔ وہ اُس سے ملنے کے لیے بہت بے چین تھے۔ انہوں نے کئی بار فون بھی کیا تھا کہ وہ اُسے ایک نظر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُس نے سمیر سے ذکر کیا لیکن اُس کا دل اتنا پتھر ہو گیا تھا کہ اُن کی بیماری کا سُن کر بھی نہیں پسیجا۔

''یہ سب اُن کے صاحبزادے کے کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔ دوسروں کے مال پر قبضہ کرنے والے اِسی دنیا میں عذاب بھگت لیتے ہیں۔'' اُس نے انتہائی سفاکی سے یہ جملے کہے تھے۔

''اس میں چاچو کا کیا قصور! وہ تو ساری زندگی رزقِ حلال کی تگ و دو ہی کرتے رہے۔'' سمیر کا جملہ سُن کر اُس کا دل جیسے خون ہو گیا۔

''اولاد وہی کرتی ہے جو والدین اُسے سکھاتے ہیں۔ تنویر نے جو کچھ کیا اس میں تمہارے چاچو کی تربیت کا ہاتھ ہے۔''

''تو آپ جو اِس طرح دوسروں کو گالیاں دیتے ہیں، اس میں بھی آپ کے والدین کی تربیت کا ہاتھ ہے؟'' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئی۔

''ہاں ہاں......سو فیصد میرے باپ نے مجھے یہی سکھایا ہے کہ کبھی کسی غلط بات پر سر نہیں جھکانا۔ جو تمہیں ایک سنائے تم اُسے دس سنانا تاکہ غلط کام کرنے والے کو آئندہ غلطی کرنے کی ہمت نہ ہو۔'' اریج کی بات پر اُس کا پارہ چڑھنے لگا۔

''میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ ہمارے مذہب میں اِس طرح کی زبان کی کوئی گنجائش نہیں ہے، جو زبان آپ استعمال کرتے ہیں۔''

''ہاں تمہارے مذہب میں تو لوگوں کو دھوکہ اور فریب دینے کی گنجائش ہے، اِسی لیے تو ساری دنیا میں مسلمان ذلیل و خوار ہو رہے ہیں کہ وہ لوگوں کو دھوکہ اور فریب دینے میں کوئی ثانی نہیں

رکھتے۔'' سمیر ہمیشہ سے مشن اسکولوں میں پڑھا تھا اور پھر باہر جا کر اُس نے مسلمانوں کے خلاف بہت کچھ سُنا بھی تھا اور دیکھا بھی تھا اور ویسے بھی مذہب سے اُس کو کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ وہ تو عید بقر عید بھی نماز نہیں پڑھتا تھا۔ کبھی اُس نے روزے نہیں رکھے۔ قرآن اُس نے کھول کر نہیں دیکھا تھا، بلکہ اُس کے نماز پڑھنے پر وہ اُس کا مذاق اڑاتا تھا۔ اُسے ملانی، اُستانی اور نہ جانے کیا کیا کہا کرتا تھا۔

☆......☆......☆

''بیٹا اظہر کی حالت بہت خراب ہے۔ تم کسی طرح اُسے دیکھنے آجاؤ۔ وہ تم سے ملنے کے لیے بہت بے قرار ہے۔'' وہ سمیر اور بچوں کے جانے کے بعد ماسی سے گھر کی صفائی کروا رہی تھی تو امی کا فون آ گیا۔

''امی آپ ایسی بات کیوں کر رہی ہیں جو میں نہیں کر سکتی۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''تم سمیر سے کچھ زیادہ ہی ڈرتی ہو۔ وہ بھلا کیا کر سکتا ہے۔ اُسے سمجھاؤ، رشتوں کا احساس دلاؤ۔'' امی سمیر کے مزاج سے پوری طرح واقف نہیں تھیں اس لیے اُسے سمجھا رہی تھیں۔

''آپ کیا سمجھتی ہیں میں انہیں سمجھاتی نہیں۔'' وہ جھنجلا گئی۔

''مجھے تو سمجھ میں نہیں آتا تم کسی قسم کی بیوی ہو۔ اتنی سی بات شوہر کو نہیں سمجھا سکتیں۔'' امی اپنا ہی راگ الاپ رہی تھیں۔

''میں کیا کروں......وہ نہیں سنتے۔''

''دیکھو بیٹا! تم نے ہر دفعہ اپنی من مانی کی۔ تم اُن کے گھر کی کسی تقریب میں شریک نہیں ہوئیں، میں نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن اب میں خاموش نہیں رہ سکتی۔ وہ تمہیں باپ سے زیادہ چاہتا ہے۔ اُس کے بیٹے کے عمل کی سزا اُسے کیوں دے رہی ہو۔ تم میاں کی محبت میں سارے رشتے بھول گئیں۔ تمہیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ یہ چچا تم سے کتنا پیار کرتا تھا۔

ذرا سا بیمار ہو جاتیں تو رات رات بھر جاگتا۔ کسی بات پر روٹھ جاتیں تو گھنٹوں بہلاتا۔ اُس نے آج تک تمہاری کسی خواہش کو رد نہیں کیا۔''

امی کے الفاظ سے اُس کا دل پانی پانی ہو رہا تھا۔

''امی آپ مجھے کیا سمجھتی ہیں؟ کیا مجھے اِن باتوں کا احساس نہیں ہے۔ کیا میں سب کچھ بھول چکی ہوں۔''

''میں کچھ نہیں جانتی۔ ڈاکٹروں نے اُسے جواب دے دیا ہے۔ وہ چند دن کا مہمان ہے۔ آ سکتی ہو تو آجاؤ ورنہ ساری زندگی روتی رہوگی۔''

امی نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا اور پھر اُسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اُس نے ماسی کو روانہ کیا، گھر بند کر کے ٹیکسی لی اور فوراً اسپتال پہنچ گئی۔

چاچو اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر اُس کے صبر وضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے۔

''چا......چو......میں بہت بری ہوں۔ آپ کی یہ حالت ہو گئی۔ میں......آپ سے......ملنے بھی نہ آ سکی......چا......چو......مجھے معا......ف کر دیجیے۔'' وہ رو رہی تھی، بلک رہی تھی اور چاچو نے زبان سے ایک حرف کہے بغیر آنسوؤں کے ذریعے اُس تک اپنے سارے احساسات پہنچا دیے۔

وہ دو گھنٹے اُن کے پاس بیٹھی رہی۔ اُن سے باتیں کرتی رہی، اُن سے مل کر وہ اسپتال سے نکلی تو اُسی وقت تنویر اسپتال میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ گیٹ پر ہی اُس سے باتیں کرنے لگا۔ اُس کے

وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اُسی وقت سمیر نے گاڑی سے اُسے تنویر سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

وہ گھر آ گئی اور بہت مطمئن تھی کہ وہ چاچو سے مل کر آ گئی تھی۔ طوفان تو اس وقت اُٹھا جب سمیر نے گھر میں داخل ہوتے ہی اُس سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آ رہی ہے۔

''میں کہاں سے آ رہی ہوں۔ میں تو صبح سے گھر میں ہوں۔'' اُس نے صاف صاف جھوٹ بول دیا۔

''تم جھوٹ بول رہی ہو۔'' وہ چیخنے لگا۔

''میں کیوں جھوٹ بولوں گی۔ میں گھر میں تھی۔'' وہ ہمیشہ کی طرح اُس کے چلانے پر خوفزدہ ہو گئی۔

''تم گھر میں نہیں تھیں۔ میں نے خود اسپتال کے گیٹ پر تمہیں تنویر سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا ہے۔''

''ہاں! میں اسپتال گئی تھی۔'' وہ زیادہ دیر اپنے جھوٹ پر قائم نہ رہ سکی۔

''تم نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ میرے اعتماد کو دھوکہ دیا۔ تم جانتی ہو مجھے جھوٹ سے کتنی نفرت ہے۔''

''میں نے آپ کے اعتبار کو دھوکہ نہیں دیا۔ میں اپنے چچا کو دیکھنے گئی تھی اور جھوٹ بولنے پر آپ نے مجھے مجبور کیا۔''

''تم وہاں کیوں گئیں۔ جب میں نے تمہیں وہاں جانے سے منع کیا تھا۔''

''اِس لیے کہ وہ میرے چچا ہیں اور بسترِ مرگ پر ہیں۔'' وہ بھی غصے سے چلائی۔

''میں کچھ نہیں جانتا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ تم جھوٹی اور دھوکے باز ہو۔'' اُس نے بدتمیزی کی انتہا کر دی۔

''ہاں...... ہاں میں جھوٹی ہوں، دھوکے باز ہوں۔ آپ تو بڑے پارسا ہیں۔ فرشتے ہیں۔ آپ انتہائی بدتمیز انسان ہیں۔ آپ تو شریفوں میں بیٹھنے کے قابل نہیں۔'' وہ غصے میں آ کر اُسے بے نقط سنا رہی تھی۔

''چٹاخ!'' ایک تھپڑ اُس کے منہ پر پڑا۔ اُس نے حیرانی سے سمیر کو دیکھا۔ اُس کے تینوں بچے سہمے ہوئے اُن کی لڑائی دیکھ رہے تھے۔

''آپ نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔ آپ کی یہ جرأت۔'' وہ زخمی شیرنی کی طرح بپھر گئی۔

''ہاں میں نے تمہیں مارا ہے۔ اور مجھے حق ہے، میں تمہیں ماروں۔ تم حد سے بڑھ رہی ہو اور تمہیں حد میں رکھنے کے لیے میں تمہیں ماروں گا بھی اور سزا بھی دوں گا۔'' سمیر نے غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے اُس کے بالوں کو پکڑ کر جھٹکا دیا، تو وہ جیسے اپنے حواس ہی کھو بیٹھی۔ اُسے نہیں معلوم اُس نے سمیر کو کیا کیا کہا۔ سمیر نے اُسے کس طرح مارا پیٹا۔ سمیر اُسے مار پیٹ کر گھر سے نکل گیا اور وہ تینوں بچوں کو لے کر اپنے میکے آ گئی۔

☆......☆......☆

شادی کے بعد وہ پہلی مرتبہ اِس طرح بچوں کے ساتھ اکیلی آئی تھی۔ امی کا ماتھا ٹھنکا، اُس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ زبان پر چپ کی مہر لگا لی۔ لیکن چاچو کے انتقال کے بعد اُس نے باپ سے اپنے حصے کا مطالبہ کر دیا۔ سب ششدر رہ گئے، آج تک خاندان میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ کسی لڑکی نے اپنے حصے کا مطالبہ کیا ہو۔ سب مانتے ہیں کہ باپ کی جائیداد میں لڑکی کا حصہ ہوتا ہے، لیکن لڑکی کو اُس کا حصہ کون دیتا ہے۔ باپ مر جاتا ہے، بیٹے اپنے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ باپ

کے بنائے ہوئے گھروں میں رہتے ہیں۔ بیٹیاں اکثر کرائے کے مکانوں میں زندگی گزار دیتی ہیں۔ لیکن بھائیوں کے پاس کبھی اتنا نہیں ہوتا کہ وہ بہنوں کا حصہ ادا کریں۔ یہی اِس خاندان کا بھی دستور تھا۔ اُس کے باپ کا چار سو گز کا دو منزلہ گھر تھا۔ اس میں اُس کا حصہ کم از کم تیس لاکھ بنتا تھا۔ اِس دوران سمیر نے اُس سے ملنے کی بہت کوشش کی۔ فون پر معافیاں مانگیں اور جب وہ نہ مانی، اُسے دھمکیاں دیں۔

اُدھر گھر میں بھی تناؤ کی کیفیت تھی۔ امی اُسے سمجھا رہی تھیں۔ بھابیاں حقیقتِ حال جاننے کے بعد ڈھکے چھپے لفظوں میں اُسے ہی قصور وار ٹھہرا رہی تھیں۔ بھائیوں کے منہ بنے ہوئے تھے، صرف اُس کے ماں باپ تھے، جنہوں نے اُسی کی طرح چپ سادھ لی تھی۔ وہ اُس کے مطالبے کو حق بجانب سمجھ رہے تھے۔ اِسی کشمکش میں پورا سال گزر گیا۔ وہ خاموشی سے اپنے کاموں میں مصروف رہتی۔ گھر میں کسی سے زیادہ بات نہیں کرتی۔ خاندان میں کہیں ملنے نہیں جاتی۔ لوگ زبان سے کم ہی کہتے تھے لیکن اُن کی نظریں بہت کچھ کہہ جاتی تھیں۔ بالآخر اُس کے باپ نے اُس کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور اپنا ایک پلاٹ بیچ کر اُسے تیس لاکھ روپے دے دیے۔ اُس نے اُن پیسوں سے ایک بہت اچھے علاقے میں چھوٹا سا فلیٹ خرید لیا اور وہاں شفٹ ہوگئی۔

نئی جگہ، نیا فلیٹ، بچے اپنے گھر میں آ کر بہت خوش تھے۔ وہ بھی خاصی مطمئن تھی۔ اُس نے بھی اپنی تعلیم مکمل کی اور بچوں کے اسکول میں جاب کر لی۔

☆......☆......☆

زندگی سکون کے ساتھ رواں دواں تھی۔ سمیر

بچوں کا خرچہ باقاعدگی سے اُن کے اکاؤنٹ میں جمع کراتا تھا۔ اُس نے دوسری شادی کر لی تھی۔ اُس کی دو بچیاں تھیں۔ بظاہر وہ بڑی مطمئن اور پُرسکون زندگی گزار رہی تھی۔ لیکن اکثر لوگوں کی نظریں، اُن کے چبھتے ہوئے سوالات اور سمیر سے مل کر آنے کے بعد بچوں کی اُداسی اُس کی زندگی میں ایسا تلاطم پیدا کر دیتی کہ اکثر وہ ساری ساری رات جاگ کر گزار دیتی۔ وہ سب کچھ برداشت کر رہی تھی۔ لیکن بڑھتے ہوئے بچوں کے جتاتے ہوئے رویے اس کے اندر بہت کچھ کھونے کا احساس پیدا کر رہے تھے۔

☆......☆......☆

''مما میں نے فادرز ڈے پر کارڈ بنایا تھا۔ میم نے سب سے زیادہ میرے کارڈ کی تعریف کی ہے۔ مجھے فرسٹ پرائز ملا۔'' وہ بچوں کے انتظار میں اسکول کے باہر گاڑی میں بیٹھی تھی تو اُس کا سب سے چھوٹا بیٹا کمیل دوڑتا ہوا آیا۔ خوشی سے اُس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اُس نے کمیل کے ہاتھ سے کارڈ لیا۔ کارڈ پر کمیل نے ایک مسکراتے ہوئے شخص کا خاکہ بنایا تھا، جو ایک بچے کو گود میں لیے ہوئے تھا اور دو بچے اس کے پاس کھڑے تھے۔ چاروں طرف اُڑتے ہوئے غباروں کا خاکہ تھا۔ نیچے لکھا تھا۔

My Papa Is The Best.
I Miss Him

اُس نے کارڈ کو دیکھا، پڑھا اور خاموشی سے ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔

''مما آپ کو اچھا نہیں لگا۔'' وہ اُسے خاموش دیکھ کر شرمندہ ہو گیا۔

''عمیر اور زمیر کہاں ہیں؟'' اس نے بات ٹال دی۔

''مما کل اُن کا میچ ہے۔ وہ اپنے فرینڈز کے ساتھ کل کا پروگرام فائنل کر رہے ہیں۔'' کمیل 6th گریڈ میں تھا اور اپنی عمر سے کہیں زیادہ سمجھدار تھا۔

''مما آئی ایم سوری! آئندہ سے میں ایسا نہیں کروں گا، جس سے آپ کو تکلیف ہو۔'' اُسے احساس ہو گیا تھا کہ اُس نے غلط کیا ہے۔

''بیٹا مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ مجھے خوشی ہے آپ اپنے پاپا سے اتنی محبت کرتے ہیں۔'' اُس نے اُسے پیار کیا۔

''مما اگر ہم سب پاپا کے ساتھ رہتے تو کتنا اچھا ہوتا۔'' وہ اُداسی سے یہ جملہ کہہ کر گاڑی کے باہر دیکھنے لگا، جہاں بچے اپنے باپوں کے ساتھ جا رہے تھے۔

''میں جانتی ہوں آپ اپنے پاپا کو بہت مس کرتے ہیں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی یہ جملہ اُس کی زبان پر آ گیا۔ وہ بچوں کے سامنے سمیر کا ذکر کم ہی کرتی تھی۔

''نہیں مما! آپ بہت سوئیٹ ہیں۔ آئی لو یُو۔'' اُس نے ماں کی اُداسی کو محسوس کرتے ہوئے اُس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اُسے کِس کیا۔

'کاش ایسا ہوتا، ہم سب مل کر رہتے۔ میرے سر پر بھی سائبان ہوتا۔ ہم مل کر اپنے بچوں کی خوشیوں کو انجوائے کرتے۔ میں بھی راتوں کو بے خوف ہو کر سوتی۔ ہر کھٹکے پر میری نیند نہ ٹوٹتی۔ شوہر کا ساتھ نہ ہو تو عورت کی زندگی لق ودق جلتے ہوئے صحرا کی مانند ہوتی ہے، جہاں محبت کا کوئی پودا نہیں اُگتا۔ جہاں تپتی ہوئی زمین پر اَبر کا سایہ نہیں ہوتا۔ جہاں کانٹے دار جھاڑیاں ہوتی ہیں۔ زہریلے سانپ ہوتے ہیں۔ بھولے بھٹکے مسافر ہوتے ہیں۔'

عمیر اور زہیر کے آنے کے بعد وہ دل پر منوں بوجھ لیے گاڑی چلاتے ہوئے نہ جانے کیا کیا سوچ رہی تھی۔

☆......☆......☆

عمیر کا اپنڈکس کا آپریشن ہوا تھا۔ سمیر کو معلوم ہوا، وہ اُسے دیکھنے اسپتال آیا اور بے شمار تحفے اور تحائف بھی لایا۔ سمیر کو دیکھ کر عمیر کے چہرے پر جو خوشی اور چمک پیدا ہوئی۔ اُس نے ایک لمحے کے لیے اُداس کر دیا۔

'کیا میں سب کچھ دے کر بھی اِن بچوں کو کچھ نہ دے سکی۔' یہ سوچ تیر کی طرح اُس کے دل میں پیوست ہوگئی۔

''ہیلو فرینڈ! تم بستر پر لیٹے بالکل اچھے نہیں لگ رہے۔ خوب کھاؤ پیو تاکہ جلدی سے میچ میں حصہ لو۔'' سمیر نے آتے ہی عمیر کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''پاپا نیکسٹ ویک میرا میچ ہے۔ میں انشاء اللہ وہ میچ ضرور کھیلوں گا۔'' عمیر جو باپ کے آنے سے پہلے بہت اُداس ہو رہا تھا۔ ایک دم پرجوش ہوگیا۔

''Why Not...... ضرور...... ضرور میں خود تمہارا میچ دیکھنے آؤں گا۔'' سمیر نے مزید اُس کا حوصلہ بڑھایا۔

''سچ پاپا...... پھر آپ دیکھیے گا۔ وہ میچ ہم ضرور جیتیں گے۔'' خوشی سے عمیر کا چہرہ دمکنے لگا۔

سمیر جتنی دیر وہاں بیٹھا رہا۔ عمیر خوشی سے چہکتا رہا۔ لیکن سمیر کے جانے کے بعد اُس پر ایک دم اُداسی چھا گئی۔ ویسی ہی اُداسی جیسی ہمیشہ باپ سے مل کر آنے کے بعد اُس پر طاری ہوتی تھی۔

''بیٹا جوس پی لو۔'' وہ اُسے بہلانے کے لیے جوس لے کر آ گئی۔

''مما پلیز ابھی میرا دل نہیں چاہ رہا۔'' وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے رکھے بولا۔

''تم رو رہے ہو۔'' وہ سمجھ گئی۔

''نہیں مما! مجھے نیند آ رہی ہے۔'' وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُسے یہ معلوم ہو کہ باپ کے جانے کے بعد وہ کتنا اُداس ہو رہا ہے۔

☆......☆......☆

عمیر الیکٹرانک انجینئر بن کر ایک پرائیویٹ فرم سے وابستہ ہوگیا تھا۔ زہیر نے بی بی اے کر لیا تھا۔ وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ جاب بھی کر رہا تھا۔ کمیل ایم بی بی ایس کے فائنل ایئر میں تھا۔

کمیل کے دوست کے باپ کو ہارٹ اٹیک ہوگیا تھا۔ کمیل بہت پریشان تھا۔ دن رات سائے کی طرح دوست کے ساتھ رہتا تھا۔ رات کے دو بج گئے تھے اور وہ ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ وہ پریشان جلے پاؤں کی بلی کی طرح سارے گھر میں ٹہل رہی تھی۔ جب تک تینوں بیٹے گھر میں نہیں آ جاتے تھے وہ سوتی نہیں تھی اور پھر مشکل یہ ہوئی کہ کمیل کا موبائل بھی آف ہوگیا تھا۔ اُس کی جان جیسے لبوں پر آ گئی تھی کہ کال بیل بجی۔ اُس نے دروازہ کھولا۔ سامنے تھکا ہارا کمیل کھڑا تھا۔

''تمہیں احساس ہے کہ میں کتنی پریشان ہوں۔'' وہ اُسے دیکھتے ہی اُس پر برس پڑی۔

''مما انکل کی حالت...... Stable نہیں ہے۔ وہ ابھی بھی آئی سی یُو میں ہیں۔'' وہ نڈھال سا ٹی وی لاؤنج میں بچھے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''تو اُن کے پاس اُن کا بیٹا موجود ہے۔ اُن کے گھر والے موجود ہیں۔ وہ اکیلے تو نہیں ہیں۔'' اُس کا غصہ ابھی تک کم نہیں ہوا تھا۔

''مما شمروز اپنے بابا سے بہت محبت کرتا ہے۔ وہ اُن کے لیے بہت پریشان ہے۔''

''ظاہر ہے وہ اُس کے باپ ہیں۔ وہ اُن کے لیے پریشان تو ہوگا ہی۔''

''مما! جب پاپا بیمار ہوتے ہوں گے تو وہ کتنے اکیلے ہوتے ہوں گے؟'' نہ جانے کیسے یہ جملہ اُس کے لبوں پر آ گیا۔

''وہ کیوں اکیلے ہوں گے۔ اُن کے پاس اُن کی بیوی ہے۔ اُن کی بچیاں ہیں۔''

''لیکن مما...... ہم تو نہیں ہوتے۔ ہم نے تو انہیں اکیلا چھوڑ دیا۔''

''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔'' اُس نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر براہِ راست سوال کیا۔

''میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ میں کچھ بھی کہوں گا تو اُس سے آپ کو دکھ ہوگا۔ اور میں آپ کو دکھ دینا نہیں چاہتا۔'' وہ یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور وہ وہیں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے زندگی کی ساری محنت اور مشقت بھر بھری ریت کی طرح اُس کے ہاتھوں سے پھسلتی جا رہی تھی۔

☆......☆☆......☆

وہ اور تینوں بچے ریسٹورنٹ میں ڈنر کر رہے تھے، جو زہیر نے ایم بی اے میں فرسٹ پوزیشن حاصل کرنے پر دیا تھا۔ ماحول بے حد خوشگوار تھا اور وہ لوگ بے حد خوش تھے۔

''مما بس اب آپ عمیر بھائی کی منگنی کر دیجیے۔'' زہیر نے شرارت سے زہیر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔ گھر کا فائنل ہو جائے تو سب سے پہلے یہی کام کروں گی۔''

''آپ لڑکی ڈھونڈیں، پھر ہم ڈھونڈ لیں گے۔'' زہیر نے چاولوں پر چاؤ من ڈالتے ہوئے کہا۔

''زیادہ اسمارٹ بننے کی ضرورت نہیں۔ ابھی مجھے شادی نہیں کرنی۔'' عمیر نے جھینپتے ہوئے زہیر کو آنکھیں دکھائیں۔

''شادی کرنے کو کس نے کہا ہے میں تو منگنی کی بات کر رہا ہوں۔'' زہیر نے شرارت سے آنکھیں گھمائیں۔

''واٹ اے نان سینس!'' قریبی ٹیبل سے کسی کے دھاڑنے کی آواز آئی تو وہ سب چونک کر اُس آواز کی طرف متوجہ ہوگئے۔ بے حد قیمتی سوٹ میں ملبوس اُس شخص کی پشت اُن لوگوں کی طرف تھی۔

''تم ذلیل...... (گالی)...... الو...... سور...... کی...... اولاد...... یہ کیا ہے...... (گالی)......''

''کیا ہوا!'' سب لوگ اُسی طرف متوجہ تھے۔ سب کی دبی دبی سرگوشیاں تجسس لیے ہوئے تھیں۔ وہ شخص اس قدر غلیظ گالیاں بک رہا تھا کہ پورے ریسٹورنٹ کا ماحول غلیظ ہوگیا تھا۔ ریسٹورنٹ کا منیجر اُس کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ ویٹر کا چہرہ احساسِ ذلت سے عرق آلود تھا۔

منیجر اُس سے معافی مانگ رہا تھا اور لوگوں کی نظروں میں اُس شخص کے لیے نفرت تھی، تمسخر تھا، ذلت تھی۔ اُس شخص کی بیوی اور بچیوں کے چہرے شرمندگی اور ندامت سے سرخ ہو رہے تھے۔ اُس نے تینوں بیٹوں کی طرف دیکھا۔ تینوں کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور اُن کی جھکی ہوئی نظروں نے آج برسوں بعد اُس کے جھکے ہوئے سر کو اٹھا دیا تھا، اِس لیے کہ سرِ عام لوگوں کے مجمع میں ویٹر اور منیجر کو گالیاں بکنے والا شخص کوئی اور نہیں اُن تینوں کا باپ سمیر تھا۔

☆☆......☆☆

افسانہ

محمد علی روشن

میٹھی نیند

آج پھر وہ آفس سے لیٹ اٹھا تھا۔ سڑکوں پر وہی رش، بسوں پر لوگ چھتوں تک لٹکے ہوئے تھے۔ نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے تارے سے چمک رہے تھے۔ اسے یقین تھا کہ آج بھی گھر میں......

حال کا بھیانک آئینہ، غیر محفوظ مستقبل کی روشن تصویر، افسانے کی صورت

اس نے جیسے ہی فلیٹ کے پہلے زینے پر قدم رکھا۔ چھت پر جلتا ہوا بلب بجھ گیا اور بچوں کا شور پورے فلیٹ میں گونجنے لگا۔

"لائٹ چلی گئی۔" اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔

"اے میرے خدا! پھر وہی اندھیرا۔"

وہ وہیں زینے پر بیٹھ گیا اور گردن اوپر کر کے اپنے فلیٹ کی طرف دیکھنے لگا جہاں سے بچوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ساجدہ بچوں کو چپ کروانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ تھکے تھکے قدموں کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔

"کیا حال ہے۔" اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"گرمی سے برا حال ہے۔" ساجدہ نے بلکتے ہوئے بچے کو چپکارتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا ہوا اس کو۔" علی نے بچے کو گود میں اٹھاتے ہوئے سوال کیا۔

"گرمی سے بلک رہا ہے اور کیا ہوگا۔" ساجدہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"تو تمہارا منہ کیوں بنا ہوا ہے۔" علی نے بچے کو واپس کرتے ہوئے کہا۔

"کب سے تم سے کہا ہوا ہے کہ یہ تو روز کا معمول بن گیا ہے، یو پی ایس ہی لگوا لو۔" ساجدہ نے گلہ کرتے ہوئے کہا۔ علی نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے ساجدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یو پی ایس میں پتا بھی ہے کہ کتنا خرچہ آ جاتا ہے اور پھر اس کی مینٹیننس بھی تو کرنی پڑتی ہے۔"

"سارے زمانے نے لگایا ہوا ہے، بس ایک ہم ہی ہیں۔" ساجدہ نے غصے سے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔

"بابا! بابا! آج پھر آپ میری کتابیں نہیں لائے۔" علی کی چھوٹی بچی ردا نے سوال کیا۔

"اوہ! اوہ بابا آج پھر بھول گئے۔ سوری کل نہیں بھولیں گے۔"

"بابا آپ روز ایسے ہی کہتے ہیں۔" ردا نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

"موم بتیاں ختم ہو رہی ہیں جا کے لے آؤ۔ جانے یہ لائٹ کب آئے گی۔" ساجدہ نے کچن سے آواز لگائی۔

"لا رہا ہوں۔" علی نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ اس کو لگ رہا تھا جیسے زندگی ایک تنگ گلی میں آ کے رک سی گئی ہو۔ صبح اٹھو تو بجلی نہیں، شام کو گھر آؤ تو بھی بجلی نہیں۔ بچوں کو الگ گرمی نے بے حال کیا ہوا ہے۔ بیوی الگ چڑچڑی ہو گئی ہے۔ آفس میں الگ نیند کے جھونکے آ رہے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے ویرانوں میں نکل جائیں۔ مگر یہ جو پیروں میں زنجیریں پڑی ہوئی ہیں ان کو کون توڑے گا...... چاہتے نہ چاہتے ہوئے بھی جینا تو پڑے گا ہی۔ اپنے لیے نہیں اپنے بچوں کے لیے۔

☆......☆......☆

شاید یہ آدھی رات کا وقت تھا جب شدید گرمی سے اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ شاید وہ مر گیا تھا۔ اس قدر گھپ اندھیرا تھا جیسے وہ قبر میں ہو۔

لیکن ایک زوردار چیخ سے اس کو احساس ہوا کہ وہ زندہ ہے۔ یہ چیخ اس کے بچے کی تھی۔

"کیا ہوا ساجدہ۔" وہ چیخا۔

"ہونا کیا ہے۔ لائٹ چلی گئی ہے۔ تُو تو چپ کر جا۔" ساجدہ نے بچے کو مارتے ہوئے کہا۔ بچہ مزید زور زور سے رونے لگا۔

"روشنی تو کرو۔"

"سامنے میز پر موم بتی رکھی ہے۔" اس نے روشنی کی تو سامنے اس کا بچہ بلک بلک کے رو رہا تھا۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ سر ایسا لگ رہا تھا جیسے کہ ابھی پھٹ جائے گا۔

''سامنے دیکھو مرزا صاحب کے گھر میں بجلی آ رہی ہے۔'' ساجدہ نے میاں کو جتایا۔ اس نے سر اُٹھا کے سامنے کے گھر کی طرف دیکھا۔ یو پی ایس چل رہا تھا۔

''بابا آپ بھی یو پی ایس لگوا لیں۔'' ردا نے گرمی سے روتے ہوئے کہا۔ اس وقت علی کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کو بیچ بازار میں ننگا کر دیا ہو۔ اس کے بچے گرمی سے بلک رہے تھے اور جس کے پاس پیسے ہوں وہ آرام سے بجلی خرید کے سو رہا ہو۔ کیا اس ملک میں کبھی غریب بھی سکون کی نیند سو سکے گا۔

☆......☆......☆

آج پھر وہ آفس سے لیٹ ہو گیا تھا۔ سڑکوں پر لوگوں کا ہجوم، جب بس میں زبردستی گھسا تو صرف ایک پیر رکھنے کی جگہ ملی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بس میں نہیں کسی جانوروں کے ڈربے میں سفر کر رہا ہو۔ جیسے ایک چھوٹے سے پنجرے میں بہت ساری مرغیاں ٹھونس دی گئی ہوں۔ اتنا حبس، اتنی گھٹن جی چاہ رہا تھا کہ بس سے کود کے خودکشی کر لے۔ پھر بیچ بیچ میں کنڈیکٹر ''ہاں بھئی کرایہ دے دیا'' جب وہ تیسری مرتبہ یہ پوچھنے آیا تو وہ تپ گیا۔

''اب کی بار پوچھنے آیا تو دانت توڑ دوں گا۔''

''واہ بڑا آیا دانت توڑنے والا۔ اتنی گرمی چڑھ رہی ہے تو جا کے اپنی گاڑی میں سفر کرو۔''

''بکواس کرتا ہے۔ ابھی بتاتا ہوں۔'' جھگڑا شروع ہونے ہی والا تھا کہ اس کا اسٹاپ آ گیا اور وہ منہ ہی منہ میں بکتا ہوا بس سے اُتر گیا۔

ابھی وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ باس کا انٹر کام آ گیا۔ وہ خالی خالی نظروں سے فون کو تکنے لگا۔

''علی ذرا میرے کمرے میں آیئے۔''

''جی سر۔''

''علی آپ آج پھر لیٹ ہیں۔''

''سر رات بھر لائٹ نہیں تھی۔''

''یہاں سب کے گھروں میں لائٹ نہیں ہوتی لیکن سب ٹائم پر ہی آتے ہیں۔''

''جی سر۔'' علی نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''یہ حلیہ دیکھا ہے آپ نے اپنا! یہ آفس ہے، پرچون کی دکان نہیں۔ مسلی ہوئی شرٹ، جوتے بغیر پالش کے۔ یہ آج کی بات نہیں علی، آپ کے ساتھ روز یہ مسئلہ ہے۔''

''سر کل سے آپ کو شکایت نہیں ملے گی۔''

''ہوں! ورنہ علی سوری، میں آپ کو مزید اور ٹائم نہیں دے سکتا۔''

''اوکے سر۔''

☆......☆......☆

آج پھر وہ آفس سے لیٹ اٹھا تھا۔ سڑکوں پر وہی رش، بسوں پر لوگ چھتوں تک لٹکے ہوئے تھے۔ نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے تارے سے چمک رہے تھے۔ اسے یقین تھا کہ آج بھی گھر میں بجلی نہیں ہوگی۔ کتنے دن ہو گئے تھے پوری نیند لیے ہوئے۔

شاید وہ کبھی سویا ہی نہیں تھا۔

بڑی مشکل سے بس میں بیٹھنے کی جگہ ملی تھی اور بیٹھتے ہی وہ سو گیا تھا۔ جاگا تب، جب کنڈیکٹر کرایہ لینے آیا۔

''باؤ جی کرایہ۔''

''ہوں۔'' اس کی آنکھیں لال سرخ ہو رہی تھیں۔

جب وہ بس سے اُترا تو دور سے ہی اس کا فلیٹ تاریکی میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ آج پھر جگراتا، پھر وہی

ساجدہ کی چڑچڑاہٹ۔

''بیچاری وہ بھی کیا کرے۔ سارا دن گرمی میں بچوں کے ساتھ لگی رہتی ہے۔ رات میں بھی سکون نہیں ملتا۔'' اسے آج اپنا آپ بہت چھوٹا لگنے لگا۔ وہ اس قابل بھی نہیں تھا کہ اپنے بیوی بچوں کے لیے کچھ کر سکے۔ کم از کم ایک رات کی نیند تو سکون سے سو سکے۔ اس کا دل بھر آیا۔

''ہاں علی میاں آ گئے۔'' راستے میں مرزا صاحب مل گئے۔

''جی۔''

''کیا بات ہے میاں! بڑے تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔''

''بس جی! آپ کو تو پتا ہی ہے کہ رات بھر بجلی کی آنکھ مچولی سے نیند کہاں پوری ہوتی ہے۔ دس بار بجلی آتی جاتی ہے۔''

''لو میاں یو پی ایس لگوالو۔ ہر گھر میں لگا ہوا ہے۔ اب تو قسطوں پر بھی مل جاتا ہے۔'' مرزا صاحب نے مشورہ دیا۔

''مرزا صاحب آج کل اس مہنگائی کے دور میں دال دلیہ چل جائے تو بڑی بات ہے۔'' علی نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''بات تو میاں سولہ آنے درست ہے۔ پر آج کل ان چیزوں کے بغیر بھی تو زندگی نامکمل ہے۔''

''بس جی جب پیسے آئے تو یو پی ایس بھی لگوالیں گے۔'' علی نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

''بالکل بالکل......''

☆......☆......☆

''آ گئے آپ۔ چائے لاؤں۔'' ساجدہ نے علی کو گھر میں داخل ہوتے دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔ میں سونا چاہتا ہوں۔'' ساجدہ علی کی بات سن کر زور زور سے ہنسنے لگی اور اتنا ہنسی کہ آنکھوں سے کاجل بہنے لگا۔

علی تھوڑی دیر تک تو ساجدہ کو حیرت سے دیکھتا رہا۔ پھر وہ بھی زور زور سے ہنسنے لگا۔

☆......☆......☆

ہم اقتدار میں آتے ہی لوڈ شیڈنگ ختم کر دیں گے۔ اندھیروں کو اُجالوں میں بدل دیں گے۔ ملک کو ترقی کی طرف گامزن کر دیں گے۔ ملک میں کوئی غریب نہیں رہے گا۔''

ٹی وی پر کوئی ٹاک شو چل رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ جب سے اس نے ہوش سنبھالا ہے یہی سب کچھ سن رہا تھا۔ جانے وہ کون سا وقت آئے گا جب ہر طرف اُجالا ہی اُجالا ہوگا۔

جانے کب...... جانے کب...... اس نے آگے بڑھ کر ٹی وی بند کر دیا۔

☆......☆......☆

آج کل ہر انسان نفسا نفسی کا شکار ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ دوسروں کو کچل کر خود آگے نکل جائے۔ زندگی ایک مشین بن کر رہ گئی ہے۔ جس طرح مشین کے کوئی جذبات نہیں ہوتے، اسی طرح آج کل کا انسان ہو گیا ہے۔ جذبات سے عاری، قدرت سے دور، بس خواہشات کے جنگل میں مارا مارا پھرتا رہتا ہے اور پھر ایک دن ان ہی خواہشات کے جنگل میں دفن ہو جاتا ہے۔ انسان نے آج کل دوسروں سے کیا اپنے آپ سے محبت کرنی چھوڑ دی ہے۔ جب تک وہ اپنے آپ کو نہیں پہچانے گا، وہ قدرت کو نہیں پہچانے گا۔ محبت کے ذریعے ہی انسان پر زندگی کے راز آشکار ہوتے ہیں۔ زندگی لینے کا ہی نہیں دینے کا بھی نام ہے۔ محبت ہی میں انسان اپنی اصل شکل پہچانتا ہے۔ زندگی میں ایک موڑ ایسا بھی آتا ہے جب اس کی آرزوئیں ہی اس کا حاصل ہو جاتی ہیں۔ بس وہ وہیں مر جاتا ہے، نہ ہی اس کا جنازہ اٹھتا ہے۔ نہ

ہی اس کی لاش پر کوئی بین کرتا ہے۔ بس وہ خود ہی اپنی خواہشات کی لاش اٹھائے اٹھائے پھرتا ہے۔

آج کے انسان کے پاس وقت ہی نہیں کہ وہ نکلنے اور ڈوبنے والے سورج کے منظر کو دیکھ سکے۔ وہ چاندنی راتوں کے حسن سے ناآشنا ہو کے رہ گیا ہے۔ وہ مشینوں میں سکون ڈھونڈتا ہے۔ وہ انسانوں سے بات کرنے کے بجائے موبائل پر ایس ایم ایس کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ ہماری زندگی کا مقصد صرف مشینوں کا حاصل کرنا رہ گیا ہے۔ زندگی میں صرف مشین ہی نہیں انسانی چہرے بھی ہیں۔ جذبات بھی ہیں۔ زندگی مادہ ہی نہیں روح بھی ہے۔ زندگی صرف میں ہی نہیں تُو بھی ہے۔

علی کی زندگی بھی ایک مشین بن کے رہ گئی تھی۔ وہی صبح، وہی بے رونق شامیں، بجلی کی کمی نے اس کی زندگی کو مزید مشکل بنا دیا تھا۔ یہ بجلی بھی آج کل ہمارے لیے زندگی سے زیادہ ضروری ہو گئی ہے۔ گھر میں کھانے کے لیے ہو نہ ہو یو پی ایس ضرور ہونا چاہیے۔

آج کل پھر وہی لوڈشیڈنگ کا عذاب شروع ہو گیا تھا۔ پرسوں پورا دن لائٹ نہیں تھی۔ اس دن تو مرزا جی کا بھی یو پی ایس بول گیا تھا۔ سارے فلیٹ میں مارے مارے پھر رہے تھے کہ بجلی کب آئے گی۔

''علی خدا کے لیے تھوڑا سا زہر لا دو۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔'' ساجدہ نے روتے ہوئے کہا۔

''زہر۔'' علی زیرِ لب بڑبڑایا۔

''ہاں! ہاں زہر...... زہر!'' ساجدہ نے بال نوچتے ہوئے کہا۔

''تم کو پتا ہے علی میں کئی راتوں سے نہیں سوئی۔ شاید کبھی میں سوئی ہی نہیں۔ خدا کے لیے مجھے سلا دو۔''

''ہاں اب ہم سب کو سونا چاہیے۔''

☆......☆......☆

علی نیم پاگل سا ہو گیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا اس کے پاس پسٹل ہو اور وہ سب کو بھون کے رکھ دے۔ وہ بڑی دیر تک سڑکوں پر گھومتا رہا۔ پھر وہ ایک میڈیکل اسٹور پر رُک گیا۔ یہ اس کے دوست کا تھا۔

''اتنی گولیاں...... کیا کرے گا؟''

''سونا چاہتا ہوں۔''

گھر پہنچ کر اس نے ساجدہ کو آواز لگائی۔

''ساجدہ ساجدہ۔ جلدی سے اِدھر آؤ۔''

''کیا ہوا جی! کیوں چلا رہے ہو۔''

''دیکھو میں آج سب کے لیے ٹھنڈا جوس لایا ہوں۔''

''ٹھنڈا جوس......'' ساجدہ نے حیرت سے کہا۔

''ہاں ٹھنڈا جوس......'' علی کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔

''ردا کو بھی بلوالو، سب مل کے پئیں گے۔''

ساجدہ نے گلاسوں میں جوس نکال لیا۔

''بابا بڑے مزے کا جوس ہے۔'' ردا نے جوس پیتے ہوئے کہا۔

''ہاں بہت مزے کا ہے۔ بہت مزے کا اتنے مزے کا کہ پی کے سب سو جائیں گے۔''

''بابا...... بابا...... مجھے چکر آ رہے ہیں۔''

''علی...... مجھے بھی سب دھندلا نظر آ رہا ہے۔''

''بڑی...... اچھی...... نیند آ رہی ہے۔''

''آج...... تو لائٹ بھی نہیں جا...... آج سب مزے کی نیند سوئیں گے۔''

''ساجدہ......''

''ردا......''

''ہوں سب سو گئے۔''

''اب میں بھی سونا چاہتا ہوں۔''

جوس کا گلاس علی کے ہاتھ سے پھسلتا ہوا قالین پر لڑھکتا چلا گیا۔

☆☆......☆☆

مکمل ناول

غزالہ جلیل راؤ

موسم دل کی بستی کا

وہ مکمل طور پر احسن کے ٹرانس میں تھی۔ اسے نہیں معلوم کہ اس نے مجسٹریٹ کے سوالوں کے کیا جواب دیے اور کہاں دستخط کروائے۔ ہوش تو اس وقت آیا جب مجسٹریٹ نے احسن کو مبارکباد دی اور اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے......

اپنے انجام سے بے خبر، بے سمت سفر کرنے والوں کے لیے، ایک خاص ناول

اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اسے اپنی لچھے دار باتوں میں اس طرح اُلجھالے گا کہ وہ بے بس ہو کر اس کی ہر بات پر سر جھکا دے گی۔ وہ پلاننگ کرتا رہا اور خاموشی سے سنتی رہی۔ اس میں ایسی کوئی خاص بات ضرور تھی۔ جس نے اسے ٹرانس میں لے لیا تھا۔

یہ کافی دن پہلے کی بات ہے جب اس نے فون پر کہا تھا۔

"عاشی میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔ کل تم بس اسٹاپ پر آجانا، میں تمہیں پک کرلوں گا۔" وہ ساکت وجامد کھڑی رہ گئی تھی۔

"مگر ہنی، میں امی سے کیا کہوں گی؟" دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔

"کوئی بھی بہانہ کر دینا۔ بہت دیر نہیں لگے گی، اوکے۔" وہ فون بند کر کے ریسیور کو تکنے لگی اور سوچنے لگی کل کیا ہوگا۔ اگر امی ابو کو معلوم ہو گیا تو طوفان برپا ہو جائے گا۔ وہ تو اس کا نام بھی سننا گوارا نہیں کرتے۔ خوامخواہ پہرے لگا دیے جائیں گے۔ اگر وہ نہ گئی تو وہ خود ہی چلا آئے گا اور یہ اچھا نہیں ہوگا۔

رات دیر سے سوئی تھی مگر پھر بھی آنکھ جلدی کھل گئی۔ فریش ہو کر ڈائننگ ہال میں پہنچی۔ سب لوگ ناشتا کرنے میں مصروف تھے۔ اس نے دو چار لقمے توس کے لیے اور کالج کے لیے تیار ہونے لگی۔ بہت آہستہ آہستہ تیاری کرنے لگی، تاکہ ابو اور بھائی اپنے آفس کے لیے نکل جائیں۔ اگر جلدی تیار ہو جاتی تو اسے خدشہ تھا کوئی اسے ڈراپ کرنے کے لیے نہ کہہ دے۔

وہ خوامخواہ خود کو مصروف کیے ہوئے تھی، لیکن دھیان قدموں کی چاپ پر لگا تھا، پھر اسے قدموں کی چاپ گیٹ کی طرف جاتی محسوس ہوئی اور اس نے گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز پر ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ان کے جانے کے بعد وہ کمرے سے نکلی تو امی حسب عادت غصہ کرنے لگیں۔

"اگر وقت پر تیار ہو جاتیں تو وہ تمہیں ڈراپ کرتے چلے جاتے، لیکن تمہیں عادت ہے دھکے کھانے کی، تو شوق پورا کروا اپنا۔"

"امی یہ بات نہیں، آج میرا پہلا پیریڈ فری تھا۔ اس لیے جلدی نہیں تھی۔ آپ یوں ہی غصہ کررہی ہیں۔" اس نے فائل اور بیگ اٹھایا اور خدا حافظ کہتی گیٹ سے نکل گئی۔

☆......☆

جب وہ بس اسٹاپ پر پہنچی تو ہنی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا اور فرنٹ ڈور کھول دیا۔ وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ دوسری طرف آ کر اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

"آپ نے تو کالج گیٹ کے باہر کھڑے ہونے کا کہا تھا، پھر یہاں۔"

"وہاں بہت انتظار کرنا پڑتا۔ اس لیے سیدھا ادھر ہی آ گیا تاکہ دیر نہ ہو۔"

"بلایا کیوں ہے؟" اس نے استفہامیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"معلوم ہو جائے گا سب، چلو تو۔" اس نے مختصراً کہا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلا سکون عائشہ کے اندر بے سکونی پیدا کر رہا تھا۔ گاڑی برق رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔

ایک دم زوردار بریک کے ساتھ ٹائر چرچرائے تھے تو اس نے چونک کر سامنے دیکھا تھا۔ کورٹ کی عمارت نظر آتے ہی اس کو ٹھنڈے پسینے آ گئے۔ ہاتھ پاؤں کپکپانے لگے۔ وہ فوراً دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ ہنی نے آ کر اس کا ہاتھ تھام کر ہلکا سا دبا کر اسے تسلی دی۔ وہ اس کی کیفیت کو سمجھ گیا تھا۔

"ہنی آپ مجھے یہاں کیوں لے کر آئے ہیں؟"

"پریشان نہ ہو عاشی۔ یہ بہت ضروری ہو گیا تھا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔" اس کی حیرت سے پھٹی آنکھیں ہنی کے چہرے پر جمی تھیں۔ وہ نروس ہو رہی تھی، ہتھیلیاں پانیوں سے بھر گئی تھیں۔

اس نے بڑے دل سوز لہجے میں کہا۔

"شیر دل خان کی غرور سے تنی گردن کو خم دینے کے لیے یہ ضروری تھا۔"

اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئی تھیں، مگر بہت حوصلہ و ہمت اور ضبط کے ساتھ اس کے قدم سے قدم ملا کر چل رہی تھی۔ جیسے کوئی پرندہ پر کاٹ دیے جانے کے بعد سمجھوتا کر لیتا ہے کہ اب پرواز کرنا بیکار ہے، پھر کوشش کا کوئی فائدہ نہیں۔

وہ مکمل طور پر احسن کے ٹرانس میں تھی۔ اسے نہیں معلوم کہ اس نے مجسٹریٹ کے سوالوں کے کیا جواب دیے اور کہاں دستخط کروائے۔ ہوش تو اس وقت آیا جب مجسٹریٹ نے احسن کو مبارکباد دی اور اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔

"عاشی چلو آؤ۔" اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

اس کے ہونٹ سفید پڑ رہے تھے اور پاؤں زمین سے چپک گئے تھے، لیکن وہ اس کے ساتھ کھنچتی ہوئی جا رہی تھی۔ ہنی نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور وہ گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ اتنی دیر کے رکے ہوئے آنسوؤں نے سیلابی صورت اختیار کر لی تھی اور وہ ہاتھوں کے پیالے میں منہ چھپا کر سسک اٹھی تھی۔

احسن نے پریشان ہو کر گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔

"پاگل تو نہیں ہو گئی ہو عاشی۔ چپ کر جاؤ۔ لوگ عجیب نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں ہمیں۔" اس نے سرگوشی کے انداز میں اسے ڈانٹا تو وہ ایک دم سے چپ ہو گئی۔

"یہ اچھا نہیں کیا آپ نے، بالکل بھی اچھا نہیں کیا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میری پوزیشن خراب کر دی۔ بیٹی والدین، بھائیوں، خاندان کی عزت کی رکھوالی ہوتی ہے، لیکن میرے اس قدم کے بعد لوگ بیٹیوں پر اعتماد کرنا چھوڑ دیں گے۔" اس کے آنسو

آبشار کی طرح بہنے لگے۔

''اور آمنہ بھی تو اسی خاندان کی بیٹی تھی۔ اس پر ڈھائے گئے مظالم اور ناانصافیوں کی انتہا ہوگئی تھی۔ کیا تم یہ سب اتنی جلدی بھول گئی ہو اور میرے ساتھ تمہارے باعزت، باوقار خاندان نے جو رویہ اختیار کیا، جو سلوک کیا۔ اس کے متعلق تم یا تمہارا ضمیر کیا کہتا ہے۔ بولو کیا تم نے مجھے مٹی کا مادھو سمجھ لیا تھا جو بول سکتا ہے، نہ سن سکتا ہے اور نہ دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی کچھ سوچ سمجھ سکتا ہے۔ میری عزتِ نفس کو کوئی مجروح کرے میں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اس لیے کہ اب تم میری منکوحہ ہو لیکن میں تمہارے بے داغ دامن پر کوئی داغ نہیں لگانا چاہتا تھا۔ یہ میری محبت اور شرافت کا تقاضا ہے۔'' ہنی نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اور اب کیا داغ نہیں لگا اور یہ نکاح نامہ...... یہ نکاح نامہ کیا اس بات کی دلیل نہیں کہ میں بحیثیت بیوی آپ کے ساتھ...... اپنے ماں باپ کی عزت رول کر، ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر...... کیا میں اپنی جگہ غلط ہوں کہ آپ میری منہ بولی بہن کی موت کا قصوروار مجھے ٹھہرا رہے ہیں۔ اس کا بدلہ مجھ سے لے رہے ہیں۔ کیا یہ سب ٹھیک کر رہے ہیں آپ؟'' عاشی نے سسکتے ہوئے کہا۔

''ایسی بات نہیں ہے عاشی۔ اس معصوم کے ساتھ جو بھی ہوا اس کا فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیا۔ اس کا بدلہ اللہ لے گا۔ میں کون ہوتا ہوں بدلہ لینے والا، مگر میں اپنا حساب خود لیتا ہوں۔ کسی کی طرف نہیں رکھتا۔ شیر دل خان نے جس طرح مجھے اپنی فیکٹری سے بے عزت کر کے نکالا اور پھر گھر پر پہرے بٹھائے، آخر اس کا ردعمل کچھ تو ہونا چاہیے تھا۔ میں نے تمہیں صرف اس لیے یہ سزا دی ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، تمہیں چاہتا ہوں، تم سے شادی کرنا چاہتا تھا اور اسی لیے تمہارا ہاتھ مانگا تھا کہ تم بھی مجھے چاہتی ہو اور یہ بات سب جانتے ہیں، مگر اس کے باوجود مجھے ذلیل کیا گیا۔

میں نے اسی لیے تم سے نکاح کیا ہے۔ اب تم میری امانت ہو اور میں کسی وقت بھی تمہیں لینے کے لیے آسکتا ہوں، مگر اتنا ضرور خیال رکھوں گا کہ بارات کے ساتھ آؤں، کیونکہ میں اس گھر کی عزت و وقار کو اپنی عزت سے کم نہیں سمجھتا اور اس سب کے بعد باقی ذمے داری تم پر ہے کہ کس طرح میرا دفاع کرتی ہو یا مجھے ذلیل و رسوا کرواؤ گی۔''

گھر سے کچھ فاصلے پر اس نے گاڑی روک دی تھی۔ وہ جلدی سے دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔

''اللہ حافظ۔'' ہنی نے پُرجوش لہجے میں کہا اور تیزی سے موڑ لیا اور اسی رفتار سے گاڑی بھگا لے گیا۔ وہ اڑتی ہوئی دھول کو دیکھتی رہی اور پھر گھر آگئی۔

اس نے دل میں شکر ادا کیا کہ وقت پر گھر پہنچ گئی تھی۔ اگر ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو سوالوں کی بوچھاڑ ہو جاتی اس پر۔ وہ سب سے نظریں چراتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی اور دروازہ لاک کر کے بستر پر گر گئی، پھر خود پر ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ بلک پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

یہ سب کیا ہو گیا، وہ اتنی کمزور اور بزدل تو نہیں تھی کہ اس کی باتوں میں آگئی۔ بے شک اسے اپنا مان چکی تھی، مگر اس پر ہنی کا کوئی حق اور اختیار تو نہیں تھا کہ وہ اس کی ہر بات مانتی چلی گئی۔ ذرا سی بے وقوفی اور خاموشی نے اُسے لمحہ بھر میں میرا نصیب اور میرے جملہ حقوق کا مالک بنا دیا۔ اور وہ بے بس سی ہو کر اسے دیکھتی رہی۔ کچھ بھی تو نہ بول سکی۔ اب میں کسی کو کیا کہوں گی، کس کس بات کی وضاحت دوں گی۔ کسی کے نام کا ٹھپا لگ گیا ہے۔ کوئی اس کے نام کے ساتھ اس کا مالک بن بیٹھا ہے۔ وہ پرائی

ہو چکی ہے۔ لوگوں کی نظروں میں کیا عزت رہ جائے گی اور یقین کی وہ کون سی منزل ہوگی کہ اونچے شملے والے جو ہمیشہ دوسروں کی نفی اور اپنی من مانی کرتے آئے ہیں، کس طرح برداشت کرسکیں گے۔ عاشی من ہی من میں یہ ساری باتیں کرتی رہی اور وہ دیر تک تڑپ تڑپ کر روتی رہی، پھر دروازے پر دستک کے ساتھ، عارفہ کی آواز آئی۔

''آپی! کیا سوگئیں؟'' اس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

''آپی کھانا لگ گیا ہے اور سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ارے آپ نے تو ابھی کپڑے بھی نہیں بدلے۔ کیا بات ہے آپی خیریت تو ہے، طبیعت ٹھیک ہے؟'' وہ اس کی روئی روئی آنکھیں دیکھ کر پریشان ہوگئی۔

''کوئی بات نہیں ہے۔ سر میں شدید درد ہے۔ میں کھانا نہیں کھاؤں گی، ہوسکے تو ایک کپ چائے کا اور ایک پیناڈول دے جاؤ۔''

وہ چپ چاپ وہاں سے چلی گئی اور کچھ دیر بعد چائے کا کپ اور ٹیبلٹ لے کر آگئی۔

''آپی پہلے گولی کھائیے پھر چائے پی کر آنکھیں بند کر کے لیٹ جائیے۔'' اس نے گولی اور کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''شکریہ عارفہ۔'' اس نے گولی منہ میں رکھتے ہوئے کپ ہونٹوں سے لگالیا اور وہ مطمئن ہو کر چلی گئی۔ عارفہ کے جانے کے بعد اس نے پھر سے دروازہ لاک کرلیا اور بیگ میں سے نکاح نامہ نکال کر ایک بار پھر سے دیکھنے لگی۔ کاغذ کے اس ٹکڑے پر اس کا اور اپنا نام دیکھ کر اس پر پھر سے وحشت طاری ہوگئی۔ اس کا جی چاہا کہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہوا میں بکھیر دے، لیکن وہ اتنی بھی نادان نہ تھی ایسا کرنے سے کیا بات بدل جائے گی۔ حقیقت سے آنکھیں تو نہیں چرائی جاسکتی تھیں۔ نکاح نامے کی ایک کاپی اس کے پاس بھی ہے۔ اسے ضائع کردینے سے کیا ہوگا۔ تب اس کے پاس کاغذ کا یہ ٹکڑا چیخ چیخ کر کہے گا کہ وہ اس کی منکوحہ ہے اور وہ کسی دن بھی دندناتا ہوا اسے لینے کے لیے آجائے گا۔ تب کوئی بھی تو نہ روک سکے گا اسے، پھر وہ کیا کرے گی۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ ہاں اگر یہ بندھن دونوں خاندانوں کی مرضی اور خوشی سے بندھتا تو اور بات تھی۔ اب تو یہ کڑوا گھونٹ اس کو پینا ہی تھا۔ اس قیامت کا سامنا تو کرنا ہی پڑے گا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

کس سے کہے کہ خدا کے لیے اس آنے والے طوفان کو روک لو۔ ایک بار پھر وہ بلکنے لگی تھی۔ وہ گھٹنوں میں منہ چھپائے تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ وہ جتنا بھی روتی، مگر اس قیامت کو وہ کیسے روک سکتی تھی۔ کبوتر کے ریت میں منہ چھپانے سے خطرہ تو نہیں ٹل سکتا تھا۔

☆......☆

''تمہیں کیا ہوا، ایک دم سے پیلی کیوں پڑگئی ہو؟'' نگہت بیگم نے چونک کر اسے دیکھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھرگئی تھیں۔

''کوئی بات نہیں ہے، تو تم اپنی رائے دو۔''

''آپ رائے مانگ رہی ہیں یا فیصلہ سنا رہی ہیں۔ مجھے آپ اور پاپا کا فیصلہ منظور نہیں۔'' اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''مگر کیوں؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''وقت آنے پر بتا دوں گی۔ ابھی کچھ بھی کہنا سننا فضول ہے۔'' وہ کھڑی ہوگئی تھی۔

''عائشہ......'' نگہت بیگم کو غصہ آگیا۔ انہوں نے دھاڑ کر اسے مخاطب کیا۔

”جی بولیے۔“ اس نے رُخ موڑے بغیر پوچھا۔

”بیٹھ کر بات کرو۔“ ان کے لہجے میں پہلے سے زیادہ سختی و تلخی تھی۔ وہ شکایت بھری نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

”تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے پاپا کتنے ظالم اور ضدی ہیں۔ تم احسن اور آمنہ والے واقعے کو بھول گئی ہو۔“

”مجھے سب یاد ہے۔ اگر وہ ضدی اور سخت گیر ہیں تو میں بھی ان کا خون ہوں۔ ان ہی کی بیٹی ہوں۔ بہتری اسی میں ہے کہ مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ سکون کے ساتھ اپنی تعلیم مکمل کرنے دی جائے، باقی سب باتیں امتحانات کے بعد ہوں گی۔“

وہ ایک دم اٹھی اور ان کو دیکھے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہ بڑی حیرت سے اس کے بگڑتے تیور دیکھ کر گنگ رہ گئی تھیں۔

وقت کا کام گزرنا ہوتا ہے اور وہ گزر جاتا ہے۔ دن ہفتوں اور مہینوں میں تبدیل ہو رہے تھے۔ عاشی کا دم سینے میں گھٹا جا رہا تھا۔ یہ سوچیں اسے پریشان کر رہی تھیں کہ امی کو کیسے بتائے گی کہ اس نے احسن سے کورٹ میرج کر لی ہے۔ اب کچھ نہ سوچا جائے، جو طوفان آنا ہے وہ آ جائے۔ اگر اسی طرح میری موت آنی ہے تو آ جائے، لیکن بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا، یہی سوچ کر اس کا برا حال تھا۔ آخر اسے عارفہ کا خیال آیا، شاید وہ یہ کام کر سکے، مگر وہ تو ابھی چھوٹی تھی۔ اسے اس معاملے سے الگ رکھا جائے تو بہتر ہے اور پھر اسے اپنی سہیلی زینب کا خیال آیا تو اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

☆......☆

دوسرے دن ہی وہ اس کے آفس پہنچ گئی۔ وہ اس کے سامنے بیٹھی بتا رہی تھی۔

”زینب تم میرے گھر کے سب ہی حالات سے واقف ہو۔ کوئی ایسی بات نہیں جو تم سے ڈھکی چھپی ہو، لیکن میں تمہیں جو بتانے آئی ہوں وہ خبر یہ ہے کہ میں نے احسن سے کورٹ میرج کر لی ہے۔“

”ہائیں......“ وہ ایکدم اچھل کر کھڑی ہو گئی جیسے اسے کرنٹ لگا ہو۔

”تم نے عاشی......“ زینب نے اس کی طرف اشارہ کر کے تصدیق چاہی۔

”ہاں...... ہاں میں نے احسن سے کورٹ میرج کر لی ہے۔“ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”رخصتی ہو گئی یا رہتی ہے؟“ زینب نے سوالیہ نظروں سے عاشی کو دیکھا۔

”سب بتاتی ہوں صبر کرو۔“ عاشی نے پانی کا گلاس اٹھا لیا۔

”ہوش میں آتی ہو یا سارا پانی تمہارے سر پر انڈیل دوں۔“

”اب ہوش کہاں۔ خیر تم بتاؤ۔“ زینب نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”تم نے ایکدم ہی ہوش اڑا دیے۔ یہ بتاؤ یہ حادثہ کب رونما ہوا؟“

”ہاں یہ حادثہ ہی ہے، کیونکہ یہ اچانک اور میری بے خبری میں رونما ہوا، لیکن اب پریشان ہوں کہ امی اور پاپا کے علم میں یہ بات کیسے لاؤں اور دوسری خبر یہ ہے کہ میری شادی بھی سیٹھ اظفر علی کے بیٹے افضل علی سے طے کر دی گئی ہے۔ آنے والے وقت سے بچاؤ کی صورت بتاؤ۔“ عاشی نے زینب سے کہا۔

زینب خاموشی سے عاشی کو دیکھنے لگی۔

”احسن کیا کہتا ہے؟“

”اس کی طرف سے کوئی وقت مقرر نہیں، لیکن وہ کہتا ہے کسی وقت بھی لینے کے لیے آ سکتا ہوں، لیکن تنہا نہیں بارات لے کر آؤں گا۔ میں بہت پریشان ہوں زینب، وہ پتا نہیں کس خوش فہمی میں مبتلا

ہے۔ سمجھتا ہے کہ پاپا بیٹی کی محبت اور اپنی عزت کی خاطر مان جائیں گے اور بارات کا استقبال پھول نچھاور کر کے کریں گے۔ اور اس کو داماد کی صورت میں گلے سے لگالیں گے، مگر میں جانتی ہوں کہ اس کی تواضع پھولوں سے نہیں گولیوں سے ہوگی اور ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں جائے گا۔ طوفان کا رُخ مجھے اپنی طرف بڑھتا نظر آرہا ہے۔ خدا کے لیے کچھ کرو، اسے روکو ورنہ میں خودکشی کرلوں گی۔'' عاشی کی آنکھوں سے آنسو لڑیوں کی صورت گر رہے تھے۔

زینب نے اسے اپنے ساتھ لپٹالیا۔

''دل مضبوط کرو۔ یہ طوفان آنسوؤں سے رکنے والا نہیں۔ تم یہ بتاؤ تمہاری مرضی شامل تھی اس میں...... میرا مطلب کورٹ میرج سے ہے۔ تم اس کا ساتھ چاہتی تھیں؟''

''ہاں...... مگر اس طرح نہیں۔ والدین کی رضا سے اس کی رفاقت چاہتی تھی۔''

''مگر پھر بھی انکل نے احسن کو ذلیل و رسوا کر کے اپنے آفس سے نکالا اور گھر کے دروازے اس پر بند کر دیے۔ تم یہ باتیں کیوں بھول گئی تھیں؟''

''سب یاد ہے مجھے، اسی لیے میری زبان پر قفل پڑ گئے تھے کہ مجھے اپنے گھر والوں کے ظلم اور زیادتیوں کا بہت دکھ تھا۔ ہنی اور آمنہ کے ساتھ واقعی ہی ظلم ہوا تھا۔ اس لیے احتجاج نہ کرسکی، لیکن اب خوفزدہ ہوں کہ اب یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔''

زینب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس اونٹ کو فی الحال کھڑا یا لیٹا ہی رہنے دو بٹھانے کی ضرورت نہیں۔ کچھ کرتے ہیں، میں سوچتی ہوں۔''

عاشی نے اسے گھورا۔ ''میری جان نکل رہی ہے اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔''

''مذاق نہیں میں سیریس ہوں۔ میں کل ہی نگہت آنٹی سے ملتی ہوں اور ان سے کہہ دوں گی کہ آپ عاشی کی رخصتی کی تیاریاں کریں احسن کے ساتھ، کیوں ٹھیک ہے نا؟''

''مگر کیسے کہو گی؟'' عاشی تذبذب میں تھی۔

''ارے اپنی زبان سے کہوں گی یا پھر تم بتادو، وہی کہہ دوں گی۔'' زینب اس کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر ہنس پڑی تھی۔

''تم ہنس رہی ہو، مجھے رونا آرہا ہے۔ دل چاہ رہا ہے کہ دھاڑیں مار مار کر روؤں۔ بیٹھے بٹھائے کس مصیبت میں پڑ گئی۔''

''آج کی مصیبت کل کی راحت، سکون ہے۔ اس لیے تمہارے والدین جو کچھ کر رہے ہیں وہ راستہ سیدھا موت کی طرف جاتا ہے۔ ہنی نے بروقت قدم اٹھا کر ان کے خواب ریزہ ریزہ کر دیے ہیں۔ یہ بہت غلط ہوا ہے ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا یا پھر تم ہی عقل کے ناخن لے لیتیں۔ بہرحال اب اس پر پچھتانے سے کوئی فائدہ نہیں، کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔''

''موت تو اب بھی ہمارے تعاقب میں ہے۔ معلوم نہیں کیا ہوگا۔''

''اللہ بہتر کرے گا، تم پریشان نہ ہو۔''

''مگر زینب تم یہ سب باتیں میری غیر موجودگی میں بتانا، مگر پاپا کو کیسے بتاؤ گی؟''

''نہ بھئی، تمہارے پاپا کی گولی نہیں کھانی مجھے۔ ابھی عمر ہی کیا ہے میری، تمہاری امی خود ہی بتادیں گی انہیں۔''

''ٹھیک ہے جو تم بہتر سمجھو۔'' وہ کھڑی ہوگئی۔

''ارے بیٹھو چائے آرہی ہے۔'' زینب نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''چائے پھر کبھی سہی، اس وقت کچھ کھانے پینے کو دل نہیں چاہ رہا۔ اللہ حافظ۔'' کہتے ہوئے تیزی سے زینب کے آفس سے باہر نکل آئی۔

☆......☆

شیر دل خان اور عبدالغفار خان دونوں بھائی

تھے۔ ان کے والد صاحب غازی خان ایک ٹیکسٹائل مل کے مالک تھے۔ ان کا اپنا آفس تھا، بس دو ہی بیٹے تھے۔ انتہائی مطلب پرست اور خود غرض انسان تھے۔ اپنے پیسے اور جائیداد کی یوں حفاظت کرتے تھے جیسے ماں اپنے بچوں کی حفاظت کرتی ہے، لیکن دونوں بیٹے اتنے ہی شاہ خرچ نکلے تھے، جبکہ چھوٹا بھائی عبدالغفار خان پھر بھی باپ سے ڈرتا تھا اور اپنی جائز ضرورتوں کے علاوہ ان سے کچھ نہ مانگتا تھا، مگر شیر دل خان شروع سے ہی سرکش اور اپنی جائز اور ناجائز ضرورتوں پر بے دریغ پیسا لٹاتا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ غازی خان پھر بھی اپنے بڑے بیٹے شیر دل خان سے بہت خوش اور اسے بہت چاہتے تھے۔ وہ جو کچھ چاہتا باپ سے لے لیتا تھا اور وہ خوشی سے اسے دے دیتے تھے، لیکن عبدالغفار کو ذرا بھی منہ نہ لگاتے تھے، کیونکہ وہ ماں کا لاڈلا تھا۔ اس کی سوسائٹی بھی کوئی غلط نہ تھی۔ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ اس نے تعلیم کے ساتھ کچھ ٹیکنیکل کورسز بھی کیے ہوئے تھے، جبکہ شیر دل خان نے گریجویشن کے بعد تعلیم کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ شیر دل خان کی شادی غازی خان نے اپنے مل اونر دوست کی بیٹی نگہت سے کر دی تھی، مگر عبدالغفار کی شادی اس کی امی نے اپنی بھتیجی سے کی تھی۔ نسیم عبدالغفار کی بھی پسند تھی اور وہ نگہت سے کہیں زیادہ خوب صورت تھی۔ نگہت دولت مند اور فیشن ایبل خاندان کی لڑکی تھی۔ اس لیے خود کو بنانے سنوارنے کا طریقہ بھی آتا تھا، جبکہ نسیم ان چونچلوں سے ناواقف تھی، لیکن پھر بھی سادگی میں بھی غضب ڈھاتی تھی۔ وہ اتنی پیاری تھی کہ اسے ان مصنوعی سہاروں کی ضرورت نہ تھی۔ نگہت اس سے حسد کرنے لگی تھی اور کبھی کبھار ہنس کر پوچھ لیا کرتی۔

''نسیم جی تمہارے اس بے داغ حسن کا راز کیا ہے؟'' نسیم مسکرا کر کہتی۔ ''بھابی جی ہم نے کبھی کچھ استعمال نہیں کیا خاص کر یہ فضول چیزیں، امی دیسی ٹوٹکے آزماتی ہیں ہمارے چہروں پر، ہم نے وہ ہی استعمال کیے ہیں۔'' نسیم نے ہنس کر کہا تو نگہت کچھ دیر کے لیے چپ سی رہ گئی۔

''ماشاء اللہ تمہارے بال بہت خوب صورت ہیں۔ سلکی گھنے سیاہ بال شیمپو کون سا استعمال کرتی ہو۔''

''بھابی ہم شیمپو نہیں لگاتے، امی کھوپرے کا تیل، سرسوں کی کھلی اور دوسری چیزوں سے سر دھوتی تھیں اور ہمیں آملے، ریٹھے اور سکا کائی کا شیمپو بنا کر دیتی تھیں۔ وہ خود بھی یہی چیزیں استعمال کرتی تھیں۔ آج اس عمر میں بھی ان کے بال لمبے اور چمکدار ہیں اور ہم سب بہنیں یہی استعمال کرتی تھیں اور اب شادی کے بعد غفار نے دھنیے اور چنبیلی کا تیل لا کر دیا ہے، وہ لگاتی ہوں۔'' نسیم نے شرماتے ہوئے کہا۔

''اوہ اچھا۔ تم تو بہت سگھڑ بیوی ہو۔ میک اپ اور شیمپو کا خرچ بچا لیا۔''

اور اب نسیم کی باری تھی۔ ''اس نے پوچھا بھابی آپ کیا استعمال کرتی ہیں؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''بھئی ہماری ساری چیزیں امپورٹڈ ہوتی ہیں۔ بھائی باہر سے بھیجتے ہیں۔'' نگہت کے لہجے میں فخر بول رہا تھا اور پھر وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی اور نسیم اس کی پشت کو دیکھتی رہ گئی۔

نسیم کی صرف ایک بیٹی تھی آمنہ، اس کی پیدائش کے بعد وہ بیمار رہنے لگی تھی۔ آپریشن کے دوران پیچیدگی پیدا ہوگئی تھی۔ اسی لیے ڈاکٹر نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ اب اولاد نہیں ہوگی۔ نگہت کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ عاشی، عارفہ، بڑا بیٹا فرخ دونوں چھوٹے بیٹے بھائی کے پاس پڑھنے کے لیے امریکہ چلے گئے تھے۔ صرف فرخ ان کے پاس تھا اور بزنس میں باپ کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ دادا دادی کا

انتقال ہوگیا تھا۔ غازی خان نے مرنے سے پہلے اپنی جائیداد دونوں بچوں میں تقسیم کردی تھی، لیکن یہاں بھی انہوں نے ناانصافی سے کام لیا تھا۔ ایک بنگلہ، اپنا آفس اور تھوڑی سی جائیداد چھوٹے بیٹے کو دی تھی اور جس چار مرلے کی کوٹھی میں ان کی رہائش تھی اور ٹیکسٹائل مل بڑے بیٹے کو دی تھی۔

چھوٹے بھائی نے کوئی شکوہ نہ کیا تھا۔ آفس کے کام تو وہ پہلے بھی دیکھتا تھا۔ اب اس نے امپورٹ ایکسپورٹ کا کام تیز کردیا تھا۔

شیردل خان کا بڑا بیٹا آمنہ سے شادی کرنا چاہتا تھا، لیکن والدین راضی نہیں تھے۔ سب سے زیادہ اس کی ماں خلاف تھی۔ وہ اپنی بھتیجی بشریٰ کو اپنی بہو بنانا چاہتی تھی۔ شیردل خان بھی بیوی کے حامی تھے۔ والدین کی وفات کے بعد عبدالغفار خان بھی اپنے الگ گھر میں شفٹ ہوگئے تھے، جو انہیں باپ کی طرف سے ورثے میں ملا تھا، مگر فرخ والدین کے منع کرنے اور ناراضگی کے باوجود چچا کے گھر جاتا رہا۔ چچا نے بھی اسے بہت سمجھایا۔

''بیٹا جو تمہارے والدین چاہتے ہیں تم وہ ہی کرو۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔ تمہاری ضد اور نافرمانی سے بھائی بھائی کا دشمن ہوجائے گا اور خاندان کا شیرازہ بکھر جائے گا۔'' مگر اس نے ایک نہ سنی۔

آمنہ نے بھی اسے بہت سمجھایا کہ فرخ اپنی ضد چھوڑ دو، ورنہ کسی کا کچھ نہیں جائے گا، مگر میری زندگی برباد ہوجائے گی۔ میں تایا اور تائی جان کی بڑی عزت واحترام کرتی ہوں۔''

وہ رونے لگی تو فرخ نے کہا۔ ''تم پریشان نہ ہو، مجھے یقین ہے امی اور پاپا مان جائیں گے۔'' آمنہ نے اپنے آنسو پونچھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''خدا کرے ایسا ہی ہو۔''

☆......☆

احسن علی شیردل خان کی مل کا منیجر تھا۔ وہ خوبصورت، پرکشش نوجوان اکثر شیردل خان کے گھر آتا جاتا تھا۔ شیردل خان کو اس پر بہت اعتبار تھا۔ انہوں نے مل کا سارا کام اسی پر چھوڑ رکھا تھا اور اس نے ان کے اس بھروسے کو قائم رکھا تھا۔ وہ بہت محنتی اور ذمے دار انسان تھا۔ وہ عاشی کو پسند کرنے لگا تھا اور عاشی بھی اس کی سحر انگیز شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ نگہت کو بھی بہت اچھا لگتا تھا۔ انہوں نے سوچا تھا کہ اس سے اچھا داماد کہاں ملے گا۔ اس لیے وہ بھی اس سے بڑی محبت اور عزت سے پیش آتی تھیں۔

احسن کے والدین ایک حادثے میں چل بسے تھے۔ وہ اپنی بہن کے پاس رہتا تھا۔

کچھ عرصے بعد نسیم کا انتقال ہوگیا۔ آمنہ پر قیامت اور غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ نانی کا بھی انتقال ہوچکا تھا۔ نانا بہت بوڑھے تھے، وہ آنہیں سکتے تھے، اب گھر میں صرف باپ اور نوکر چاکر تھے۔ کبھی کبھی احسن آجاتا تھا۔ اس نے آمنہ کو بہن بنایا ہوا تھا۔ اس کی شوخ شوخ باتوں سے وہ بہل جاتی تھی۔

فرخ احسن کا دوست بھی تھا۔ نسیم کے انتقال کے ایک سال بعد عبدالغفار کو اچانک ہارٹ اٹیک ہوگیا۔ وہ اسپتال میں تھے جب شیردل خان بھائی کو دیکھنے آئے تو عبدالغفار نے بھائی کا ہاتھ پکڑ کر التجا کی۔

''آمنہ بھری دنیا میں تنہا ہے۔ آپ اسے اکیلا مت چھوڑنا۔ اس کا خیال رکھنا۔'' انہوں نے بھائی کو تسلی دیتے ہوئے وعدہ کیا کہ وہ آمنہ کو اپنی بیٹی بنالیں گے، وہ تنہا نہیں رہے گی۔'' اتنی تسلی کافی تھی۔ عبدالغفار خان مطمئن ہوکر اس دنیا سے چلے گئے اور آمنہ روتی دھوتی تایا کے گھر آگئی۔

نگہت نے ایسا کبھی نہیں چاہا تھا۔ انہوں نے تو کبھی نسیم کو بھی زیادہ منہ نہ لگایا تھا تو اس کی بیٹی کی کیا

حیثیت تھی ان کے سامنے۔ ان کے دل میں کوئی گنجائش نہیں تھی اس کے لیے، مگر ان کی مرضی کے خلاف سب کچھ ہو گیا۔

شیر دل خان بھائی کی محبت اور ان سے کیا ہوا وعدہ بھتیجی کو گھر لا کر نبھا رہے تھے اور آمنہ نگہت بیگم کی کڑی نگاہوں میں تھی، مگر فرخ تو آسمان کو چھو رہا تھا۔

آمنہ کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ فرخ کا سامنا کرنے سے کترانے لگی تھی۔ اس نے پورا گھر سنبھال لیا تھا۔ فرخ کی محبت پاش نگاہیں اسے خود سے بیگانہ کر دیتی تھیں۔ دوسری طرف تائی امی کی تلوار جیسی نگاہیں اسے ہوش میں لا پٹختی تھیں اور وہ خوفزدہ ہو کر کمرے میں بند ہو جاتی تھی، اکثر راتیں نگہت اور شیر دل خان کی لڑتے جھگڑتے گزر جاتی تھی۔ آخر عاجز آ کر اس نے کہا۔

''نگہت بیگم کچھ باتیں مجبوراً کرنا پڑتی ہیں اور کچھ مصلحتاً، چنانچہ مرتے ہوئے بھائی سے وعدہ کیا تھا کہ میں آمنہ کو اپنی بیٹی بنا لوں گا، تو مجھے اپنا وعدہ تو پورا کرنا ہے۔ آمنہ اور فرخ کی شادی کر کے اپنا وعدہ پورا کرنا چاہتا ہوں اور بیٹے کی نگاہوں میں بھی میری حیثیت معتبر ہو جائے گی، اس کے بعد جب وہ بہو بن جائے گی جو چاہے سلوک کرنا میں تمہیں نہیں روکوں گا۔''

اب تو ان کو کھلی اجازت مل گئی تھی ہر ظلم و زیادتی کی۔ بڑی معنی خیز مسکراہٹ ان کے لبوں پر پھیل گئی تھی۔

اور پھر پروگرام کے مطابق فرخ کا نکاح آمنہ سے کر دیا گیا۔ نہایت سادگی کے ساتھ دلہن بنا کر اسے فرخ کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

آمنہ کے نکاح میں احسن نے بھی شرکت کی۔ اب اسے اپنا حصول آسان نظر آنے لگا تھا۔ حالانکہ ابھی تک اسے کوئی اشارہ نظر نہیں آیا تھا اس کے باوجود عاشی اور احسن بہت خوش و مگن تھے۔ نگہت نے خانساماں کو نکال دیا تھا اور سارا کام آمنہ کے کاندھوں پر ڈال دیا تھا۔ گھر کے سارے کام کچن سے لے کر گھر کی صفائی تک وہ کرتی تھی۔ سب ملازماؤں کو ہٹا دیا گیا تھا۔ وہ اتنی محنت و مشقت سے تھک کر چور ہو جاتی۔ دبلی تو وہ پہلے ہی تھی اب اور کمزور ہو گئی تھی۔

اور جب بچی کی پیدائش ہوئی تو وہ بستر سے لگ گئی، پھر اسے کوئی توجہ نہیں ملی۔ جی چاہا تو کھا لیا ورنہ کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ اس پر مسلسل کام نے کمر توڑ کر رکھ دی۔ بخار رہنے لگا تو فرخ کو فکر لاحق ہوئی۔ وہ پریشان سا ڈاکٹر کو لینے دوڑا۔ ڈاکٹر نے فرخ کو دیکھتے ہوئے شاکی نظروں سے پوچھا۔

''آپ کی مسز کتنے دنوں سے بھوکی ہیں؟''

ڈاکٹر کے اس سوال پر گھبرا کر اس نے آمنہ کو دیکھا۔ آمنہ نے نظریں جھکا لیں۔ ڈاکٹر نے کہا۔

''پہلے آپ ان کو کچھ کھلائیں۔ اس کے بعد جو دوائیں میں نے تجویز کی ہیں انہیں استعمال کرائیں، ذرا خود توجہ دیں۔ انہیں طاقت کی چیزیں دیں۔ بہت کمزوری ہے ان میں، ان پر اور ان کی خوراک پر توجہ دیں، ورنہ کوئی نقصان بھی ہو سکتا ہے۔'' ڈاکٹر کے جانے کے بعد فرخ نے آمنہ کے قریب بیٹھ کر رازداری سے پوچھا۔

''کیا بات ہے، تم کچھ کھاتی پیتی نہیں ہو یا کوئی پابندی ہے۔''

''نہیں فرخ، پابندی کوئی نہیں۔ میرا خود جی نہیں چاہتا کھانے پینے کو۔''

''اس طرح تو تم مر جاؤ گی۔ کسی کا کچھ نہیں بگڑے گا، میری دنیا ویران اور بچی بن ماں کی ہو جائے گی۔''

''کسی کی دنیا ویران ہوتی ہے نا کوئی بن ماں کا ہوتا ہے۔ کسی کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں

پڑے گا۔ ہر کام اپنے معمول کے مطابق ہوتا رہے گا، لیکن میں نہیں ہوں گی۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ ویسے بھی میں اس گھر اور آپ کی زندگی میں کہیں بھی تو فٹ نہیں۔ اس لیے میرا چلے جانا ہی اچھا ہے۔"

آمنہ کی آنکھوں میں آنسو اور خشک لبوں پر ٹوٹی ہوئی سسکیاں لرز رہی تھیں۔

"میری سمجھ میں تمہاری باتیں نہیں آتیں، میں امی سے یا عاشی سے پوچھتا ہوں گھر میں کیا ہو رہا ہے۔" آمنہ اسے روکتی رہ گئی، مگر وہ اُٹھ کر چلا گیا۔

"امی بات کیا ہے کہ آپ نے آمنہ کو لاوارثوں کی طرح الگ ڈال دیا ہے۔ کوئی بھی اس کی دیکھ بھال نہیں کرتا نہ اس پر توجہ دیتا ہے۔ گھر میں نوکروں کی قطار لگی ہے۔ پتا نہیں وہ کب سے بخار میں مبتلا ہے۔ پتا نہیں کتنے دنوں سے اس نے کھانا نہیں کھایا اور جب ڈاکٹر نے یہ کہا، کتنے دنوں سے بھوکی ہے تو میں شرم سے زمین میں گڑ گیا، کم سے کم ایک دودھ کا گلاس تو اسے پلا دیا ہوتا۔"

فرخ بہت غصے میں تھا۔ ماں نے بات کو سنبھالا اور مسکراتے ہوئے بولیں۔

"ابھی نئے نئے باپ بنے ہو نا تو زیادہ ہی فکر لاحق ہو رہی ہے۔" انہوں نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اپنے قریب بٹھایا۔

"بیٹا کیا کہوں، تمہاری بیوی بہت نخریلی ہے۔ دودھ اسے پسند نہیں اور ڈبل روٹی سے اسے ابکائیاں آتی ہیں، کئی بار تو میں نے ضد کر کے سوپ پلایا ہے۔ وہ چند گھونٹ لے کر منہ پھیر لیتی ہے۔ گوند کھانے، یخنی جو بھی دوں منہ پھیر کر کہتی ہے میں نے نہیں کھانا۔ زیادہ کہو سنو تو رونا شروع کر دیتی ہے۔ تم ہی بتاؤ پھر کیا کروں، عاشی کو کالج اور عارفہ کو اسکول سے چھٹی نہیں ملتی۔ وہ اپنی اسٹڈی میں مصروف ہوتی ہیں۔ رفعت ہی اس کی خدمت میں لگی رہتی ہے۔

اب تم خیر سے باہر سے آ جاؤ تو اسے کہیں گھمانے کے لیے لے جانا۔ آب و ہوا بدل جائے گی تو اس کی صحت بھی ٹھیک ہو جائے گی۔"

نگہت نے کچھ اس طرح اسے شیشے میں اتارا کہ وہ چپ چاپ چلا گیا۔ رفعت کے ہاتھ دودھ ڈبل روٹی آمنہ کے لیے بھجوا دی اور خود میڈیکل اسٹور چلا گیا دوا لینے۔

شیر دل خان اور نگہت نے زبردستی فرخ کے لیے امریکہ جانے کا ٹور بنا لیا تھا، بزنس کے سلسلے میں۔ اصل میں ماں اسے یہاں سے ہٹانا چاہ رہی تھیں۔ ان کی چال کوئی بھی نہ سمجھ پا رہا تھا، مگر فرخ سخت تذبذب میں تھا کہ آمنہ کو اس حالت میں چھوڑ کر وہ کیسے چلا جائے۔ نگہت نے اسے پیار سے سمجھایا۔

"بیٹا یہ تمہارے مستقبل کا سوال ہے۔ تمہارے دونوں چھوٹے بھائیوں کو لندن اتنا پسند آیا ہے کہ اب وہ یہاں نہیں آنا چاہتے۔ ماموں نے انہیں اپنے بزنس میں شریک کر لیا ہے۔ یہاں تو تم ہی اپنے باپ کا بازو ہو۔ آگے یہ سارا بزنس تمہیں ہی سنبھالنا ہے، تو ہمت اور عقل سے کام لو۔ آمنہ ٹھیک ہو جائے گی۔ زندگی میں نشیب و فراز تو آتے ہی رہتے ہیں۔ تم اپنا پروگرام خراب مت کرو۔ ہم لوگ ہیں نا یہاں دیکھنے والے۔"

فرخ نے تیاری کر لی۔ آمنہ پہلے سے ٹھیک نظر آ رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ فرخ کی مکمل توجہ تھی۔ اس نے آمنہ کو بڑی تسلی تشفی دی اور اسے مستقبل کے حسین خواب دکھا کر چلا گیا اور آمنہ مسکراتی رہی۔

زندگی کے سنہرے خواب
مستقبل کے حسین خواب

فرخ اتنے بہت سے خوابوں کے ہجوم میں ہیں ان کی تعبیریں کہاں ڈھونڈتی پھروں۔ کاش آپ جان سکتے کہ خوابوں کے سہارے جینا اتنا آسان

نہیں۔ دنیا ایک سنگین حقیقت ہے۔

☆......☆

اب میدان نگہت کے ہاتھ میں تھا۔ آمنہ کو رفعت کے ذریعے بہت تیزی سے سلو پوائزن کی ڈوز پلائی جانے لگی۔ اب تینوں ٹائم اس کو دودھ دیا جانے لگا تو آمنہ چیخ پڑی۔

''خدارا میرے حال پر رحم کرو، اتنا زیادہ دودھ مجھ سے نہیں پیا جاتا۔'' اس کی چیخ پر نگہت آ گئیں۔

''ارے کیا ہوا بیٹی؟'' وہ برابر میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگیں۔

''تائی جان! یہ دودھ کے گلاس میرے حلق سے نہیں اترتے۔'' آمنہ ہلکی سی آواز میں بولی۔

''ٹھیک ہے رفعت، دودھ کو آدھا کر دو اور گلاس میں نہیں چینی کے مگ میں لا کر دو۔''

''آمنہ بیٹی ڈاکٹر نے گولیاں دودھ کے ساتھ لینے کی ہدایت کی ہے۔ ایک کپ ہی سہی اتنا دودھ تو پینا ہی پڑے گا۔''

رفعت چینی کے مگ میں دودھ لے آئی اور نگہت نے اسے سہارا دیتے ہوئے پہلے گولی اس کے منہ میں رکھی اور پھر دودھ والا مگ اس کے لبوں سے لگا دیا۔ آمنہ نے کوئی مزاحمت نہ کی خاموشی سے دودھ پی لیا۔

''شاباش بیٹا۔ اب تم سو جاؤ۔''

صرف دودھ میں ہی نہیں کھانے کی ہر چیز میں بھی وہ قطرے ڈالے جاتے۔ بمشکل تمام وہ ایک سلائس لیتی اس سے زیادہ کچھ نہ کھا سکتی۔ آملیٹ کو بھی وہ صرف چکھتی ہی تھی۔ آمنہ زیادہ تر ان دواؤں کے زیر اثر سوتی رہتی اور نیم غنودگی میں ہی اسے کھلایا پلایا جاتا۔ دن بدن وہ موت کے قریب ہوتی چلی جا رہی تھی۔ ماں کا دودھ اور دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے بچی فوت ہو گئی، مگر آمنہ کو ہوش نہیں تھا۔

جب بھی وہ ہوش میں آتی اور اپنی آغوش خالی دیکھ کر بچی کا پوچھتی تو رفعت اسے کہتی کہ وہ دادی کے پاس ہے، تو وہ پھر سے آنکھیں موند لیتی۔

آخر کار ایک دم اُسے ایسا ڈوز دیا گیا کہ وہ پھر اُٹھ نہ سکی اور موت کی گود میں سر رکھ کر سوگئی۔

نگہت بیگم نے فون پر بیٹے اور شوہر کو آمنہ کی موت کی اطلاع دے دی۔ احسن بھی شیر دل خان کے ساتھ آؤٹ آف سٹی تھا۔ آمنہ کی بیٹی کے انتقال کے بعد ہی شیر دل خان گھبرا کر کراچی چلے گئے تھے اور ساتھ میں احسن کو بھی لے گئے تھے۔ اب جبکہ آمنہ کی موت کی خبر انہیں پہنچی تو وہ چپ کے چپ رہ گئے۔ احسن کو بھی دھچکا پہنچا تھا۔ اسے شبہ تھا کہ آمنہ کے ساتھ یقیناً زیادتی ہوئی ہوگی۔

ایسی صورت حال میں جبکہ فرخ بھی گھر پر نہیں ہے تو گھر والوں کو کھلی چھٹی تھی لیکن عاشی کو شبہ نہیں پورا یقین تھا کہ اس کی پیاری بھابی کو ماں نے راستے سے ہٹایا ہے، اپنی بھتیجی بشریٰ کی وجہ سے۔ وہ اسے بہو بنا کر جلدی سے آمنہ کی جگہ پر لانا چاہتی تھیں۔ کچھ لوگ حق رکھتے ہیں، حق جتاتے ہیں، حق مانگتے ہیں، مگر کچھ حق لیتے ہیں، انہیں کسی کی پروا نہیں ہوتی۔ نگہت نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔

بشریٰ فرخ کی ٹھیکرے کی مانگ تھی، مگر اس دل کا کیا کیا جائے کہ وہ آمنہ پر آ گیا تھا۔ فرخ نے بچپن کی اس مانگ کو ٹھکرا دیا تھا۔ گھر والوں کا ووٹ بھی آمنہ کے حق میں تھا، حتیٰ کہ شیر دل خان نے بھی جب مرتے ہوئے بھائی کی آخری خواہش کا احترام کرتے ہوئے آمنہ کو بہو بنانے کا فیصلہ کرلیا تو نگہت کو ہتھیار ڈالنا پڑے، مگر وہ اپنی شکست کو بھولی نہیں تھیں۔

انہوں نے پکا ارادہ کرلیا تھا کہ وہ نسیم کی بیٹی کو بسنے نہیں دیں گی۔ اسے یہ گھر ہی نہیں دنیا بھی چھوڑنی پڑے گی، پھر انہوں نے اس خوب صورتی سے پلاننگ کی کہ کوئی جھول نہیں رہا۔ رفعت جو اس کی نرس تھی، اسے بھاری معاوضہ دے کر اس پلاننگ میں شامل کرلیا گیا تھا۔ وہ نرس تو پہلے ہی ان کاموں میں ماہر تھی۔ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی اور موت نے زندگی کو نگل لیا۔

ایکدن نگہت نے بشریٰ کو آمنہ کے انتقال کی خبر دی تو وہ تو حیران رہ گئی۔

''پھوپو، آمنہ اتنی جلدی کیسے مرگئی، ابھی تو سال بھی پورا نہیں ہوا۔'' وہ الجھن میں پڑ گئی۔

اس کے گردے خراب ہوگئے تھے۔ اس نے یہ بات ہم سے چھپائی، اسی دوران اس کے بچی پیدا ہوئی تو طبیعت بگڑ گئی اور جب ڈاکٹر نے انکشاف کیا تو میں ورطۂ حیرت میں ڈوب گئی، اسے تو مرنا ہی تھا۔''

''اوہ...... بے چاری اتنی جلدی دنیا چھوڑ گئی۔'' اس نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

''خاموش کیوں ہوگئیں، کیا سوچنے لگیں؟''

''پھوپو میں سوچ رہی تھی کہ لوگ اتنی کم عمر کیوں لے کر آتے ہیں دنیا میں۔''

''فضول کی باتیں چھوڑو، جتنی اس کی زندگی تھی اس نے جی لی۔ میری بات غور سے سنو، فرخ آنے والا ہے۔ چنانچہ تم بھی کچھ دنوں کے لیے آجاؤ، کیوں کہ فرخ کو ایک دوست، غم گسار کی ضرورت ہوگی اور تم سے بڑھ کر اس کا غم گسار کون ہوسکتا ہے۔ یہی وقت ہے اس کے دل میں اترنے کا۔ میں جلد سے جلد تمہیں اس کی زندگی میں شامل کردینا چاہتی ہوں، تاکہ آمنہ کی یادیں اسے ڈسٹرب نہ کریں۔''

''میں کوشش کرتی ہوں آنے کی۔''

''کوشش نہیں بس تم آنے کی کرو۔ بھابی سے میں نے بات کرلی ہے۔''

''اچھا، اچھا۔'' بشریٰ نے مسکراتے ہوئے فون بند کردیا۔

☆......☆

اب ساری جائیداد، تمام سرمایہ اور آفس سب شیر دل خان کا تھا۔ بھائی رہا تھا نہ اس کی بیٹی اور نہ ہی نواسی۔ میدان صاف تھا۔ شیر دل خان ہمیشہ سے جاہ پرست تھے۔ نگہت کی اطلاع کے باوجود شیر دل خان نے مزید کچھ عرصہ کراچی میں لگا دیا۔ اس عرصے میں آمنہ کا چہلم بھی ہو گیا تھا۔ گھر میں پہلے سے کہیں زیادہ خوشگوار موسم نظر آ رہا تھا۔ سب کے چہرے ہشاش بشاش تھے، کچھ دیر کے لیے شیر دل خان بھول گئے کہ اس گھر میں جوان موت ہو چکی ہے۔ چند دن پہلے وہ واپس آ گئے تھے، مگر وہ کھوئے کھوئے سے تھے۔ انہوں نے بیوی سے بہت کچھ کہنا اور پوچھنا چاہا مگر زبان پر جیسے قفل پڑ گئے تھے۔ وہ آمنہ کے کمرے میں گئے جو نئے سرے سے سجا دیا گیا تھا، مگر اس کے باوجود انہیں آمنہ کی شاکی نظریں خود پر گڑی نظر آئیں۔ ان کو اس کی معصوم بچی کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، وہ گھبرا کر باہر نکل آئے۔

''انکل، آپ آ گئے؟'' وہ خوشی سے مسکراتی ہوئی ان سے لپٹ گئی۔

''ہاں میں رات کی فلائٹ سے آیا تھا تم کب آئیں؟''

''میں بھی کل ہی آئی ہوں۔'' دونوں باتیں کرتے ہوئے لان کی طرف نکل گئے۔

''فرخ کب تک آ رہے ہیں انکل؟'' اصل بات اس کی زبان پر آ گئی۔

''اگلے ہفتے آ رہا ہے اور تمہارے ساتھ کون کون آیا ہے؟''

''میں اکیلی ہی آئی ہوں۔'' وہ مسکرائی۔

پھر دونوں نگہت کے پاس چلے گئے۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ بشریٰ کو چھوڑ کر وہ واپس پلٹے اور اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔ اس گھر سے آمنہ کی ہر یادگار ہٹا دی گئی تھی یا ضائع کر دی گئی تھی۔ آمنہ کا نام سب بھول چکے تھے۔ گھر کی تاریخ کے کسی صفحے پر آمنہ اور اس کی معصوم بیٹی کا نام نہیں لکھا تھا۔ ایک نئی تاریخ رقم ہو رہی تھی اور اس تاریخ کو مرتب کرنے والے بھی وہ ہی ہاتھ تھے۔ جنہوں نے آمنہ اور اس کی معصوم بچی کو اس خاندان سے بے دخل کر دیا تھا، شاید فرخ کی موجودگی میں اس دیدہ دلیری کی ہرگز گنجائش نہ نکل پاتی۔ اسی لیے ایک ترکیب کے ساتھ فرخ کو سامنے سے ہٹا دیا گیا تھا اور اب وہ چین کی بانسری بجا رہے تھے۔ کبھی کبھی شیر دل خان کا ضمیر جاگ اُٹھتا کہ شیر دل خان آپ نے اچھا نہیں کیا۔

''خدا کے سامنے کیا جواب دو گے۔'' تو وہ گھبرا کر پناہیں ڈھونڈنے لگتے۔ رفتہ رفتہ ان کے ضمیر کے ساتھ جرم کا یہ احساس بھی لمبی تان کر سو گیا تھا۔

☆......☆

فرخ آ گیا اور ماں سے لپٹ کر بہت دیر تک روتا رہا۔ آمنہ کی یاد تازہ تھی اس کی محبت، اس کے ساتھ گزرے حسین لمحے، معصوم بچی کا گلاب سا چہرہ اور وقتِ رخصت آمنہ کی آنکھوں میں ٹھہری یاسیت، ہونٹوں پر لرزتی مسکراہٹ، کچھ بھی تو نہیں بھول پا رہا تھا۔ ہر گزرا لمحہ روزِ روشن کی طرح سامنے آ کر تڑپا رہا تھا، کیا خبر تھی کہ لمحوں کی یہ جدائی دائمی بن جائے گی اور پھر وہ کسی کو نہ دیکھ سکے گا۔ نگہت نے اسے پیار کیا اور آنسو پونچھتے ہوئے تسلی دی اور سمجھایا۔

''بیٹا آمنہ کے گردے خراب ہو گئے تھے اور بچی کی پیدائش پر زیادہ خرابی پیدا ہو گئی، پھر وہ بستر سے اٹھ نہ سکی۔ ڈاکٹر حیران تھا کہ وہ اتنے دن بھی کیسے جی لی۔ ورنہ ان کے مطابق تو اسے بہت پہلے مر جانا چاہیے تھا، مگر ایک روح کو دنیا میں آنا تھا، موت نے مہلت دے دی تھی۔''

فرخ بڑی حیرانی سے ماں کی شکل دیکھ رہا تھا۔

آمنہ کو تو کبھی موسمی بخار بھی نہ ہوا تھا۔ شادی کے بعد تک وہ اچھی خاصی صحت مند تھی۔ پھر ڈاکٹر نے اتنی بڑی خبر کیسے سنا دی؟"

"ہاں بیٹا تمہارے جانے کے بعد تو اسے جیسے بیماری نے گھیر لیا تھا۔ بخار تو تمہارے سامنے بھی تھا اسے۔ میں سمجھی کہ موسم بدل رہا ہے ٹھیک ہو جائے گی۔ ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے جیسے میرے سر پر بم دے مارا۔"

پھر اٹھیں اور رپورٹ لاکر فرخ کے ہاتھ پر رکھ دی۔ کسی بے ضمیر ڈاکٹر سے انہوں نے بھاری معاوضہ دے کر یہ جعلی رپورٹ تیار کروائی تھی، تاکہ بیٹے کو دکھا کر مطمئن کر سکیں۔ اس نے پوری رپورٹ پڑھی اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کئی روز تک وہ چپ چپ رہا پھر باپ کے ساتھ قبرستان گیا۔ جہاں آمنہ کی قبر کے پہلو میں ایک ننھی قبر اس کی شیر خوار بچی کی بھی تھی۔ اس نے بچی اور آمنہ کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ دیر تک بیٹھا ان پر ہاتھ پھیرتا رہا، آنسو بہاتا رہا، آمنہ سے معافیاں مانگتا رہا، پھر باپ کے ساتھ واپس آ گیا۔

اب اسے گھر میں ہر قدم پر بنی سنوری بشریٰ ملتی، شوخ و چنچل کھلکھلاتی ناز و ادا سے شوخیاں بکھیرتی ہوئی۔ وہ اسے خالی خالی نظروں سے تکتا رہتا۔ وقت بڑی تیزی سے گزر رہا تھا۔ اس کے سامنے حالات کا گورکھ دھندا اور نت نئے رنگ میں زندگی کے عجائبات تھے جو اسے ہر پہلو حیران کر رہے تھے۔ آمنہ کو وہ صبر کر چکا تھا کہ شاید مشیت ایزدی یہی تھی، مگر اس کی روح سے شرمندہ تھا وہ اس کی حفاظت نہ کر سکا۔ اسے یہ اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ نفرتوں، بیگانگی کے اس ماحول میں کوئی کب تک زندہ رہ سکتا تھا، جبکہ آمنہ تو بڑے نازک احساسات کی مالک اور بڑی غیور لڑکی تھی۔ میرے خلوص اور محبت پر اسے کوئی شک و شبہ نہیں تھا۔ یقیناً اس نے مجھے معاف کر دیا ہوگا، کیوں کہ اس کا دل دریا تھا، لیکن مسئلہ بشریٰ کا تھا۔ ایک دن نگہت نے آنسو بھری آنکھوں سے فرخ سے کہا۔

"بیٹا بھول جا سب کچھ، وہ اتنی ہی مختصر زندگی لے کر آئی تھی۔ نہ بیمار ہوتی تو کوئی حادثہ اس کی موت کا سبب بن جاتا۔ بشریٰ بہت اچھی صورت، سیرت ہر چیز میں خوبیوں کی مالک ہے، گو کہ آمنہ سے تمہاری شادی ہونے پر میرے بھائی بھاوج مجھ سے ناراض ہو گئے تھے، لیکن اگر اب میں بشریٰ کے لیے ان کے سامنے جھولی پھیلاؤں تو وہ مجھے کبھی خالی نہیں لوٹائیں گے۔ بشریٰ کو میری جھولی میں ڈال دیں گے، انکار نہیں کریں گے۔ تم شاید یقین نہ کرو مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ آمنہ کی موت پر بہت روئی ہے۔ اس کی مغفرت کے لیے پڑھ پڑھ کر بخشتا ہے۔ تمہارے حوالے سے وہ آمنہ کی بڑی عزت و احترام کرتی تھی۔ میرے بچے وہ تمہاری زندگی کے سارے کانٹے اپنی پلکوں سے چن لے گی۔ تمہیں اتنی خوشیاں دے گی جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

فرخ نے بھیگی پلکیں اٹھا کر ماں کو دیکھا۔

"امی اگر آپ کی خوشی یہی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آمنہ نہیں تو کوئی بھی ہو، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اس کی آواز میں اُداسی تھی۔

"جگ جگ جیو میری جان۔" ماں نے اسے گلے سے لگا کر کہا۔

☆......☆

نگہت نے ذرا بھی اسے سنبھلنے کی مہلت نہ دی اور دوسرے ہفتے بشریٰ اس کی شریکِ غم بن کر اس کی زندگی میں شامل ہو گئی۔ بشریٰ نے اپنی محبت اور باتوں سے بہت جلد اسے سنبھال لیا تھا۔ فرخ منافقت پسند نہیں کرتا تھا اس لیے اس نے ماضی کے دریچوں کو اپنے ہاتھ سے بند کر دیا تھا۔ وہ دو کشتیوں کا

مسافر نہیں بننا چاہتا تھا۔

☆......☆

شیر دل خان نے اپنے حلقے میں بڑا نام اور کافی دولت کمائی تھی۔ احسن سے وہ بہت خوش تھے۔ ان کی ترقی اور اس نیک نامی میں احسن کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ احسن نے بڑی محنت اور دیانت داری سے کام کیا تھا۔ آخر ایک دن اس نے اپنے اندر ہمت پیدا کر ہی لی، کیونکہ ایک عرصے سے وہ موقع کی تلاش میں تھا۔ آج وہ موقع ہاتھ آ ہی گیا تھا۔ شیر دل خان بہت خوش تھے۔ احسن نے مسکراتے ہوئے ان سے کہا۔

''سر اگر میں آپ سے کچھ مانگوں تو انکار نہیں کریں گے؟''

''ہاں، ہاں مانگ کر تو دیکھو۔ کیا مانگنا چاہتے ہو۔ دولت، بنگلہ کوٹھی، پکنک ٹور پر جس ملک میں چاہو بھیج دوں یا پھر اسسٹنٹ ڈائریکٹر بنا دوں۔''

''نہیں سر مجھے کوئی عہدہ، دولت، بنگلہ کوٹھی یا کسی ملک کی سیر مطلوب نہیں ہے۔''

''پھر کیا چاہتے ہو بھئی، کچھ بولو تو۔'' شیر دل خان نے ایک قہقہہ لگایا۔

''سر میں عاشی کو اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے اپنا بیٹا بنا لیں۔''

شیر دل خان کے چہرے کا رنگ ایک دم ہی متغیر ہو گیا۔ وہ ایک دم ہی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بڑی اجنبی نظروں سے انہوں نے احسن کو دیکھا اور دھاڑ کر بولے۔

''عاشی کا ہاتھ مانگنے سے پہلے تم نے اپنی حیثیت تو دیکھ لی ہوتی۔ میں تمہیں کوئی سخت اور بری بات نہیں کہنا چاہتا۔ بہتر یہی ہے کہ اب تمہاری زبان پر میری بیٹی کا نام نہ آئے۔''

''سیٹھ صاحب بیٹیاں تجوریوں میں رکھنے کی چیز نہیں ہوتیں اور نہ ہی کسی سائل پر سوال کی پابندی لگائی جا سکتی ہے۔ میرا اور آپ کا ساتھ پانچ سال کا ہے۔ دن رات محنت کی ہے میں نے۔ آپ کا ہر حکم بجا لایا ہوں، کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے آپ کی فیملی نے مجھے عزت دی ہے میں نے کبھی آپ کا اعتبار توڑنے کی کوشش نہیں کی اور میرا باپ بھی کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ ایک سرکاری محکمے میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ بہت معزز اور ہر دل عزیز ہستی۔ بدقسمتی سے وہ محکمہ دیوالیہ ہو گیا۔ اسی غم میں انہیں ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ اس دنیا سے چل بسے اور ہمارے خاندان پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، مگر میں نے ہمت نہیں ہاری۔ رات دن تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایک کر دیے، آخر ایک روز میری محنت رنگ لے آئی اور میں نے ایم ایس سی اچھے نمبروں سے پاس کر کے یہ اعلیٰ مقام حاصل کر لیا۔ مجھ میں کیا کمی نظر آئی آپ کو کہ اتنی حقارت سے میرا سوال رد کر دیا۔ یہ میرا حق تھا، جس آنگن میں بیری ہوگی پتھر تو آئیں گے۔ آپ ایک بار پھر ٹھنڈے دل سے سوچیے گا کہ میرا سوال صحیح تھا یا غلط؟'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

شیر دل خان غصے میں بل کھانے لگے۔ انہیں اس کی جسارت پر حیرت تھی۔ یہ دو کوڑی کے لوگ اپنے ماضی کو بھول کر، اسے بنا سنوار کر پیش کرنے میں ذرا نہیں جھجکتے۔ تب ہی احسن کی کہی ہوئی باتوں کی بازگشت ان کے اطراف میں گونجنے لگی۔

''میرا باپ کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ وہ ایک سرکاری محکمے میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ وہ بہت معزز اور ہر دل عزیز ہستی......'' اور شیر دل خان ہوش میں آ گئے......مگر ابھی ان کا طنطنہ باقی تھا۔

''اونہہ سب یوں ہی کہتے ہیں۔''

☆......☆

دوسرے دن سب سے پہلے احسن کو آفس میں

داخل نہیں ہونے دیا گیا اور اسے فرم سے نکال دیا۔ اس نے بہت کوشش کی۔ اکاؤنٹنٹ، کلرک، منیجر ہر کوئی اپنی جگہ حیران تھا کہ بغیر کسی نوٹس اور خطا و قصور کے احسن کو یوں اچانک کیوں نکال دیا گیا، مگر کسی کی ہمت نہ تھی جو کوئی پوچھتا یا کہتا۔ احسن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ شیر دل خان کو شوٹ کر دیتا۔ آفس میں بھی کھسر پھسر شروع ہوگئی تھی۔ سب کی آنکھوں سے ناگواری چھلک رہی تھی۔ احسن کا ہی سارا ہولڈ تھا آفس میں۔ وہ سب کا دوست اور ہمدرد تھا۔ یہ کیا ہوگیا۔ سب کی ہمدردیاں اس کے ساتھ تھیں۔ اصل قصہ بھی سب کو معلوم ہوگیا تھا۔ ایسی باتیں خوشبو کی طرح پھیل جاتی ہیں، مگر معاملہ روزی کا تھا، اس لیے سب نے خاموشی اختیار کرلی۔

گھر میں نگہت کو جب معلوم ہوا تو وہ سخت برہم ہوئیں۔

''یہ آپ نے کیا کیا۔ خوامخواہ اسے اپنا دشمن بنالیا، جبکہ اس بات سے آپ بھی بے خبر نہیں کہ عاشی بھی احسن کو پسند کرتی ہے۔ لڑکا تو اچھا تھا۔ اس کا فیملی بیک گراؤنڈ بھی برا نہیں تھا۔ وہ محنتی، ذہین اور ایماندار بھی تھا۔

پھر کیا وجہ تھی کہ آپ نے اتنا سخت قدم اٹھالیا۔ اگر اس نے عاشی کا ہاتھ آپ سے مانگ لیا تو یہ دنیا سے کوئی انوکھی بات نہ تھی۔'' وہ بہت غصے میں تھیں۔

''ہاں بے شک یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی۔'' شیر دل خان نے کہا۔ ''لیکن جب ہمارے پاس اس سے بہترین پروپوزل موجود تھا تو پھر میں کیوں اس گھٹیا شخص کی حوصلہ افزائی کرتا، پھر وہ کسی وقت بھی میرے لیے خطرہ بن سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اسے آفس سے ہی نکال باہر کیا۔'' وہ فخر سے مسکرائے۔ ''اب مجھ سے پوچھو وہ پروپوزل کون سا ہے؟'' نگہت کا موڈ خراب تھا۔ انہوں نے تیکھی نظروں سے شوہر کو دیکھا۔

''آپ صاف بتائیں بات کیا ہے؟''

''وہ سیٹھ اظفر علی کے اکلوتے بیٹے افضل علی کا پروپوزل ہے۔ بزنس کی دنیا کا بے تاج بادشاہ۔ اس کا بیٹا ہیروں سے کھیل رہا ہے۔ میرے سارے قرضے معاف ہو جائیں گے اور ایک کے بجائے کئی فیکٹریاں لگالوں گا۔ اب بتاؤ میں نے گھاٹے کا سودا تو نہیں کیا۔ میری نگاہیں ہمیشہ آگے کی طرف دیکھتی ہیں۔'' ان کا لہجہ فخر و انبساط سے چُور تھا۔ نگہت تذبذب کے ساتھ بولیں۔

''بات تو آپ کی ٹھیک ہے مگر عاشی راضی نہیں ہوگی۔ ایسی صورت حال میں جبکہ احسن آپ کے زیر عتاب آ گیا ہے۔ وہ یہی خیال کرے گی کہ احسن کے ساتھ آپ نے ناانصافی کی ہے۔''

''تم ماں ہو بہتر طور پر سمجھا سکتی ہو۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور مسکراتے ہوئے چلے گئے۔

نگہت سوچ میں پڑ گئیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح یہ بات کریں۔

☆......☆

عاشی کو کچھ معلوم ہوا کچھ نہیں۔ کتنے ہی دن گزر گئے احسن گھر نہیں آیا تھا۔ نہ کسی نے اس کی غیر حاضری محسوس کی اور نہ ہی کوئی تذکرہ کیا۔ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ کسی نے اسے مبہم سا بتایا تھا کہ احسن کو نوکری سے نکال دیا گیا ہے، مگر کیوں؟''

عاشی الجھن کا شکار تھی۔ یہ سوال اسے پریشان کر رہا تھا۔ وہ احسن سے ملنا چاہتی تھی، ادھر احسن بھی اسی طرح سوچ اور کشمکش میں مبتلا تھا۔ سارے راستے بند ہوگئے تھے۔ ابھی چوٹ کا زخم تازہ تھا اور لوہا بھی گرم تھا اور یہی وقت تھا کہ گرم لوہے پر چوٹ لگادی جاتی۔ احسن نے منصوبہ بندی کرلی۔

☆......☆

اس نے احسن کو فون کیا۔ احسن اس کی آواز سنتے ہی بھڑک اٹھا۔

''عاشی تم نے بھی رابطہ نہیں کیا کم سے کم مجھے پرسہ تو دے دیتیں۔'' وہ مسکرایا۔

''کاہے کا پرسہ۔ ہوش میں تو ہیں آپ؟'' وہ چیخ پڑی۔

''وہ میرا مطلب نوکری سے تھا۔ پریشان کیوں ہوگئیں۔''

''پریشان تو آپ نے کر دیا ہے مجھے، کئی دنوں سے فون کیا نہ ہی گھر آئے۔ آپ آفس بھی نہیں آرہے ہیں۔ آپ کے اور پاپا کے درمیان کوئی مسئلہ ہے کیا۔''

''میں نے بہت بار کوشش کی مگر...... شاید تمہارا سیل خراب ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ہمارے بیچ میں تم آگئی ہو۔'' وہ ہنس پڑا۔

''کیا مطلب؟'' عاشی گڑبڑا گئی۔

''تم آجاؤ۔ سب سمجھ میں آجائے گا۔ میں بس اسٹاپ پر تمہارا انتظار کروں گا۔'' فون بند کرتے ہی وہ تیار ہو کر عارفہ سے کہا۔

''میں کچھ دیر کے لیے آصفہ کے پاس جا رہی ہوں، امی پوچھیں تو بتا دینا۔'' وہ عارفہ کے جواب کا انتظار کیے بغیر گیٹ سے نکل گئی۔

وہ بس اسٹاپ پہنچی تو احسن سامنے ہی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ وہ اس کے قریب پہنچی تو احسن نے دروازہ کھول دیا۔

وہ اندر بیٹھ گئی۔ احسن نے ڈرائیورنگ سیٹ سنبھالتے ہی گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' اس نے ونڈ اسکرین پر نظر جمائے پوچھا۔

''جہاں دو دل ملتے ہیں، جہاں زمین اور آسمان کا ملن ہوتا ہے۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

عاشی نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ سنجیدہ چہرے کے ساتھ ڈرائیونگ کر رہا تھا اور نگاہیں ونڈ اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ اُلجھ گئی تھی، لیکن اس نے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا، کیوں کہ گاڑی رش میں پھنس گئی تھی۔ دونوں کے درمیان خاموشی کی دبیز چادر تنی ہوئی تھی۔ ٹریفک کے شور کی آوازیں تھمیں تو وہ اپنے خیالوں سے نکلی۔ اس نے گھبرا کر سامنے دیکھا تو کورٹ کی عمارت نظر آئی، تو وہ گنگ سی رہ گئی۔

''آؤ چلیں یہی وہ جگہ ہے جہاں زمین اور آسمان کا ملن ہوتا ہے۔'' احسن نے دھیرے سے اس کا ہاتھ تھاما وہ میکانئی انداز میں اس کے ساتھ قدم اٹھا رہی تھی۔ احسن نے صحیح کہا تھا کہ یہاں آکر احساس مٹ جاتا ہے۔ اب وہ خیالوں کی دنیا سے باہر نکل آئی تھی۔ اسے ایک محور مل گیا تھا۔ اسے بہت کچھ یاد آرہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹ گئے تھے۔ ماں اور باپ کا کردار کسی جگنو کی طرح بجھ رہا تھا اور ان کے عقب سے احسن اور آمنہ کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ ننھی بچی کی کلکاریاں گونج رہی تھیں۔ آمنہ اور بچی اس دنیا میں نہیں تھیں، لیکن احسن زندہ تھا۔ اس نے شیر کے منہ میں ہاتھ ڈال دیا تھا، اب وہ زخمی شیر دھاڑتے ہوئے اپنے ہی زخم چاٹ رہا تھا۔ سب کے چہروں سے نقاب اتر گیا تھا اور عاشی کو وہ وقت یاد آرہا تھا جب شیر دل خان اس کو اپنے ساتھ پہلی بار گھر لے کر آئے تھے۔ اس وقت عاشی اسکول میں پڑھتی تھی۔

''نگہت یہ احسن ہے بڑا ذہین اور باصلاحیت نوجوان ہے۔ ابھی اس نے ایم بی اے کا امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا ہے، اور میں نے اپنے آفس کے لیے اس کا انتخاب بطور پرچیز آفیسر کیا ہے۔''

''ماشاء اللہ۔'' نگہت اس کے قریب آگئیں۔

بیٹا آپ کے والد محترم کیا کرتے ہیں؟"

"میرے والد فوت ہو چکے ہیں اور والدہ میری پیدائش کے وقت انتقال کر گئی تھیں۔ میری ایک بڑی بہن ہیں، میں ان کے پاس رہتا ہوں۔ میرے والد ایک سرکاری محکمے میں اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ وہ محکمہ دیوالیہ ہو گیا تھا اور اسی صدمے میں ان کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ چل بسے، پھر آپی مجھے اپنے ساتھ لے آئیں۔"

"بیٹا پھر تو تمہارے والد بڑے آدمی ہوں گے۔" نگہت مسکرائیں۔

"جی آپ کا خیال درست ہے۔ والد کے قرض داروں نے ان کی تمام جائیداد، زمین، کیش سب کا بٹوارہ کر لیا۔ ہمارے حصے میں کچھ نہ آیا۔ آپی مجھے اپنے ساتھ لے آئیں۔ یہیں میں نے جاب کی اور پھر میں آپ کی انڈسٹری میں آ گیا۔" اس نے مسکرا کر عاجزی سے سر جھکا لیا۔

"اور تمہارے بہن، بہنوئی؟"

"میری آپی کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لیے بہنوئی نے دوسری شادی کر لی۔ آپی میرے ساتھ ہیں یہاں کوچنگ سینٹر کھول لیا ہے۔" یہاں آ کر اس کا انٹرویو ختم ہو گیا۔

"اوہ......" نگہت نے ہونٹ سکوڑے جیسے اس خبر نے انہیں مایوس کر دیا ہو۔ احسن کی ملاقات عاشی سے ایک پارٹی میں ہوئی تھی۔ اس نے اپنی سہیلیوں کو اپنی برتھ ڈے پارٹی دی تھی۔ وہ کچھ سامان گھر لے کر آیا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک بہت بڑا کیک تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھی تھی۔

وہ بہت حسین لگ رہی تھی، کیا آپ فوڈ کمپنی سے آئے ہیں؟" وہ کچھ جواب دینے والا ہی تھا کہ نگہت آ گئیں۔

"ارے عاشی بیٹا یہ تمہارے پاپا کے آفس میں نئے اپائنٹ ہوئے ہیں، ان کا نام احسن ہے۔"

اوہ آئی ایم ویری سوری۔ تشریف رکھیے۔" عاشی نے شرما کر، جھینپ کر کہا۔

"جی شکریہ۔ میں صرف یہ چیزیں پہنچانے آیا تھا اور آپ کے پاپا نے کہا ہے کہ وہ تھوڑا لیٹ آئیں گے۔" وہ جانے کے لیے مڑا۔

"چائے تو پی لیں۔" نگہت نے آگے بڑھ کر کہا۔

"سوری میڈم میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں۔" وہ سلام کر کے بے نیازی سے نکل گیا۔

یہ ان دونوں کی پہلی ملاقات تھی اور دونوں کے دل ایک ساتھ دھڑکے تھے۔ وہ چلا گیا تھا، مگر اپنی خوب صورت پرسنالٹی کا سحر اس پر چھوڑ گیا تھا۔ احسن کو وہ معصوم سی لڑکی بہت اچھی لگی تھی۔ اب اکثر شیر دل خان اس کو اپنے ساتھ گھر لانے لگے تھے۔ وہ ان کے ساتھ کمرے میں بیٹھ کر آفس کے معاملات ڈسکس کرتے اور وہ خود چائے پی کر چلا جاتا۔ ان دونوں میں مسکراہٹ کا تبادلہ ہو جاتا، پھر رفتہ رفتہ ان دونوں میں باتیں ہونے لگیں۔ خصوصاً نگہت اس کی بہت تعریف کرتی تھیں، وہ تھا بھی اسی قابل۔ آمنہ احسن کی آپی کے کوچنگ سینٹر میں ٹیوشن پڑھنے آئی تھی شاہین...... احسن کی بہن نے آمنہ کو اپنی بیٹی بنا لیا تھا۔ آمنہ کا کوئی بھائی نہیں تھا، اس نے احسن کو اپنا بھائی بنا لیا تھا۔ آمنہ سے ملنے کے لیے کبھی کبھی فرخ سینٹر آنے لگا تھا۔ اس کی احسن سے دوستی ہو گئی تھی۔ فرخ نے اپنا پرابلم احسن کو بتا دیا تھا کہ وہ آمنہ سے شادی کرنا چاہتا ہے، مگر والدین راضی نہیں۔ احسن نے مسکرا کر کہا۔

"یار مجھے تم جیسا لاکھوں میں ایک بہنوئی کہاں ملے گا۔ میں اپنی بہن اور دوست کی خاطر ہر طرح تعاون کو تیار ہوں، مگر تمہارے والد میرے پاس ہوتے ہیں۔ اس لیے میں کھل کر سامنے نہیں آ سکتا۔ صرف دعا ہی کر سکتا ہوں۔"

"ہاں میرے لیے دعائیں ہی کافی ہیں۔ اللہ اپنے بندوں کی دعائیں جلد سن لیتا ہے۔" فرخ نے کہا۔

اتنی دوستی ہونے کے بعد بھی احسن نے کبھی اس سے عاشی کا ذکر نہیں کیا تھا، حالانکہ کئی بار بات زبان پر آتے آتے رہ گئی، مگر احسن کو یہ خود غرضی لگی۔ اس نے جو کرنا ہے خود کرے گا۔ ایک بار عاشی آمنہ سے ملنے سینٹر آئی، اس نے وہاں احسن کو دیکھا۔ کیونکہ شاہین نے گھر میں ہی سینٹر کھولا ہوا تھا، اس کے لیے اس نے دو کمرے مخصوص کر لیے تھے۔ احسن بھی اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"آپ یہاں۔" احسن نے پوچھا۔

"جی ہاں میری آپی آمنہ یہاں ٹیوشن پڑھنے آتی ہے۔ میں نے سوچا گھر کے بجائے یہیں ان سے یہاں مل لوں۔"

"اوہ تو میری بہن سے ملنے آئی ہیں۔ چلو اسی بہانے سہی آپ سے ملاقات ہوگئی۔"

"آمنہ آپ کی بہن......؟" وہ حیرت سے بولی، تب ہی شاہین اور آمنہ آگئیں۔

"ارے عاشی تم۔" وہ دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔

"آپی میرا دل آپ سے ملنے کو چاہ رہا تھا۔ میں یہاں آگئی آپ سے ملنے کے لیے۔" آمنہ نے اسے پیار کیا، پھر شاہین آگے بڑھیں۔

"آمنہ سے میں نے آپ کا بہت ذکر سُنا ہے اور یہ بھی کہ آپ آمنہ کی تایازاد ہیں۔" وہ عاشی سے مخاطب تھیں۔

"دوسری بات یہ آمنہ میری منہ بولی بہن ہے اور اب لگتا ہے جیسے وہ میری ماں جائی بہن ہو۔" وہ مسکرائی۔

"اور آپی ایک اہم انکشاف تو رہ ہی گیا۔" احسن ہنسا تو وہ بھی ہنس پڑیں۔

"چلو جلدی بتاؤ۔"

"عاشی میرے باس شیر دل خان کی بیٹی ہیں، اس حوالے سے میرا بھی ان سے تھوڑا بہت تعلق ہے۔"

"صرف تھوڑا بہت؟" آمنہ نے شریر نگاہوں سے احسن کو دیکھا اور گھبرا کر شاہین کی طرف دیکھا تو انہوں نے اسے گلے سے لگالیا۔ عاشی کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ احسن باہر چلا گیا۔

شاہین نے مسکرا کر دیکھا اور عاشی کو بٹھا کر کہا۔

"تم دونوں باتیں کرو۔ میں چائے لا رہی ہوں۔" وہ چلی گئیں تو آمنہ نے عاشی سے پوچھا۔

"عاشی تم محمد احسن کو پسند کرتی ہو؟"

"پتا نہیں۔" وہ شرما گئی۔

"مگر مجھے سب معلوم ہے۔ عاشی میرا بھائی بہت اچھا ہے۔ بہت پیار دے گا تمہیں۔ تم اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لینا، اس کی محبت ردمت کرنا۔"

عاشی نے سر جھکالیا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ "عاشی شاہین آپی بہت اچھی اور محبت کرنے والی خاتون ہیں۔"

"ہاں مجھے اس کا اندازہ ہے، لیکن میرے گھر والے کبھی نہیں مانیں گے آپی۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو مگر احسن بھائی میدان چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ وہ تمہارے لیے سنجیدہ ہیں۔ وہ تمہارے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔"

پھر شاہین چائے لے آئیں اور تینوں نے بیٹھ کر چائے پی۔ انہوں نے اس سے پھر آنے کا وعدہ لے کر رخصت کر دیا اور یوں عاشی کو معلوم ہو گیا تھا کہ احسن آمنہ کا بھائی ہے اور اس کی وہ بدگمانیاں جو شاہین کے بتانے پر کہ آمنہ کو میں نے اپنی بیٹی بنا لیا ہے، اس کے دل میں پیدا ہوگئی تھیں، سب ختم ہوگئی تھیں۔

☆......☆

عبدالغفار خان کا انتقال ہو گیا تھا اور شیر دل خان نے مرتے ہوئے بھائی سے ان کی آخری

خواہش پوری کرنے کا وعدہ کیا تھا۔اس لیے مجبوراً آمنہ کی شادی فرخ سے کردی، مگر اس کے بعد ہونٹوں پر چپ کی مہر لگالی تھی اور خود باہر چلے گئے تھے۔جیسے پیچھے جو کچھ بھی ہوتا رہا، مگر وہ اس میں شامل نہیں تھے، یہ ان کی بھول تھی۔اس کا حساب تو ان کو یوم حشر کے دن دینا پڑے گا۔فرخ بہت اچھا اور صلح جو انسان تھا۔وہ آمنہ کی موت کو خاموشی سے سہہ گیا تھا اور چپ چاپ بشریٰ کو اپنی زندگی میں شامل کرلیا تھا، لیکن عاشی کے دل میں خنجر اتر گئے تھے۔بڑی پلاننگ سے آمنہ کو اس کے راستے سے ہٹا دیا گیا تھا اور آمنہ کی زندگی سے کھیلنے والے اس کے ماں باپ تھے۔یہ بات اس سے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔اس کی آنکھیں خون کے آنسو روتی تھیں۔

پھر وہ واقعہ رونما ہوا جس کی وجہ سے شیر دل خان نے احسن کو اپنی فرم سے نکال باہر کیا تھا۔اس کے بعد وہ کچھ ہوگیا تھا جس کے بارے میں عاشی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔آمنہ نے سچ کہا تھا کہ میرا بھائی میدان چھوڑنے والا نہیں مگر اب کیا ہوگا؟''

یہ سوال اس کے دل میں کچوکے لگا رہا تھا۔زمین وآسمان کا ملن تو ہوگیا تھا، مگر جو طوفان اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ اس کی طرف بڑھ رہا تھا اسے کون روکے گا؟''

وہ گریجویشن کرچکی تھی اور اب اظفر علی کی فیملی کو آنے سے کون روک سکتا تھا، پھر ایک اور دھماکا ہوا۔آصفہ کو نگہت بیگم شاپنگ سینٹر میں مل گئیں۔اس نے یہ موقع ہاتھ سے نہ گنوایا۔وہ ان کو ساتھ لیے Eating Area میں پہنچ گئی اور ایک طرف میں جاکر بیٹھ گئیں۔

''آنٹی اس وقت چائے کی بڑی طلب ہو رہی ہے، کیوں نہ ایک ایک کپ چائے پی لی جائے۔''

''جیتی رہو بیٹی مجھے بھی گھر سے نکلے ہوئے کافی دیر ہوگئی ہے۔اس وقت شدت سے چائے کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔'' آصفہ نے برگر اور چائے کا آرڈر دے دیا۔

''کیا کیا شاپنگ کرڈالی آنٹی۔'' آصفہ نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''کچھ سوٹ پیس اور اس کی میچنگ ہے۔اب ماشاء اللہ عاشی کا گریجویشن مکمل ہوگیا ہے۔فرخ کی طرف سے بھی فارغ ہوچکی ہوں۔اب عاشی کے فرض سے بھی فارغ ہونا چاہتی ہوں۔اس ہفتے سیٹھ اظفر علی کے گھر سے کچھ خواتین عاشی کو دیکھنے آرہی ہیں۔تمہارے انکل کے بزنس پارٹنر اور دوست کا بیٹا ہے افضل علی۔بہت عرصے سے پیچھے پڑے ہیں۔''

''اوہ۔'' آصفہ کے منہ سے نکلا۔اس عرصے میں دونوں چائے پی چکی تھیں۔

''ایک بات کہوں آنٹی۔'' آصفہ نے ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ہاں کہو اور تم تو عاشی کی سہیلی ہو، تم خود آجانا ان لوگوں سے بھی مل لینا۔''

''آنٹی جب بیٹی کا نکاح ہوجائے تو اسے زیادہ دیر گھر میں نہیں بٹھانا چاہیے۔آپ ان لوگوں سے معذرت کرلیں اور عاشی کی رخصتی کی تیاری کریں۔''

''کیا کہا تم نے...... کیا مطلب ہے تمہارا...... کیسا نکاح، کس کی رخصتی۔'' وہ گھبرا اٹھ کر کھڑی ہوئیں۔

''آپ کے لیے یہ خبر کسی دھماکے سے کم نہیں۔عاشی اور احسن نے کورٹ میرج کرلی ہے۔یہ کیوں ہوا؟؟ یہ آپ لوگوں سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔مجھ سے تو عاشی نے کہا تھا کہ میں آپ کو بتادوں کہ آپ اس کے لیے کچھ نہ سوچیں کہ اس نے اپنے راستے کا انتخاب کرلیا ہے۔''

یہ سُن کر وہ دھم سے کرسی پر گر گئیں۔ان کی سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔آصفہ نے پانی کا گلاس ان

کی طرف بڑھایا۔

"آنٹی اپنے آپ کو سنبھالیے، لوگ آپ کی طرف متوجہ ہورہے ہیں۔"

نگہت بیگم نے پانی کا گلاس منہ سے لگا کر ایک سانس میں خالی کردیا اور کھڑی ہوگئیں اور تیزی سے وہاں سے نکل گئیں۔ پیچھے پیچھے آصفہ آرہی تھی۔ ڈرائیور ان کا منتظر تھا۔ جلدی سے دروازہ کھول دیا اور وہ اندر بیٹھ گئیں۔ اس نے ان کو خدا حافظ کہا، لیکن انہوں نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔

☆......☆

آندھی طوفان کی طرح وہ گھر میں داخل ہوئیں۔ اس وقت عاشی اور عارفہ کے علاوہ گھر میں کوئی نہیں تھا۔

"عاشی اِدھر آؤ۔" وہ کمرے میں جا کر چیخیں۔ ان کا انداز جارحانہ تھا، دونوں گھبرا گئیں۔

"جی امی۔" عاشی بھاگ کر اندر پہنچی۔ اس کے پیچھے عارفہ تھی۔ مگر وہ دروازے پر ٹھٹک گئی۔ نگہت بیگم نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔

"آج مارکیٹ میں آصفہ سے میری ملاقات ہوئی تھی اور اس نے مجھے سب کچھ بتادیا۔ اب تم یہ بتاؤ کیا یہ سب سچ ہے؟ تم نے احسن سے کورٹ میرج کرلی اور ہمیں خبر بھی نہیں۔"

"جی امی یہ سچ ہے۔" عاشی نے اعتراف کرلیا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا؟...... بولو؟۔" اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے تھپڑوں کی بارش کردی۔ عارفہ چیختی ہوئی بہن کو بچانے دوڑی۔

"امی پلیز آپی کو نہ ماریں، چھوڑ دیں ان کو۔"

وہ رونے لگی تو انہوں نے اسے دھکا دیا۔

"ہٹ جاؤ، چلی جاؤ، دفع ہوجاؤ۔" ان کا ہاتھ پھر حرکت کرنے لگا۔ ان پر جنون سوار ہوگیا تھا، تب عاشی نے عارفہ کو آہستہ سے الگ کیا۔

نگہت بیگم بھی شاید تھک کر بیٹھ گئی تھیں۔ ان کی سانسیں پھول رہی تھیں اور وہ خونخوار نظروں سے دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔ عاشی اٹھی، اپنے بال پیچھے کیے۔ ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھے اور اپنی لہو ہوتی آنکھوں اور سرخ چہرے کے ساتھ سسکیوں کے درمیان بولی۔

"گھر میں جو کچھ آپ کرتی رہی ہیں۔ دفتر میں جو کچھ پاپا نے کیا۔ آپ سمجھتے ہیں کیا ہم بے خبر تھے؟ آپ نے جس طرح سلو پوائزن کے قطرے پلا پلا کر اور نشے کے انجکشن لگوا لگوا کر میری معصوم آپی اور جان سے عزیز بھابی اور اس کی نوزائیدہ بچی کو قتل کیا اور اپنا جرم چھپانے کے لیے کسی بے ضمیر ڈاکٹر سے جھوٹی رپورٹ تیار کروا کر ہم لوگوں کی عدم موجودگی میں اسے سپردِ خاک کردیا۔ ان سب باتوں سے ہم بے خبر نہ تھے، پھر جس پلاننگ سے پاپا نے سیٹھ اظفر علی کی دولت حاصل کرنے کے چکر میں احسن کو فرم سے نکال دیا۔ کیا یہ سب معمولی تھا۔ کیا اس نے میرا ہاتھ مانگ کر گناہِ کبیرہ کردیا جو پاپا نے اُن کو سزا دی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ میں اُن کو چاہتی ہوں اور پاپا جانتے تھے احسن میں وہ سب خوبیاں موجود ہیں جو فی زمانہ شادی کے لیے ایک اچھے نوجوان میں ہونی چاہئیں۔ امی میں کوئی منڈی میں بکنے والا جانور نہیں جو آپ اور پاپا زیادہ سے زیادہ بولی لگا کر اپنے مفاد کی خاطر مجھے افضل کے ہاتھوں بیچ دینا چاہتے تھے۔ میں آج کے دور کی پڑھی لکھی باشعور لڑکی ہوں، جو آنکھوں دیکھی مکھی نہیں نگل سکتی۔ اب آپ کا جی چاہے مار ڈالیں۔ مار دیجیے مجھے، ایک خون اور سہی۔"

روتے روتے عاشی نڈھال ہوگئی تھی۔ عارفہ نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے پانی پلایا۔

"آپی بس کریں، رو رو کر خود کو ہلکان کرلیا ہے اور کتنا روئیں گی۔"

نگہت کمرے سے چلی گئیں اور پھر گھن گرج کر طوفان ایک کے بعد ایک آتے رہے۔ شیر دل خان ننگی تلوار کی طرح اس کے سر پر سوار تھے۔ عارفہ باپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی رہی، روتی رہی۔

"خدا کے لیے پاپا آپی کو نہ ماریے گا، آپی مرجائیں گی۔"

"ایسی اولاد کا مرجانا ہی بہتر ہے جو ماں باپ کے چہرے پر کالک مل دے۔ احسن کو شوٹ کردوں گا۔ اس ذلیل، کمینے انسان کی ہمت کیسے ہوئی۔" غصے میں ان کے منہ سے کف نکل رہا تھا۔

"پاپا احسن کو شوٹ کرنے سے پہلے آپ مجھے گولی ماریں گے۔ اب وہ میرا شوہر ہے اور یہ اس نے میرے کہنے، میری خواہش پر کیا تھا۔ میں اس مقتل گاہ میں سانس نہیں لے سکتی تھی، جہاں جیتے جاگتے انسانوں کو اپنے مفاد کی خاطر قتل کردیا جاتا ہے۔

☆......☆

فرخ اور بشریٰ شمالی علاقہ جات ہنی مون منانے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ رات دونوں میاں بیوی میں جانے کیا پلاننگ ہوئی کہ ایک دم پانسہ پلٹ گیا۔ شیر دل خان جلدی آفس چلے گئے۔ عاشی تمام رات بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی اور سوچتی رہی احسن سے کیسے رابطہ کرے اور یہاں سے کیسے نکلے۔ صبح عارفہ نے بڑی مشکل سے عاشی کو حلیہ درست کرنے اور کچھ کھانے کے لیے تیار کیا۔

"آپی آپ فکر نہ کریں، میں کسی نہ کسی طرح احسن بھائی سے رابطہ کرلوں گی۔ آپ مجھے ان کا نمبر دے دیں۔"

عاشی نے پیار سے اس کے گال تھپتھپائے اور سر اثبات میں ہلاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ تیار ہوکر آئینے کے سامنے کھڑی ہوکر خود کو دیکھتی رہی۔ اس کے رخساروں پر تھپڑوں کے نشان باقی تھے۔ مسلسل روتے رہنے سے آنکھیں سوج گئی تھیں۔ اس نے بالوں میں برش کرکے چوٹی کے دو تین بل ڈال کر کھلا چھوڑ دیا۔ اتنے میں عارفہ ناشتا لے کر آگئی۔

"میرے لیے صرف چائے بنادو۔" عاشی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ یہ سوچ اس کے دل و ذہن پر چھائی ہوئی تھی کہ لڑکیاں کتنی کمزور، بے بس اور بے اختیار ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی حالات کی ستم گری سے وہ اپنے گھر اور چاہنے والوں کے درمیان اتنی غیر محفوظ ہوجاتی ہیں کہ اپنے آپ کو آنے والی گرم ہواؤں سے بھی نہیں بچاپاتیں۔

"کیا سوچ رہی ہیں۔ آپ نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔ خالی چائے نقصان دے گی، ایک سلائس لے لیں۔" عارفہ نے ایک توس پر جام لگا کر اس کی طرف بڑھایا۔

"عارفہ تم صرف نقصان کی بات کررہی ہو میں تو پوری کی پوری آگ میں گھر گئی ہوں، بچنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا۔"

"آپی پریشان نہ ہوں راستے خود بخود سمٹ جائیں گے اور منزل پر پہنچا کر ہی دم لیں گے۔" وہ زبردستی توس اس کے ہاتھ میں دے کر چائے نکالنے لگی۔ وہ چھوٹے چھوٹے لقمے لینے لگی۔

احسن آپ نے مجھے کس دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے، جس کی کوئی منزل نہیں، وہ تصور میں احسن سے شکوہ کرنے لگی۔ توس کھانے کے بعد اس نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگالیا، تو عارفہ نے ایک اور سلائس اس کی طرف بڑھایا۔

"پلیز آپی ایک میری خاطر پھر بس۔" عارفہ کی آنکھوں میں التجا تھی اور مجبوراً اسے کھانا پڑا، پھر انڈا بھی کھا ہی لیا۔

"شاباش میری آپی کتنی اچھی ہیں۔" عارفہ نے مسکرا کر چائے کا کپ لبوں سے لگالیا۔ کچھ دیر ہی

گزری تھی کہ نگہت بیگم اندر آ گئیں۔ عاشی نے نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ آ کر ایک دم بیٹی سے لپٹ کر رونے لگیں۔

"مجھے معاف کر دو میری جان۔ میں نے غصے میں تمہارے ساتھ بہت غلط کیا اور اب ہم نے فیصلہ کیا ہے جو ہونا تھا وہ ہو چکا، اب واویلا کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس لیے احسن کے گھر والوں کو اطلاع بھجوا دیں کہ آ کر اپنی بہو کو رخصت کرا لیں، جو تاریخ وہ کہیں گے ہم رکھ لیں گے۔"

عاشی نے غور سے ماں کے چہرے کو دیکھا جیسے وہ ان کی باتوں کی تصدیق چاہ رہی ہو۔ نگہت شرمندہ ہو گئیں۔

"نہ میری جان، تیرے پاپا بھی بہت شرمندہ ہیں کہ میں نے اپنی پھول سی بچی پر ہاتھ اٹھایا۔" وہ بے تحاشا اس کے گال چومنے لگیں، مگر عاشی کو ان کی کسی بات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔

وہ اپنے اور احسن کے اطراف ایک اَن دیکھا جال بنتے دیکھ رہی تھی۔

☆......☆

گھر میں عاشی کی رخصتی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اسے سُنانے کے لیے شیر دل خان کہتے۔ "میں نے عاشی کے لیے ایک بنگلہ الاٹ کر دیا ہے اور احسن کے لیے ایک آفس الگ سے بنا دوں گا۔ میں ان کو ہر آسائش دوں گا، جس سے میری بیٹی اور داماد کو شکایت نہیں ہوگی۔ مجھے ہر وہ چیز عزیز ہے جو میری بیٹی کو عزیز ہو۔"

اسی قسم کی باتیں اُسے سُنائی جاتیں تاکہ وہ مطمئن ہو جائے۔ ادھر نگہت کہتیں۔

"عاشی بیٹا جیولرز کے ہاں چلو اپنی پسند کے زیورات لے لو، شاپنگ خود کروانی اور احسن کی۔"

مگر اس نے انکار کر دیا۔ "آپ خود خرید لیں۔"

"تم چلو عارفہ۔" نگہت نے چھوٹی بیٹی کو کہا۔

"نہیں امی میں آپی کے پاس رہوں گی آپ جائیں۔"

پھر نئے ڈیزائن کے ڈائمنڈ کے سیٹ، جدید فیشن کے سوٹ اور میچنگ کی چیزیں آتیں اور اسے خاص طور سے دکھائی جاتیں۔ وہ بے دلی سے دیکھتی تب اس کا دل خون کے آنسو روتا۔ کاش ان باتوں میں سچائی ہوتی دکھاوا نہ ہوتا۔ اپنی جھوٹی انا اور ہوس کی ملمع سازی نہ ہوتی۔ نگہت کے جانے کے بعد عاشی نے عارفہ کو نمبر دیے۔ ایک احسن کا دوسرا اپنی ایک شناسا دوست افشاں کا۔

"احسن کو پورا واقعہ بتانا اور کہنا آپی بہت پریشان ہیں اور پتا لگا کہ تجدید تعلقات کا اب کون سا نیا ڈراما اسٹیج کیا جا رہا ہے اور اس میں کس کا کیا کردار ہے؟ اور افشاں کو فون پر اپنا تعارف کرا دینا کہ تم میری بہن ہو عارفہ اور اس کو کہنا آپی نے آپ کو فوراً بلایا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ مت بتانا۔"

عارفہ نمبرز لے کر چلی گئی۔ نگہت کا پروگرام سارے دن کا تھا۔ عاشی کو اطمینان تھا کہ وہ افشاں سے ملنے کے بعد ہی آئے گی اور اس کا خیال درست نکلا۔ افشاں فوراً آ گئی۔ افشاں نے اسے خود سے لپٹا لیا تھا۔

عارفہ اسے نوکروں کی نظروں سے بچاتی ہوئی لے گئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر روتے ہوئے بولی۔

"میں بہت پریشان ہوں۔ جنم دینے والے والدین نے میرے راستے میں کانٹے بوئے ہیں۔ اپنے مفاد کی خاطر وہ مجھے زندہ دفن کر سکتے ہیں۔"

"ہاں عاشی آج کے دور میں ہر چیز داؤ پر لگ جاتی ہے، خواہ وہ اولاد ہی کیوں نہ ہو یا ماں باپ ہوں۔ پہلے میں جرم و سزا کو محض ایک انتقامی

کارروائی سمجھتی تھی، مگر ایسا کچھ نہیں۔ دنیا ناانصافیوں اور جرم وسزا کا گڑھ بن گئی ہے۔ سچے اور مخلص لوگ بھی ان کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ نہیں۔ تم فکر نہ کرو میں تمہاری پوری مدد کروں گی، مگر راز داری شرط ہے۔ اپنا پروگرام بتاؤ۔''

''احسن پاکستان میں نہیں رہنا چاہتا۔ جب سے پاپا نے اسے فرم سے نکالا ہے، وہ بہت بددل ہوگیا ہے۔ کہتا ہے اپنی صلاحیتوں کو باہر جاکر آزماؤں گا۔''

''ٹھیک ہے تم اس کا پتا اور نمبر دو۔ میں اس سے خود بات کرتی ہوں۔''

وہ عاشی سے نمبر اور پتا لے کر چلی گئی اور عاشی کو تسلی دے گئی تھی۔

☆......☆

ماحول بڑا پُراسرار سا ہوگیا تھا۔ گھر کا ہر فرد چوکنا ہوگیا تھا۔ دبے ہوئے اس طوفان کی آہٹیں سماعتوں کو گنگ کیے دے رہی تھیں۔ عارفہ بہن کا پورا پورا ساتھ دے رہی تھی۔ اس نے احسن سے بھی بات کرلی تھی۔ اس کو سارے حالات سے آگاہ کردیا تھا۔ اس نے عارفہ سے کہا۔ اپنی آپی سے کہنا پریشان نہ ہو۔ افشاں سے میری ملاقات ہوچکی ہے۔

ایک ہفتہ قبل شاہین اپنی کولیگ کے ہمراہ عاشی کی رخصتی کی تاریخ لینے آئی تھیں۔ شیر دل خان نے اپنے ملازم کے ہاتھ پیغام بھیجا تھا کہ آکر بیٹی کی رخصتی لے جائیں۔ ہم نے احسن کی غلطیوں اور بے وقوفیوں کو معاف کردیا ہے اور اس کی سابقہ سروس بھی بحال کردی ہے۔ شاہین نے مسکرا کر کہا۔

''لو احسن تمہارے سسر نے تمہیں معاف کردیا ہے اور رخصتی کی اجازت دے دی ہے۔ تم خوامخواہ ان کی طرف سے بدگمان تھے۔''

''نہیں آپی یہ ٹوپی ڈراما ہے۔ میں ان کے ہتھکنڈوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔''

''چلو ڈراما ہی سہی، بہرحال مجھے جانا ہے۔''

''ضرور جایئے آپ کو جانا بھی چاہیے۔ میرا کام آسان ہوجائے گا۔''

وہ جاکر رخصتی کی تاریخ لے آئی تھیں اور عاشی کو گلے سے لگا کر تسلی دی تھی کہ ''گھبرانا نہیں۔''

وہ مٹھائی کے ہمراہ تاریخ لینے گئی تھیں اور پھر چائے پی کر واپس آگئی تھیں۔ نگہت نے بھی اپنے کچھ خاص لوگوں کو مدعو کیا تھا۔

☆......☆

اور بالآخر رخصتی کا دن آگیا۔ عاشی ڈرائیور کے ساتھ پارلر تیار ہونے کے لیے چلی گئی تھی اور شیر دل خان نے اپنی کارروائی پوری کرلی تھی۔ وہ اپنی شیطانی فطرت سے باز آسکتا تھا بھلا؟؟ انہوں نے کوٹھی کے چاروں اطراف اور دولہا کے اسٹیج کے پیچھے سادہ کپڑوں میں مسلح آدمی کھڑے کردیے تھے۔

عارفہ نے یہ صورت حال دیکھی تو پریشان ہوگئی۔

''یا اللہ یہ سب کیا ہورہا ہے میری آپی کے ساتھ؟''

عارفہ نے جب یہ دیکھا تو اس نے امی سے پارلر کا نمبر مانگا مگر انہوں نے ڈانٹ دیا۔ وہ ڈرائیور کی طرف گئی کہ اس کے ساتھ پارلر چلی جائے۔ اس نے مہندی لگوانے کا بہانہ بنایا تھا مگر وہ کامیاب نہ ہوسکی۔ نگہت بیگم نے سختی سے کہا کہ اگر گھر سے قدم نکالا تو اچھا نہیں ہوگا۔ وہ سہم کر بیٹھ گئی، پھر وہ اِدھر اُدھر ٹہلتی ہوئی کھڑکی میں کھڑی ہوگئی اور اتنے میں شیر دل خان گھبرائے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

''ابھی تک بارات کیوں نہیں آئی۔ وقت نکلا جارہا

ہے۔ عاشی کہاں ہے؟'' انہوں نے دھاڑ کر کہا۔

نگہت پریشان ہوگئیں۔ ''عاشی پارلر گئی ہے، مگر تین گھنٹے سے زیادہ ہو گئے ہیں، نہیں آئی۔ آپ کسی کو بھیج کر بارات کا پتا کرائیں، میں پارلر فون کر کے معلوم کرتی ہوں۔'' وہ فون کی طرف لپکیں۔ عارفہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور شیر دل خان کے مسلح بندوں نے اپنی رائفلیں سیدھی کر لی تھیں۔

لیکن وہ ''H.B'' بیوٹی پارلر کا نمبر نہیں تھا۔ ان کو غلط نمبر دیا گیا تھا۔ انہوں نے اس سے H.B پارلر کا نمبر مانگا لیکن جواب دیے بغیر فون بند کر دیا گیا۔ وہ فون بند کر کے گیٹ کی طرف دوڑیں اور ڈرائیور سے پوچھا۔

''تم عاشی بی بی کو کہاں لے کر گئے تھے۔ تمہارے ساتھ کون کون تھا؟'' انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔

''آپ نے جو پتا دیا تھا ہم نے انہیں وہاں پہنچا دیا تھا۔ چھوٹی بی بی کی کوئی سہیلی ساتھ تھیں اور متو تھا۔''

''متو کو بلاؤ۔''

''تم بی بی کو کہاں چھوڑ کر آئے تھے؟''

''جہاں کا آپ نے پتا دیا تھا بیگم صاحبہ۔''

''وہ پتا کہاں ہے مجھے دکھاؤ۔''

''وہ تو بی بی نے اپنے پرس میں رکھ لیا تھا۔''

نگہت کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ وہ اپنا پرس لے کر آئیں اور ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کا کہتے ہوئے کہا۔

''مجھے وہاں لے کر چلو جہاں بی بی کو اُتار کر آئے تھے۔'' ساتھ میں انہوں نے متو کو بھی بٹھا لیا۔

کچھ دیر بعد گاڑی ایک بلڈنگ کے سامنے رک گئی۔ سامنے بلڈنگ پر لگے ہوئے بورڈوں کو انہوں نے پڑھنا شروع کر دیا۔ کہیں بھی کسی بھی بورڈ پر بیوٹی پارلر کا نام نہیں تھا۔ وہ ناکام ہو کر واپس آگئیں۔ گھر آئیں تو شیر دل خان غصے میں ٹہل رہے تھے۔

''خیریت تو ہے۔'' نگہت نے قریب آ کر پوچھا۔

''اس گھر میں اب خیریت کہاں۔ شاہین کے کوچنگ سینٹر میں تالا پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنا گھر فروخت کر دیا تھا، وہ کہیں چلے گئے تھے۔ کہاں گئے کچھ پتا نہیں۔ عاشی ابھی تک نہیں آئی اور نہ ہی پارلر کا پتا معلوم ہوا۔''

''آخر اسے کہاں پہنچایا گیا تھا۔'' شیر دل خان دھاڑے۔

''اس بلڈنگ میں بیوٹی پارلر نہیں تھا۔'' انہوں نے روتے ہوئے انکشاف کیا۔

''نگہت ہم لٹ گئے، برباد ہو گئے۔ ہمارے ساتھ زبردست دھوکا ہوا ہے۔'' شیر دل خان غصے میں دھاڑے تھے۔ نوکر چاکر اور ان کے مسلح کرائے کے قاتل تھر تھر کانپ رہے تھے۔ عارفہ زار و قطار رو رہی تھی۔ نگہت اسے خونی نظروں سے دیکھتی ہوئی چلی گئیں۔ وہ بیوی پر چڑھ دوڑے۔

''تم کیسی ماں تھیں کہ تم نے بغیر تحقیق کے اپنی بیٹی کو ایک اجنبی لڑکی کے ساتھ دلہن بنانے بھیج دیا اور ساتھ میں لاکھوں کا زیور اور عروسی جوڑا بھی حوالے کر دیا، یقیناً عاشی نے ہماری باتیں سُن لی ہوں گی۔ اسی لیے ساری بساط اُلٹ گئی اور عارفہ روتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ جو گڑھا آپ نے اپنی اولاد کے لیے کھودا تھا پاپا۔ وہ اس کے لیے نہیں آپ کے لیے تھا، صرف آپ کے لیے۔''

☆......☆

''یہ اپنی نوعیت کی دلچسپ خبر تھی کہ پارلر سے دلہن اور بارات سے دولہا غائب ہو گیا اور کچھ ہی دیر میں احسن اور عاشی کا جہاز لندن کے ایئر پورٹ پر لینڈ کرنے والا ہوگا۔''

☆......☆

افسانہ

شمع حفیظ

پہلی عورت، آخری مرد

یہ شرم کی نہیں، فکر کی بات ہے اماں۔ جو کچھ اُس کے دل میں ہے، اس کی بڑی بڑی گندی آنکھیں مجھے وہ ساری کہانی سناتی ہیں۔ سخت وحشت ہے مجھے اس کی بولتی آنکھوں سے۔ ایسے دیکھتا ہے جیسے دیدوں میں آر پار دیکھنے والی مشین فٹ ہو۔ قسم سے بڑی ننگی بھوکی......

اُس دوشیزہ کا فسانۂ خاص، جو عزت پر قربان ہوگئی

زرد رنگت اور چہرے پر ہوائیاں لیے وہ آندھی کی رفتار سے گھر میں آئی تھی۔ بیرونی دروازے کو اُس نے اس شدت کا جھٹکا دے کر کھولا کہ اندر بیٹھی عنایت بی بی خود بخود اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بیٹی کو بے اوسان آتے دیکھا تو لپکتے قدموں سے قریب چلی آئی۔

''کیا ہوا زیتون! سب ٹھیک ہے نا؟''

''کیا ٹھیک ہے اماں؟'' زیتون صحن میں بچھی چارپائی پر ڈھے گئی۔ اشک از خود رستہ بنا کر رخساروں پر بہہ نکلے تھے۔

''لاکھ بار کہا ہے مجھے باہر کے کاموں پر نہ لگا لیکن تیرے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اللہ قسم، آج بال بال بچ کے آئی ہوں۔ وہ بیچ راستے میں کھڑا تاڑ رہا تھا مجھے۔ مردود نے آج پھر میرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی ہے۔''

''ہائے میں مر جاواں......'' عنایت بی بی دل تھام کر رہ گئی۔ ''کتنا کمینہ ہے ابرار بھی، کلا تھا یا کوئی اور بھی تھا اُس کے ساتھ؟''

''اونہہ! کلا ہی ہوتا ہے وہ، اور کس کے ساتھ ہونا تھا۔ یار دوست اس کی بدمعاشی پر کب کا چھوڑ بیٹھے ہیں اُسے۔'' وہ اب بھی کپکپا رہی تھی۔ پورا بدن جیسے پسینے میں شرابور تھا۔

''نامراد نہ ہووے تے۔'' عنایت بی بی کی بڑبڑاہٹ جاری تھی۔ ''حرام خور نے ناک میں دم کر کے رکھا ہے، آخر کس کے پاس جا کر اس کی شکایت کروں۔''

''شکایت تو کرنی ہوگی اس کی اماں! بس بہت ہوگیا اور کتنی بار بچا کر لاؤں گی خود کو...... اگر کسی دن تنہا پا کر اس نے مجھے کچھ کر دیا تو۔''

''ہائے رب نہ کرے۔'' عنایت بی بی نے بڑھ کر بیٹی کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

''بے سوچے سمجھے کیوں اول فول بولے جاتی ہے لڑکی، ابھی اتنا اندھیر نہیں مچا جو ٹھنک رہی ہے۔''

''اور کیسے مچے کا اندھیر...... دس بار اپنا رشتہ بھیج

چکا ہے، ہمارے انکار پر اب ستانے کو تل گیا ہے۔ بیچ راہ میں کبھی ہاتھ پکڑتا ہے، کبھی اونچی آواز میں لچر گانے گاتا ہے۔ دیکھ اماں! اب تُو نے اس کی خبر نہ لی تو سچ کہتی ہوں، یہ گھر چھوڑ کر کسی دارالامان میں جا بیٹھوں گی۔" وہ اب چہرے پر بہتا پسینہ اور آنسو ایک ساتھ پونچھ رہی تھی۔ عنایت بی بی نے آگے ہوکر اسے بانہوں میں بھرلیا۔

"فکر کیوں کرتی ہے دھی رانی! وہ تیرا بال بھی بیکا نہ کرسکے گا۔ میں ہوں نا تیرے ساتھ۔" زیتون

ہوکر دیوار سے ٹک گئی۔

"یہ شرم کی نہیں، فکر کی بات ہے اماں۔ جو کچھ اُس کے دل میں ہے، اس کی بڑی بڑی گندی آنکھیں مجھے وہ ساری کہانی سناتی ہیں۔ سخت وحشت ہے مجھے اس کی بولتی آنکھوں سے۔ ایسے دیکھتا ہے جیسے دیدوں میں آر پار دیکھنے والی مشین فٹ ہو۔ قسم سے بڑی ننگی بھوکی آنکھیں ہیں اس کمی کمین کی، میرا تو دل متلانے لگتا ہے۔ پر سُن لے اماں، تُو نے اس کے دباؤ میں آکر یا محلے والوں کے

نے ماں کے سینے میں منہ چھپالیا۔ کچھ دیر اضطراری حالت کے ساتھ یونہی بیٹھی رہی پھر گھٹی آواز سے بولی۔

"تیرا ساتھ ہی تو ہے اماں جواب تک اس کی لگام کھینچی ہے، ورنہ کسی دن کوئی رعایت دیے بغیر مجھے چیڑ پھاڑ کر کھا گیا تو کچھ نہ بچے گا۔"

"ہائے اللہ! کیسی فضول باتیں کررہی ہے زیتون! شرم نہیں آتی تجھے۔" عنایت بی بی نے ناگواری کے ساتھ یکدم اسے پرے کردیا۔ وہ پیچھے

ڈر سے میرا ہاتھ اس کے ہاتھ تھمانے کی کوشش کی تو یاد رکھنا میں زہر پھانک کے......" عنایت بی بی نے دہل کر اس کی بات کاٹ دی۔

"ارے باؤلی ہوگئی ہے کیا؟ میں جانتے بوجھتے تجھے جہنم میں دھکیلوں گی؟ مجھے پتا ہے بہت مالدار ہے وہ۔ پھلوں کا کاروبار کرتا ہے۔ بہت سارے ٹرک اور ٹرالر ہیں اس کے پاس...... پر مینوں کی...... ہے تو گندی فطرت والا ایک عیاش آدمی۔ غریبوں

کے محلے میں پرائی کُڑیوں کو تاکنے آتا ہے۔ شراب بھی پیتا ہے اور کبھی کبھار میں نے جوا بھی کھیلتے دیکھا ہے اسے نکڑ پر شاہو کی دوکان کے تھڑے پر۔ ہزاروں کی بازی لگتی ہے وہاں۔ اور ہزاروں جیت کر اٹھتا ہے وہ وہاں سے۔"

"تو......؟" زیتون نے ماتھے پر بل ڈال کر ماں کو گھورا۔ "ہزاروں کی بازی جیتنے والے کو کوئی اپنی دھی دے دے گا؟"

"آئے ہائے، یہ کب کہا میں نے؟" عنایت بی بی نے غصے سے سر جھٹکا۔ "میں تیرے اندیشوں کی بات کر رہی ہوں زیتون۔ تُو میری بڑی سوہنی دھی ہے، تُو نہ ڈرا کر اس بدبخت سے، تیرے لیے میں کوئی شہزادہ ڈھونڈوں گی۔ وہ لاکھ واری رشتہ بھیجے پر یہاں کون آس لگائے بیٹھا ہے۔ ویسے بھی تجھے اس ابرار کے ہاتھ سونپنے سے بہتر ہے میں آپ ہی تیرا گلا دبا دوں۔ مار ڈالوں اپنے ہاتھوں سے اور یاد رکھ، وہ اس دنیا کا آخری مرد بھی ہوا نا، تب بھی اُس کمینے سے تیرا بیاہ نہ کروں گی۔ یہ وعدہ ہے تیری اماں کا۔"

"مجھے تیرے وعدے پہ بھروسا ہے اماں لیکن سچی بتاؤں! بہت ڈر لگتا ہے مجھے اس بندے سے۔ گھر سے نکلوں تو اچانک کہیں نہ کہیں سے نکل کر سامنے آجاتا ہے۔ اسے دیکھتے ہی میرے ہتھ پیروں سے جان نکل جاتی ہے۔ تجھے رب کا واسطہ ہے اماں، مجھے باہر کے کاموں سے معاف کر دے۔ خود لایا کر سارا سودا سلف یا فیر محلے کے کسی بچے کو رکھ لے اس کام کے لے۔" عنایت بی بی کی آہ نکل گئی۔

"ہائے زیتون، تیرے باپ کے مرنے کے بعد بھلا کس نے جھانکا ہے اس گھر میں۔ کون ہے جس نے ہم ماں بیٹی کے دکھ بٹائے ہوں۔ اب تُو ہی بتا کس بچے کو کہوں اس گھر کے کام کے لیے، وہ نوکر تھوڑا ہی ہے ہمارا۔ پھر کچھ کہہ دو تو ماں باپ بھی بہت بُرا مناتے ہیں آج کل۔ کہہ کر دیکھ کسی بچے کو کوئی کام، فوراً منائی کرا دیتے ہیں۔ کیا کروں دھی رانی، اگر میں گٹھیا کی مریضہ نہ ہوتی تو آپ جا کر سارے کام کر آتی، پر تُو جانتی ہے یہ تیری ماں کی مجبوری ہے۔"

"ہاں اماں، یہی تو مجبوری ہے۔" زیتون نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "میرا گھر سے نکلے بغیر چارہ کہاں ہے۔"

"ہاں، ٹھیک کہتی ہے تُو، ساری مشکل بس عورت ذات کے لیے ہے۔ کہنے کو اللہ نے عورت کو پردے والی چیز بنایا ہے مگر جتنا وہ چھپتی ہے اتنا ہی آشکار ہوتی جاتی ہے۔ مرد کا تجسس عورت کو چھپنے کہاں دیتا ہے زیتون۔ کہیں نہ کہیں اپنے آگے کھینچ لاتا ہے۔ اب یہ سچی بات میں تجھے کیسے سمجھاؤں۔" عنایت بی بی کی بڑبڑاہٹ جاری تھی۔ زیتون نے بے دلی سے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ کر آنکھیں موند لیں، وہ سخت بددل تھی۔

☆......☆......☆

تفکرات کی ماری عنایت بی بی کو زیتون کی فکر لگ گئی تھی۔ اس نے محلے کی دو چار عورتوں کو زیتون کی بات چلانے کے لیے کہا تھا، کوئی اچھا رشتہ مل جاتا تو اُسے ہی غنیمت جان کے بیٹی کے ہاتھ پیلے کر دیتی، اور اس سے پہلے کوئی معقول رشتہ عنایت بی بی کی دہلیز تک پہنچتا، ابرار سُن گن لے کر خود ہی اِدھر چلا آیا تھا۔ گھر کا دروازہ چوپٹ کھلا پا کر کسی دستک کے بغیر اندر جانے کی ٹھانی اور سیدھا کمرے میں سلائی مشین پر جھکی عنایت بی بی کے مقابل جا بیٹھا۔ دوسراہٹ کا احساس پاتے ہی کپڑے سیتی عنایت بی بی نے سر اٹھا کر دیکھا تو جیسے دہل کر اچھل پڑی۔ ایک لمبے چوڑے نوجوان مرد کو یوں اچانک اپنے قریب دیکھنا شاید اس کی سوچ سے بھی پرے

تھا۔ زیتون ابھی کچھ دیر پہلے ہی گڈو کی ماں کے ساتھ بازار کے لیے نکلی تھی اسی لیے گھر کا دروازہ کھلا رہ گیا تھا اور اس کھلے دروازے سے ابرار دبے پاؤں چوروں کی طرح اندر چلا آیا تھا۔ ابرار نے مسکراتی آنکھوں سے عنایت بی بی کے سراسیمگی میں ڈوبے وجود کو دیکھا، تو دانستہ ہولے سے کھنکھارا تھا۔ عنایت بی بی کو جانے کیوں ڈر سا لگا، حواس باختہ سی ہو کر بولی۔

''تُو، تُو اِدھر کیا کرنے آیا ہے؟'' ابرار کھل کر دوبارہ مسکرایا پھر عنایت بی بی کی پھیلی آنکھوں میں جھانک کر بے باکی سے بولا۔

''رشتہ ڈھونڈ رہی ہے اپنی دھی رانی کے لیے۔ بھلا میرے ہوتے تجھے کسی رشتے کی کیا حاجت پڑ گئی اماں؟''

''بکواس نہ کر۔'' عنایت بی بی نے کلس کر اُسے ڈپٹا۔ ''میں کہہ چکی ہوں تیری شادی نہیں ہو سکتی زیتون کے ساتھ۔''

''کیوں؟'' اس نے بھنویں اچکائیں۔ ''کیا میں مرد کا بچہ نہیں ہوں۔''

''تُو بے غیرت کا بچہ ہے ابرار۔ آخر ہمارا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتا۔ کیوں ہاتھ دھو کے پڑ گیا ہے میری دھی کے پیچھے؟''

''ہاتھ دھو کے نہیں، دل ہار کے پڑا ہوں اس کے پیچھے۔ سچ کہتا ہوں اماں! زیتون میری زندگی کی پہلی عورت ہے جسے دل نے اپنا مانا ہے۔ تُو میری محبت کا مذاق نہ اڑایا کر۔ چل آج مان جا اور رخصت کر دے اُسے میرے ساتھ۔''

''کیوں؟ کیا مجھے شریف زادوں کا کال پڑ گیا ہے جو زیتون کو تیرے سنگ وداع کروں۔''

''ارے نہیں اماں۔'' وہ تھوڑا آگے جھک آیا۔ ''تُو سمجھی نہیں۔ میں بھی تھوڑا بہت عزت دار ہوں۔ تیری زیتون کو سر آنکھوں پر بٹھا کے رکھوں گا۔ اسے اپنے گھر کی رانی بنا کر نہ رکھا تو بے شک آ کر تھوک دینا مجھ پر۔ تُو جانتی ہے پھلوں کا بیوپاری ہوں۔ صرف دھیلہ پیسہ نہیں ہزاروں کی آمدنی ہوتی ہے ہر روز۔ تُو شادی کی حامی بھر لے تو سونے کی بالیاں لا کر دوں گا اور زیتون کو ہیرے کی انگوٹھی۔ میں خرید چکا ہوں انگوٹھی۔ نازک سے چھلے کے اوپر جگر مگر کرتا لال ہیرا ہے۔ تُو دیکھے گی تو آنکھیں چمک سے چندھیا جائیں گی۔''

''ہونہہ شودا نہ ہو تو۔'' عنایت بی بی نے کھا جانے والی نظروں سے اُسے گھورا مگر اس کا راگ بند نہ ہوا۔

''یقین کر لے اماں، بہت خوبصورت انگوٹھی پسند کی ہے میں نے زیتون کے لیے۔ وہ خوش ہو جائے گی پہن کے۔ رانی بنا کے رکھوں گا اپنے گھر کی۔ اور رانی ہیرے جواہر ہی تو پہنتی ہے۔''

''ہونہہ!'' عنایت بی بی نے تمسخر سے سر جھٹکا۔ ''رانی کو رانی بنا کے رکھے گا تو کون سا تیر مارے گا ابرار۔ میری دھی میرے گھر کی رانی ہے اور میں کسی شریف بندے سے اسے بیاہوں گی۔ تجھ جیسے آوارہ گرد سے نہیں۔''

''لو کر لو گل، میں کہاں آوارہ گرد ہو گیا اماں۔ دیکھ زیادتی نہ کیا کر میرے ساتھ۔ اس نے لگی لپٹی کے بغیر اپنا کچا چٹھا کھول کے بیان کیا تو عنایت بی بی سٹ پٹا کے بولی۔

''کمینہ نہ ہووے تے۔ میں تیرے لیے ماں جیسی ہوں، پھر بھی تجھے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔ دیکھ ابرار، جانتے بوجھتے میں زیتون کو اندھی کھائی میں نہیں دھکیلوں گی۔ چل اُٹھ، کام کر اپنا جا کے۔ یہاں تیری دال گلنے والی نہیں۔''

''دال نہیں گلے گی تو میں آپ ہی کچھ کر لوں گا اماں، پھر کوئی گلہ نہ کرنا، سمجھی کہ نہیں؟'' اس کا انداز دھمکی دینے جیسا تھا۔ عنایت بی بی کا دل پہلو میں دھڑ

دھڑانے لگا، ہڑ بڑا کر بولی۔

"مطلب کیا ہے تیرا، کیا کرے گا تُو؟"

"میں کیا کروں گا اماں! یہ تو پتا نہیں پر اتنا یاد رکھ، محبت کرتا ہوں تیری زیتون سے، بڑی اندھی محبت، اور یہ بات میں کہہ چکا ہوں، تیری دھی پہلی عورت ہے جو میرے دل میں آپو آپ اُتر گئی ہے۔ اسے پہلا ہی رہنے دے۔"

"اونہہ! زیتون پہلی ہے نا دوجی۔ تُو بس اپنا رستہ ناپ۔" عنایت بی بی کا لہجہ تضحیک آمیز تھا۔ وہ جیسے تڑپ اٹھا، رسان سے بولا۔

"وہ میرے لیے پہلی ہی رہے گی اماں، دوجی سوتن ہوتی ہے یا خریدی ہوئی کوئی عورت...... میری محبت کو ذلیل نہ کر، چل اب راضی ہو جا فٹافٹ، داماد بنا لے گی تو اپنا بھلا آپ کرے گی۔"

"ارے جا، شکل دھو جا کے اپنی۔" وہ زہر خند سے بولی۔ "میرے آگے محبت کا ترانہ نہ پڑھ۔ محبت سراب ہوا کرتی ہے ابرار، اس کے پیچھے نہ بھاگ۔"

"بھاگوں گا نہیں اماں، بھگا لے جاؤں گا اپنی محبت کو۔ پھر روتی رہنا سر پکڑ کے اپنا۔" وہ بولا بھی تو کیا۔ عنایت بی بی دھک رہ گئی، ہراساں ہو کر بولی۔

"کیا کہا تُو نے؟ دھمکی دے رہا ہے مجھے؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "سیدھے سبھاؤ رشتہ دے رہا ہوں اپنا۔ قبول کرلے گی تو تیرے ساتھ زیتون بھی عمر بھر فائدے میں رہے گی۔"

"ارے جا جا، ہمیں نہیں چاہیے تیرا فائدہ۔ آگ لگے تیری جوانی اور محبت کو۔ مت بھول ابرار، محبت کے آگے ہار جانا آسان اور اسے ہرا دینا بہت مشکل ہے اور یہ مشکل کام میں کروں گی۔ زیتون کو کسی دوسرے سے بیاہ کر ہرا دوں گی تجھے۔ میں نے وعدہ کیا ہے زیتون سے کہ تُو اِس دنیا کا آخری مرد بھی ہوا نا تو اس کی شادی تیرے ساتھ ہرگز نہیں ہوگی۔ یہ بات آج ذرا اچھی طرح اپنے پلے باندھ لے تاکہ تیری اوچھی محبت کو قرار آئے۔" عنایت بی بی نے فیصلہ سنا دیا تھا۔ وہ کچھ دیر ساکت و جامد کھڑا اسے گھورتا رہا پھر یکدم زور سے ہنس پڑا۔ اس کے جامنی ہونٹوں کے بیچ چٹے سفید دانت جیسے بجلی بن کر چمکے تھے۔

"چل ٹھیک ہے اماں۔ اگر ایسا ہے تو دیکھ لینا محبت اپنا رستہ خود بنا لے گی۔ تُو بڈھی ہوگئی پر یہ بات اب تلک نہ سمجھی کہ زندگی کے سارے رستے سیدھے نہیں ہوتے۔ کچھ راستے آڑے ٹیڑھے بھی ہوتے ہیں اور اُن پر چلنے والے مجھ جیسے پاگل بھی ہوتے ہیں۔ ان پاگل دیوانوں سے بچ کر رہنا چاہیے۔ وہ کچھ بھی کر گزرتے ہیں اماں...... کچھ بھی۔" اس نے خبرداری کے انداز میں انگلی اُٹھا کر جیسے عنایت بی بی کو محتاط رہنے کی صلاح دی تو وہ پیلی پڑ گئی۔ کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ ہونٹ خشک ہوگئے اور بدن میں جیسے رعشہ اُتر آیا تھا۔ بولی تو اپنی آواز ہی اندھے کنویں سے آتی لگی۔

"تجھے کب سے دورے پڑنے لگے ابرار۔ مجھے خبردار رہنے کو نہ کہہ، میں اپنی اور زیتون کی تگڑی حفاظت کرنا خوب جانتی ہوں۔"

"تُو کچھ نہ کرسکے گی اماں! کیونکہ دورے مجھے تب سے پڑتے ہیں جب سے مجھے زیتون سے محبت ہوئی ہے۔ محبت کو آزمائش میں نہیں ڈالتے، نقصان دونوں پاسے ہوتا ہے، جسے سہنا آسان نہیں۔" وہ اب بھی دھمکا رہا تھا، عنایت بی بی لبوں پر زبان پھیرنے لگی۔ اس وقت وہ بے حد لاچار و بے بس دکھائی دے رہی تھی۔ لمحے بھر کی خموشی کے بعد گلا کھنکھار کے بولی۔

"دیکھ ابرار! میرا تجھ سے کوئی جھگڑا ایسا پا نہیں ہے۔ معاف کردے ہم ماں بیٹی کو، اپنی محبت کا آزار

زیتون کے گلے نہ باندھ، وہ سہہ نہیں پائے گی۔ میرا اعتبار کر، تُو اسے بالکل اچھا نہیں لگتا یہ بات وہ سو واری میرے منہ پر کہہ چکی ہے۔ نفرت کرتی ہے وہ تجھ سے۔ دیکھ تُو اپنے دل کی بات کرتا ہے نا تو ذرا اس کرماں والی کے دل کو بھی دیکھ لے۔ وہ مر جائے گی پر تجھ سے بیاہ نہیں رچائے گی پھر ضد کا کیا فائدہ پتر۔"

"لے دس! جب زیتون میری ہے، تے فیر ضد کس بات کی۔ وہ جو مرضی کہے، بس تُو جلدی سے تاریخ پکی کر دے۔ میں کچھ بندے لے آتا ہوں۔ تین کپڑوں میں زیتون کو میرے ساتھ چلتا کر دے۔ شادی کے بعد میں ماں سمجھ کر تجھے بھی اپنے گھر میں جگہ دے دوں گا۔ میں جانتا ہوں زیتون تیرے بغیر نہ رہ پائے گی۔" وہ جیسے احسان کر رہا تھا۔

"اوئے زیادہ بک بک نہ کر، ایک واری کہہ دیا سو کہہ دیا۔ تیری شادی زیتون سے نہیں ہوگی تو ہرگز نہیں ہوگی، سمجھ گیا کہ نہیں۔" اس بار عنایت بی بی کا لہجہ و انداز بے حد کڑا تھا۔ ابرار کی بولتی بند ہوگئی۔ وہ آنکھیں پھاڑے کچھ دیر اس کا چہرہ تکتا رہا پھر دروازہ پٹخ کے گھر سے نکل گیا، قہر و غضب سے اٹھتے قدموں کی دھمک جیسے عنایت بی بی کی دھڑکن میں گونج رہی تھی۔ وہ بے حوصلہ سی ہو کر بیٹھ گئی۔ بدن میں جیسے تھرتھری سی اُتر آئی تھی اور آنکھیں نم تھیں۔

☆......☆......☆

بازار سے واپسی پر گڈو کی ماں نے گلی کے نکڑ پر ہی زیتون کو رب راکھا کہہ کر گھر کی راہ لی تھی۔ اس کا خاوند دہاڑی پوری کر کے گھر لوٹ آیا تھا اور اب اسے خوامخواہ کی جلدی لگ گئی تھی۔ زیتون نے بُرا مانے بغیر اس کی مجبوری کو سمجھا اور گھر کی اور قدم بڑھا دیے۔ یہی کوئی سات آٹھ گز پرے اس کا اپنا گھر تھا، وہ سرکتی چادر کا پلو سر پر سنبھالتی تیز قدموں سے آگے بڑھ رہی تھی جب ہی اچانک پیچھے سے ایک تیز رفتار گاڑی جھٹکے سے اس کے نزدیک آرکی۔ زیتون نے خوف زدگی سے اُدھر دیکھا تو پیلی ٹیکسی میں سوار ابرار کی صورت اُسے بڑی پُراسرار لگی۔ موٹے موٹے جامنی ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست تھے اور چہرے پر تناؤ کی سی کیفیت تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ ٹیکسی سے اُتر کر برق رفتاری سے زیتون کی طرف بڑھا اور اس کے نرم لبوں پر اپنے بھاری ہاتھ کا پہرہ بٹھا کر کلائی کھینچتے ہوئے ٹیکسی میں لا پھینکا۔ زیتون کی چیخ گلے میں گھٹ گئی۔ وہ ابرار کے آہنی شکنجے جیسے بازو کی قید میں بے بس پنچھی کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھی۔ خود کو چھڑانے کی کوششوں نے ابرار کے غصے کو ہوا دی تھی۔ جذبات سے مغلوب ہو کر غصے کی شدت کے ساتھ زیتون کے سر پر اس زور کا ترچھا ہاتھ مارا کہ مانو چودہ طبق روشن ہوگئے ہوں۔ نازک اندام زیتون کے لیے وہ بہت کڑا وار تھا۔ وہ بُری طرح چکرائی، لمحے میں جیسے دنیا ہی گھوم گئی۔ اسے سر کے اوپر رنگ برنگ ٹُرمرے ناچتے محسوس ہوئے۔ اگلی ہی ساعت وہ حواس کھو کر کالی دھند میں اُتر گئی تھی۔

☆......☆......☆

آنکھ کھلی تو خود کو کسی نئے نکور گھر کے چھوٹے سے خالی کمرے میں تنہا پایا۔ چاروں طرف لکڑی، سیمنٹ اور سفیدی کی بُو رچی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کل ہی کسی نے کمرے کی قلعی کو تازہ کیا تھا۔ فرش پر جا بجا سفیدی کے چھینٹے اور کمرہ دھول مٹی سے اَٹا پڑا تھا۔ وہ چاروں شانے چت کمرے کے بالکل درمیان میں کسی مردار وجود کی طرح بے حس و حرکت پڑی تھی۔ وہ کچھ دیر ساکت رہی پھر جب ہوش ٹھکانے لگے تو برق رفتاری سے اُٹھ بیٹھی اور سیدھی دروازے کی طرف بھاگی لیکن وہ باہر سے بند تھا۔

اُس نے بے سوچے سمجھے دروازہ پیٹ ڈالا۔ اب وہ بری طرح دھاڑیں مار کر رو رہی تھی۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا لیکن وہاں اس کی آہ سننے والا کوئی نہ تھا۔ وہ تڑپتی رہی، سسکتی رہی۔ اماں کو آوازیں دیتی رہی مگر کوئی نہ آیا۔

شام اب رات میں ڈھل گئی تھی۔ سکوت اور تنہائی نے زیتون کے اعصاب توڑ ڈالے تھے۔ اتنا وقت گزر گیا تھا اور اس کی صدائیں ناکام لوٹی تھیں۔ اب تلک نہ اماں آئی تھی اور نہ ہی کمرے کا بند دروازہ کھلا تھا۔ وہ بے کسی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

چھوٹے سے مربع نما کمرے میں صرف ایک کھڑکی تھی جس پر لوہے کی زنگ آلود جالی نے فرار کا راستہ بھی مسدود کر دیا تھا۔ وہ لاچار سی ہو کر باہر جھانکتی رہی۔ کوئی دور افتادہ جگہ معلوم ہوتی تھی۔ چاروں اور سبزے کی بو اور درختوں پر بیٹھے پنچھیوں کا شور تھا۔ کھڑکی سے آگے گھر کے اطراف کچی چہار دیواری تھی۔ جس کے پار دیکھنا زیتون کے لیے ممکن نہ تھا۔

وہ تھک ہار کے کھڑکی کے آگے دو زانو ہو گئی، اشکوں کی بہتات بھی اب ہار مان چکی تھی۔ وہ کہاں قید تھی اسے پلے نہ پڑا۔

دل بے آواز دھڑک رہا تھا، گزرتا وقت اس کے وجود میں خوف بھر رہا تھا۔ ابرار اسے وہاں کیوں لایا تھا۔ کیوں دشمنی نبھائی تھی اس کے ساتھ؟ کیوں زیتون کو اغوا کیا تھا؟ کیا وہ کسی بدلے کی نیت سے اسے وہاں لایا تھا...... لیکن وہ کس بات کا بدلہ لے رہا تھا۔

اسے کچھ نہ سجھائی دیا، ابرار اچھا بندہ نہیں تھا یہ بات وہ بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ مگر آج بے وقت کی اس افتاد نے اس کے ذہن کو ماؤف کر ڈالا تھا۔ جب بھی وہ ذہن پر زور ڈالتی نتیجہ خالی کھوہ کے اندھیرے سا نکلتا اور دم گھٹنے لگتا تھا۔ رات کچھ اور آگے سرکی تو سبزے سے جھینگر نے سر اٹھا کر بولیاں بولنا شروع کر دیں تب اچانک قفل زدہ دروازے کے باہر آہٹیں جاگی تھیں، وہ ہوشیار ہو کر بیٹھ گئی۔ اندھیرے کمرے میں اتنی روشنی بہر حال تھی کہ وہ آنے والے کو پہچان پاتی۔

دروازہ دھیرے سے چرچرایا اور کھلتے دروازے سے آتی ملگجی دھند میں اس نے ابرار کو اندر آتے دیکھا۔ وہ بدن پر صرف دھوتی پہنے ہوئے تھا اس کا کسرتی بدن جیسے اپنے اندر سموئی طاقت کا آپ ہی کھلا اظہار تھا۔ زیتون کا دل اچھل کر حلق میں آ ٹکا۔ وہ کھسک کر دیوار سے جا لگی۔ قدرت کو جانے کیا منظور تھا۔ آج شرم و حیا والی زیتون کے پاس کوئی جاء اماں نہ تھی۔ جس بات کا گمان تک نہ تھا آج وہی قیامت اچانک اس پر ٹوٹ پڑی تھی۔ ابرار کی ہوس نے ڈھٹائی میں مل کر اس کی ہاہا کار سنی، نہ منت فریاد...... وہ کچھ کہے بنا کچے فرش کی دھول میں اسے دھول کرنے کی سعی کرنے لگا اور بے چاری زیتون مرغِ بسمل کی طرح خود کو بچانے کی تگ و دو میں تھی لیکن پانی سر سے گزر گیا تھا، نئے مکان کے نئے قلعی والے کمرے میں زیتون بڑی بے دردی سے پرانی کر دی گئی تھی۔

☆......☆......☆

اب وہ کسی بت کی طرح بے حس و بے جان بیٹھی تھی، اندر اٹھتی ساری آوازیں جانے کہاں جا سوئی تھیں۔ دل پتھر کے ٹکڑے کی طرح بھاری ہو رہا تھا اور بدن کی طاقت زائل ہو کر ناتوانی کے احساس کو جگانے لگی تھی۔ ابرار نے اس نمانی کو منہ دکھانے کے قابل کہاں چھوڑا تھا۔ صبح سورج کے اُگتے ہی نہایت خموشی سے وہ زیتون کو اس کے گھر کی دہلیز پر چھوڑ گیا تھا۔ وہ اپنے قدموں پر کھڑی ہونے کے

امید کا دیا

سال رواں کے آخری سورج کی کرنیں آنکھوں میں آنسو اور دل میں تڑپ لیے الوداع ہو رہی ہیں۔ وہ دعا کرتی ہیں کہ اے خدا اس ملک کو بربادی سے بچانا، اس دھرتی کو ویرانی سے محفوظ رکھنا۔ اس سال بھی دہشت گردوں کے ہاتھوں سیکڑوں معصوموں اور بے گناہ افراد نے اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا پائی۔ کیا گزرتی ہے ان والدین کے دلوں پر جب ان کے سامنے ان کے معصوموں کے جنازے آتے ہیں اور وہ جیتے جی مر جاتے ہیں۔ وہ کیسے جیتے ہوں گے، جن کے گھروں کے چراغ بجھ گئے اور دیکھتے دیکھتے آشیانے جل کر خاک میں مل گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر رات کے بعد صبح کا اجالا ہوتا ہے۔ ہر مایوسی کے بعد امید کا دیا جلتا ہے، ہر زخم بھر جاتا ہے، جب وقت مرہم بنتا ہے، اس لیے اے ہم وطنو! ہمت نہ ہارنا اور قدم سے قدم ملا کر چلنا کیوں کہ نئے سال کا سورج طلوع ہونے والا ہے۔ خدا کرے کہ نیا سال ہم سب کے لیے مسرت و خوشیوں سے بھرا پیغام لے کر آئے۔ ہر دن اور ہر پل دل میں نئی امنگیں اور امیدیں پیدا ہوں۔ قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ نوجوان ہمارے ملک کا سرمایہ ہیں، اس لیے نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ متحد ہو کر ایمانداری اور محنت سے اس ملک کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کریں۔

سخن آرائی: منیبہ منیر۔ اوکاڑہ

قابل بھی نہ تھی لیکن اماں کی گود میں سر رکھ کر با آواز بلند رونے کی خواہش اتنی شدید تھی کہ لڑکھڑاتی چال کے باوجود وہ بہ مشکل صحن عبور کرتی کمرے تک جا پہنچی۔ اندر کمرے میں پورے محلے کی عورتیں جیسے بین ڈال رہی تھیں۔ اماں کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ بار بار غش کھا رہی تھی پھر بھی اس کے سوکھتے لب ابرار کو جھولی بھر بھر کے بددعائیں دے رہے تھے۔ اسے پورا یقین تھا وہی لٹیرا اس کی زیتون کو اٹھا لے گیا تھا۔ اِدھر حال و بے حال سی زیتون ماں کے درست اندازے پر دل تھامے کھڑی تھی۔ اسے کمرے کے دروازے پر لٹکتے پردے کے ساتھ جھولتا دیکھ کر بہت سی عورتوں کی چیخ نکل گئی۔ آناً فاناً زیتون کو پکڑ کر عنایت بی بی کے سامنے لایا گیا۔ بیٹی کی اتری صورت اور گم صم انداز دیکھتے ہی وہ جیسے کسی اسپرنگ کی طرح اچھلی اور اسے بانہوں میں بھینچ کر دھاڑیں مارنے لگی۔ اب کچھ کہنا سننا بے کار تھا۔ زیتون سرتاپا ماں ہی نہیں بلکہ ہر عورت کے دل سے اٹھتے اور لبوں پر مچلتے سوال کا جواب بنی نظروں کے سامنے تھی۔ اس پر کون سا عذاب ٹوٹ پڑا تھا، یہ بات کہنے کی نہیں بس دیکھنے کی تھی۔

کمرے کی بوجھل فضا تسلی دلاسوں سے ہٹ کر ماتمی انداز اختیار کر گئی۔ عنایت بی بی کی گھٹی گھٹی چیخیں بیٹی کی بے آبروئی پر گلے سے نکل کر نہ دے رہی تھی۔ وہ زیتون کے اجڑے بکھرے سراپے کو بے قراری سے ٹٹول رہی تھی۔ اشکوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا جو اس کی بوڑھی آنکھوں سے رواں تھا۔ زیتون دم سادھے ماں کی آغوش میں گم تھی۔ اسے کسی بات کا ہوش نہ تھا، کون کیا بول رہا تھا، کون سے دلاسے دے رہا تھا، کیسی ہمدردی کر رہا تھا، وہ کچھ بھی سن نہیں پا رہی تھی۔ بس ماں کے وجود کا حصہ بنی تھر

تھر کانپ رہی تھی۔ اماں کا اضطراری انداز بھی اس کی چپ کو توڑ نہ سکا تھا۔

گریہ زاری اپنے عروج پر تھی جب کمرے میں موجود عورتوں نے آنکھوں میں حیرت بھر کے ابرار کو محلے کی مسجد کے مولوی صاحب اور چند سر کردہ اشخاص کے ساتھ اندر آتے دیکھا۔ ابرار کی صورت دیکھتے ہی عنایت بی بی نے زیتون کو جیسے دل میں چھپانے کی سعی کی، وہ برستی آنکھوں اور کپکپاتے لبوں سے آپ ہی بدبدانے لگی تھی۔

”یہ کیا کیا ابرار تُو نے...... یہ کیا کر دیا۔ جس سے محبت کی اسے بے آبرو کر دیا۔ وہ عورت جو تیرے دل میں اُتر گئی تھی، اسی عورت کا سر جھکا کے اسے جینے کے قابل بھی نہ چھوڑا تُو نے۔ کیوں کیا ایسا کیوں کیا تُو نے ایسا؟“

ابرار نے شرمندگی سے گردن جھکالی اور بھاری قدموں کے ساتھ آگے ہو کر عنایت بی بی کے پاؤں پکڑ لیے۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ وہ چند ثانیے دم سادھے اس کے آگے بیٹھا رہا، پھر نظر چرا کے ہولے سے بولا۔

”مجھ سے غلطی ہوگئی ہے اماں، مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی ہے۔ تُو نے رشتہ دینے سے منع کیا تو دل جیسے باؤلا ہوگیا تھا۔ کچھ نہ سوجھا تو زیتون کو حاصل کرنے کے لیے غلط راستہ اختیار کیا۔ لیکن وہ زیادتی تھی۔ ظلم تھا اماں۔ میں خطا کار ہوں، گناہ گار بلکہ زانی ہوں۔ تُو مجھے سزا دے۔ میری غلط کاری پر زیتون کے ساتھ مل کر مجھے سزا دے۔ تیرا یہ گناہ گار اپنے پیروں سے چل کر تیرے پاس آیا ہے۔ میں نے زیادتی کی ہے اماں، اپنی محبت کی بے حرمتی کی ہے۔ پھر کیا کروں۔ جب سے روتی بلکتی زیتون کو اِدھر چھوڑ کر گیا ہوں، جی بہت بھاری ہوگیا ہے۔ اپنے کیے ظلم کا احساس مجھے بے موت مار رہا ہے۔ اب ضمیر کے شتکارے سن کے، پارا پارا دل کے ساتھ مسجد میں چلا آیا تھا۔ مولوی صاحب کو رو رو کے ساری بات بتائی ہے۔ اپنے گناہ کا اعتراف کیا ہے ان کے سامنے۔ جو غلطی کی، اس کا اقرار کیا ہے اماں۔ میں جانتا ہوں میرا گناہ بہت وڈا ہے، اسی لیے اپنے گناہ کی تلافی کرنے آیا ہوں۔ میں بھرپائی دوں گا اماں۔ زیتون کی عصمت کی بھرپائی کرنے دے مجھے۔ مجھے ضمیر کے کچوکوں سے بچالے۔ دیکھا اماں۔“ ابرار نے عنایت بی بی کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیے اور جھکتے ہوئے بولا۔

”یہ سارے مرد جو میرے ساتھ اِدھر آئے ہیں، یہ ان کا مشورہ ہے۔ یہ کہتے ہیں اپنے کیے کی معافی مانگوں تجھ سے اور زیتون سے بھی۔ رب دی سوں اماں، ان کے کہنے پر تیرے سامنے آنے کی جرأت کی ہے۔ تُو مجھے معافی دے دے اور...... اور زیتون کو میرے نکاح میں دے دے۔ ڈھک دے اسے میرے نام کے ساتھ۔ بس تُو دل میں کوئی ویر نہ رکھنا میرے لیے۔ دیکھ میں اپنے کیے کا کفارہ ادا کرنے آیا ہوں۔ میں مجرم ہوں اماں۔ بے شک میرا جرم بہت بڑا ہے۔ لیکن مجھے...... مجھے تلافی کرنے کا ایک موقع دے دے۔“ ابرار نے بے آواز روتی عنایت بی بی کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

”اماں مجھے اپنے کیے کا خراج ادا کرنے دے ورنہ زیتون کے حصے خسارہ آئے گا۔ وہ دل برداشتہ ہو کے مر ہی نہ جائے۔ میں نے اسے برباد کیا ہے اماں۔ اب اسے آباد کرنے کا ایک موقع دے۔ زیتون کو میرے ساتھ بیاہ دے اماں، میرے نکاح میں دے دے تاکہ میں......“

”نہیں......“ اچانک زیتون نے چیخ کر عنایت بی بی کی گود سے سر اٹھایا اور حقارت سے ابرار کی بات کاٹ ڈالی۔ وہ اسے وحشت زدہ سی ہو کر گھورنے لگی

تھی۔ اس کا چہرہ کرب و برداشت کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر اُلجھے سانس کے ساتھ ابرار کو یک ٹک دیکھتی رہی پھر یکدم اٹھی اور ابرار کے منہ پر تھوک دیا۔

''مجھے نہیں کرنا تیرے ساتھ بیاہ۔ تُو نے بیاہ رچانے کے لیے ہی یہ سارا ناٹک کھیلا ہے نامراد، تاکہ کوئی تجھے منع نہ کر سکے۔ میری بربادی کا جو کھیل کھیلا ہے تُو نے، وہ اسی لیے تو ہے کہ کوئی دوسرا مجھے وداع نہ کرا لے جائے۔ اپنی عزت بنا کر ساتھ نہ لے جائے۔ لیکن یاد رکھ ابرار، یہ بیاہ نہ ہوگا اب...... مجھے انکار ہے تجھ سے نکاح کرنے میں۔ کیونکہ نفرت ہے مجھے تیری اس منحوس صورت سے اور تیری چکنی چپڑی باتوں سے۔ چل دفع ہو جا یہاں سے۔ تجھے جو پانا تھا وہ تجھے مل گیا ہے۔ پھر یہ ڈھکوسلہ کس لیے؟'' وہ آپے سے باہر ہو رہی تھی اس کی آواز میں اشکوں کی بہتات تھی۔

''یہ ڈھکوسلہ نہیں ہے زیتون، صرف شرمندگی اور پچھتاوا ہے۔ اگر یہ سچ نہ ہوتا تو میں مولوی کو ساتھ لے کے......''

''بکواس نہ کر ابرار، تیرے اندر جو شیطان ہے۔ میں نے اسے دیکھ لیا ہے کمینے۔ تُو لٹیرا ہے، میری بربادی کا ذمہ دار ہے۔ تجھ پر اللہ کی لعنت برسے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔

''زیتون، رب دے واسطے، انج نہ رو...... دیکھ شرمندگی نے مجھے بھی۔'' وہ خجالت سے کچھ کہنے کو تھا کہ عنایت بی بی کی رندھی آواز نے اس کی بات اُچک لی۔

''تُو نے سنا نہیں میری دھی نے کیا کہا ہے ابرار۔ اسے بیاہ نہیں کرنا تیرے ساتھ۔ جا چلا جا اِدھر سے۔ تیری صورت، تیرا وجود اب مجھے برداشت نہیں ہو رہا۔ دیکھ میں قاتل بننا نہیں چاہتی۔ اپنی دھی کو بے آبرو کرنے والے کتے کے لہو سے ہاتھ پلید نہیں کرنے مینوں۔ تیری زیادتی میں نے رب سوہنے کے آگے رکھ دی ہے، اب وہی بہتر فیصلہ کرے گا۔ تجھے عبرت کا نشان بنا دے گا دنیا کے لیے۔ یہ ایک مظلوم ماں کی ہائے ہے ابرار۔ یہ تجھ پر ضرور پڑے گی۔''

''نہیں نہیں...... مجھے معاف کر دے اماں۔ رب کے واسطے معاف کر دے مجھے، میں زیتون کا گناہ گار ہوں۔ اس گناہ سے انکار نہیں کیا میں نے۔ لیکن میں ہاتھ جوڑتا ہوں اماں۔ اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کی اجازت دے دے۔ زیتون کو میں نے اجاڑا ہے تو اسے اپنے گھر میں بسانے کا حق بھی دے دے۔ میں زیتون کو بہت خوش رکھوں گا۔ تُو فکر نہ کر اماں اسے گرم ہوا تک لگنے نہ دوں گا۔ یہ دیکھ......'' اس نے بے قراری سے اٹھ کر قمیض کی جیب سے سُنہری ڈبیہ نکال کے کھولی اور عنایت بی بی کی آنکھوں کے سامنے کر دی۔

''لے دیکھ اماں۔ میں نے کہا تھا نا ہیرے کی مُندری بنوائی ہے میں نے اپنی زیتون کے لیے۔ ذرا نظر بھر کے دیکھ کتنی خوبصورت ہے۔ اب یہ قیمتی مُندری زیتون کے ہاتھ میں سجے گی۔ میں دنیا کا ہر سکھ تیری دھی کی جھولی میں ڈال دوں گا۔ بھروسا کر اماں...... صرف ایک ہاں کر دے۔ اپنی زیتون مجھے سونپ دے اماں۔''

''نہیں...... یہ نہ ہو سکے گا ابرار، اب یہ نہیں ہوگا۔'' وہ نفی میں سر ہلانے لگی ابرار کا رنگ فق ہو گیا۔

''کیوں نہیں ہوگا اماں! تُو بس ایک بار ہاں کر دے۔ جانتی ہے نا کتنا پیار ہے مجھے زیتون سے۔ یہ پیار ہی تو ہے جس نے یہ مُندری زیتون کے لیے بنوائی ہے۔ یہ امانت ہے تیری دھی کی۔'' اس بار وہ لالچ دے رہا تھا۔ بہلا رہا تھا اُسے۔

عنایت بی بی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
کمرے میں یکلخت سناٹا اُتر آیا تھا۔ ہر بشر کی نگاہ ابرار کے ہاتھ میں پکڑی انگوٹھی کی طرف تھی۔ انگوٹھی میں جڑے خوش رنگ ننھے سے ہیرے سے جیسے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ ابرار کے ہاتھ پر برقی پاروں کی طرح ہیرے کی شعاعیں لشکارے مار رہی تھیں۔ غریب لوگوں کے لیے یہ ایک دل فریب نظارہ تھا لیکن عنایت بی بی کے لیے اس کی کوئی قیمت نہ تھی۔ زیتون کی عزت اس ہیرے سے کہیں زیادہ انمول تھی۔ وہ عزت، جسے ابرار نے پاپی بن کر چھین لیا تھا۔ لیکن اب وہی حرام خور اپنے نام کی انگوٹھی زیتون کے ہاتھ میں ڈالنے کو بے قرار تھا یعنی ناجائز کام کو جائز کا درجہ دینے کی کوشش میں تھا۔
''عنایت بی بی نے گہری ٹھنڈی سانس بھر کے کمرے میں ٹھہرے مجمعے کو دیکھا جو پوری توجہ سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہے تھے۔ ابرار نزدیک ہی تھا۔ عنایت بی بی نے دوہتھڑ جڑ کے اسے پرے دھکیلا اور زہر خند سے بولی۔
''یہ بات مت بھول ابرار، مظلوم کی آنکھ سے بہتا ہر اشک ظالم کے لیے بددعا بن کے نکلتا ہے۔ کان کھول کے سن مجھے اپنی دھی رانی تجھے نہیں سونپنی، کیونکہ ظالم کے ساتھ رہنا بھی ظلم ہی ہے۔ اور یاد رکھ میں نے زیتون سے وعدہ کر رکھا ہے اگر تُو اس دنیا کا آخری مرد بھی ہوا نا تب بھی میں اس کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں نہیں دوں گی۔ زیتون نفرت کرتی ہے تجھ سے ابرار...... بہت ہی شدید نفرت، اب جبکہ تُو نے اسے اجاڑ دیا ہے پھر بھی میری دھی نے تھوکا ہے تیرے منہ پر۔ کیا اب بھی تجھے زیتون کے دل کی خبر نہیں ہوئی؟ کیا اب بھی تُو اس کی نفرت کو جان نہ پایا نامراد ے۔'' ابرار کے اندر جوالہ مکھی سر اٹھانے لگا۔ بے قراری چھپا کے بولا۔

''زیتون بچی ہے ابھی۔ وہ اپنا اچھا برا کہاں سمجھتی ہے۔ اسے کیا معلوم، میرا ہاتھ نہ پکڑ کے اس کے کھاتے کون سا خسارہ آنے والا ہے۔ وہ ناسمجھ ہے اماں۔''
''اپنی بکواس بند کر ابرار۔ وہ ناسمجھ ہے، تُو تو نہیں، اس کا اچھا برا تُو نے بھی کب دیکھا، کیا کیا تُو نے اس کے ساتھ؟ ارے ظالم دنیا کے سامنے منہ دکھانے کا نہ رہنے دیا اس معصوم کو۔ عزت تار تار کر دی اس کی۔'' وہ بھبھک کے رو پڑی۔ ابرار پر گھڑوں پانی آ گرا لیکن ڈھٹائی سے بولا۔
''ہمیں دنیا سے کیا لینا دینا اماں! زیتون کو میں نے گندا کیا ہے تو اچھا بھی مجھے ہی کرنا ہوگا۔ اتنی بار کہا ہے ایک موقع دے اپنی اچھائی ثابت کرنے کا، ابھی کچھ نہیں بگڑا اماں، بیاہ دے اسے میرے ساتھ، ساری عمر سُکھی رکھوں گا۔ میں نے اگر کہیں ڈنڈی ماری تو آ کر اپنا حساب بے باق کر لینا۔ جو چور کی سزا وہی میری ہوگی۔''
''ابرار ٹھیک کہتا ہے بہن جی!'' اس بار مولوی صاحب نے بولنا ضروری سمجھا۔ ''اس سے غلطی ہوئی ہے لیکن ہم سب کے سامنے اب وہ اپنی شرمندگی جتا رہا ہے، اس لیے میرے نزدیک ابرار کو تلافی کرنے کا ایک موقع ضرور ملنا چاہیے۔ ابھی واقعی کچھ زیادہ نہیں بگڑا، ابھی وقت ہاتھ میں ہے۔ گھر کی بات گھر ہی میں ڈھک جائے تو بہتر ہوگا۔ زیتون کو ابرار سے بیاہ دو۔ اب وہی اس کی عزت کا رکھوالا بنے گا۔''
''ہاں عنایت بی بی! مولوی صاب کا مشورہ بہت ہی بھلا ہے۔ لڑکی کی عزت کانچ سے زیادہ نازک ہوتی ہے۔ بے شک ابرار نے بدکاری جیسا جرم کیا ہے لیکن وہ اپنے جرم کا بدلہ نیکی سے چکانا چاہتا ہے۔ نکاح کرنا چاہتا ہے اپنی زیتون سے...... پھر سوچنا کیا، عزت سے دھی کو بیاہ دے ابرار کے

ساتھ، اب وہ آپ ہی زیتون کو ڈھک لے گا۔"
گڈو کی ماں نے دبی زبان سے اپنی رائے کا اظہار کر کے مشورے سے بھی نوازا تو عنایت بی بی بے کسی ولاچاری سے اس کی صورت تکنے لگی۔ کمرہ اب چہ میگوئیوں سے گونجنے لگا تھا۔ سب حاضرین اس بات کے حامی نظر آتے تھے۔ سبھی کو جیسے اک بے قراری سی لگ گئی تھی۔

ادھر عنایت بی بی کے اندر بھانبڑ جلنے لگے تھے۔ ابرار کی چالاکی و مکاری اسے پلے پڑ رہی تھی لیکن وہ اتنا خبیث تھا کہ غلط کاری کے باوجود اُن ماں بیٹی کو اپنا پابند بنائے بیٹھا تھا۔ نہ اگلتے بن رہی تھی نہ نگلتے۔ عنایت بی بی کے پاس ابرار کی پلاننگ کے مطابق ہاں کہنے کے سوا اور کوئی راستہ نہ بچا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ سب کا اصرار دباؤ کی صورت اختیار کرتا اور عنایت بی بی نکاح کی حامی بھرتی۔ زیتون آہستگی سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے قدم بڑھائے اور ابرار کے مقابل آ گئی، ہاتھ بڑھا کر ہیرے کی انگوٹھی اس کے ہاتھ سے لے کر تمسخر سے بولی۔

"تو یہ قیمت ہے میری عزت کی...... کیوں ابرار؟ تُو کیا سمجھتا ہے اس ننھے سے ہیرے کے عوض خرید لے گا مجھے؟"

"توبہ توبہ...... کیسی باتیں کر رہی ہے زیتون۔" ابرار نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "کیا میری اتنی اوقات ہے جو تجھے خرید سکوں۔"

"ہے تو......" زیتون نے جلتی نگاہ اس پر ڈالی پھر انگوٹھی اس کے آگے نچا کر بولی۔ "یہ ہے نا تیری اوقات...... جسے بوجھ (جیب) میں ڈالے پھرتا ہے جلا لچ دیتا ہے دوسرے کو۔ ہیرا دکھا کے آنکھیں چندھیاتا پھرتا ہے غریبوں کی۔ تُو سمجھتا ہے بے جان سے پتھر کے عوض میری ماں کو مجبور کر دے گا۔ کیا تُو نے اماں کو اتنا بے غیرت سمجھا کہ وہ تیری چال بھانپ کے بھی اپنی بے آبرو بیٹی کو تجھ جیسے لٹیرے سے بیاہ دے گی۔ بول ابرار۔" زیتون نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور اُس کی آنکھوں میں اپنی جلتی آنکھیں گاڑ کر کچکچاتے لہجے سے بولی۔

"کیا ہم اتنے بے غیرت اور شودے ہیں جو تیرا ہیرا دیکھ کر بک جائیں گے۔ ابرار کے چھکے چھوٹ گئے۔ زیتون نے اُسے آڑے ہاتھوں لیا۔ جواب کا یارانہ تھا لیکن اسے کچھ تو کہنا ہی تھا۔ کمرے میں موجود ہر بشر کی دزدیدہ نظر اسے گھور رہی تھی سو اپنی جھینپ مٹانے کو بولا۔

"زیتون، کیا ہو گیا ہے تجھے۔ میں نے کون سی چالیں چلیں ہیں تیری ماں کے سامنے۔ دیکھ میرے لیے غلط نہ سوچ۔ تجھے دل سے چاہتا ہوں جھلی۔ اپنے گھر کی رانی بنانا چاہتا ہوں۔ اسی لیے آج اتنے بہت سے لوگوں کے بیچ کھڑا ہو کے تجھے مانگ رہا ہوں اور تیرے اطمینان کے لیے یہ اقرار کرتا ہوں، تُو میری زندگی کی پہلی عورت ہے جسے میرے دل نے اپنا مانا ہے۔ میں تجھ سے پیار کرتا ہوں زیتون، لیکن مجھ سے بھول ہو گئی ہے تو کیا کروں۔ یہ بھول بھی تیری اماں کے انکار کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اگر وہ میرا رشتہ قبول کر لیتی تو ایسا کبھی نہ ہوتا۔ بس مجھ سے عنایت بی بی کی "ناں" سہی نہ جا سکی اور میں نے تجھے......"

وہ بات ادھوری چھوڑ کے یوں ہاتھ مسلنے لگا جیسے پچھتاوؤں میں گھرا ہو۔ مگر یہ بھی ایک فریب تھا۔ جو زیتون بہ خوبی سمجھ رہی تھی۔ ابرار کے جواب پر اس کی بھیگی آنکھیں پھر سے جلنے لگی تھیں۔ ہونٹ دانتوں تلے داب کر وہ اشکوں کو پینے کی کوشش کرنے لگی۔ انگوٹھی اب بھی اس کے ہاتھ میں دبی تھی۔ لشکارے مارتے ننھے سے ہیرے کی لپکیں اس کے اشکوں کی

آڑھی ٹیڑھی لکیروں میں جیسے بجلی سی بھر رہی تھیں۔ چند ساعتیں اسے سنبھلنے میں لگیں پھر وہ چہرہ اٹھا کر سامنے کھڑے ابرار کو تاکنے لگی اور بولی تو رقت سے آواز بھاری ہو رہی تھی۔

"میں تجھ سے شادی کر لیتی ابرار! تیرا ہاتھ تھام لیتی اگر تُو نے دل کا حال بھی مجھے جتایا ہوتا۔ لیکن اب دیر ہو چکی ہے۔ مجھے میلا کرتے تُو نے ایک واری بھی یہ نہ سوچا کہ میں وہ پہلی عورت ہوں جسے تُو گھر کی رانی بنانے کی چاہ رکھتا ہے۔ تجھے دعویداری ہے مجھ سے محبت کی، پر ابرار...... اپنے تئیں تُو نے غلط قدم صرف اسی لیے اٹھایا تاکہ کسی اعتراض کے بغیر مجھے تیری جھولی میں یہ کہہ کر ڈال دیا جائے کہ اب اس آبرو باختہ کو تُو ہی سنبھال...... چل مبارک ہو ابرار۔" زیتون کے اشکوں میں شدت آ گئی۔ وہ جیسے غم کے پہاڑ تلے دبی کھڑی تھی۔

"تجھے مبارک ہو، جیسا تُو نے سوچا۔ جیسی گھات لگائی، ویسا ہی پایا۔ ویسا ہی ہوا ہے۔ آج ایک بے چاری ماں اپنی لٹی پٹی بے آبرو بیٹی تجھے دینے پر مجبور ہے۔ حالانکہ ماں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تُو اس دنیا کا آخری مرد بھی ہوا تو وہ میری شادی کبھی تجھ سے نہ کرے گی۔ مگر تُو جیت گیا ابرار۔ تیری چالاکی جیت گئی اور تیرے ارادوں کو فتح ہوئی ہے۔ فتح ہوئی ہے نا؟"

وہ تکرار و سوال کرتی بڑی عجیب سی لگ رہی تھی۔ ابرار کی بولتی بند ہو گئی۔ وہ اضطراب و بے چینی میں گھر کے زیتون کو تاکنے لگا۔ دل جیسے رفتار بدل رہا تھا۔ دھڑکن سینے کی چار دیواری میں شور مچانے لگی تھیں۔ جانے کیوں ایک خوف سا سوار ہوا تھا اس کے وجود پر۔ گھبراہٹ سی جاگی اور وہ زیتون کی آنکھوں میں جھانکنے سے کترانے لگا۔ وہ اس کے بہت نزدیک کھڑی تھی۔ ابرار اس کے تنفس کے زیر و بم کو آسانی سے سن سکتا تھا۔ زیتون کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں اشکوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ مگر حیرت انگیز امر یہ تھا کہ لب پر بڑی خوبصورت مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ابرار کو لگا جیسے دل اندر ہی کہیں ڈوب کے ابھرا ہو اس کے جامنی ہونٹ از خود بھینچ گئے اور ہاتھوں میں پسینہ اُتر آیا تھا۔ زیتون بہتی آنکھوں اور مسکراتے لبوں سے کچھ لمحے ابرار کو تاکتی رہی پھر آہ بھر کے بولی۔

"تُو عورت ذات کو سمجھ نہ سکا ابرار۔ عورت بڑی گہری ہوتی ہے۔ دل کا حال نہیں کہتی۔ یہاں، میرے آگے تیری ہر چال، ہر تدبیر اُلٹی پڑ گئی ہے۔ میں تجھے جیتنے نہیں دوں گی۔ وہ مرد جسے عورت سے محبت کا دعویٰ ہو اور وہ عورت کی عزت نہ کر سکے تو ایسے مرد کا کبھی گھر نہیں بستا...... اسے بس کوٹھا راس آتا ہے۔ جہاں ایک ہیرے کے عوض عزت نیلام ہو جاتی ہے۔ تُو غلط جگہ آ گیا ہے ابرار...... میری عزت چھین کے بھی تُو مجھے پا نہ سکے گا۔ کیونکہ میں نفرت کرتی ہوں تجھ سے...... بے انتہا نفرت اور یہی نفرت زندگی کے آخری سانس تک میرے ساتھ رہے گی۔ مجھے انکار ہے تیرے نکاح میں آنے سے، سمجھا کہ نہیں؟ میں تھوکتی ہوں اس بیاہ پر......"

زیتون نے ایک آہ بھری پھر بھرے کمرے میں سب کے سامنے ہاتھ میں دبی انگوٹھی کا ہیرا پلک جھپکتے میں چاٹ لیا۔ یہ وہ ہیرا تھا جسے ابرار نے آپ پسند کر کے انگوٹھی میں جڑوایا تھا۔ اور اب وہی ہیرا اس کی محبت کی ہلاکت کا سبب بن گیا تھا۔

اس بار زیتون کا انکار حتمی اور واضح تھا، وہ واقعی پہلی عورت تھی۔ جس نے اپنے چاہنے والے کی ہر چال کا پانسہ پلٹ کر اسے دنیا کے سامنے حد درجہ ذلیل و خوار کر ڈالا تھا۔

☆☆......☆☆

افسانہ

SMS پیکیج

"نہیں بیٹا! اگر کچھ باتوں اور کوتاہیوں کا احساس وقت گزرنے کے بعد دلایا جائے تو وہ اپنی وقعت کھونے کے ساتھ اپنا اثر بھی زائل کر دیتی ہیں۔ لوہا اگرم تو چوٹ بھی گہرائی تک جا کر لگتی ہے۔ یہی مناسب موقع ہے شکیل کو اُس کی کوتاہی کا احساس دلانے......

تیز رفتار زندگی کو جام کرتا، ایک حساس افسانہ

"انا للہ وانا الیہ راجعون۔
آج میری والدہ کا رضائے الٰہی سے انتقال ہو گیا ہے۔ نمازِ جنازہ آج شام نمازِ عصر کے بعد ادا کی جائے گی۔
محمد شکیل۔"

ابھی کچھ دیر پہلے اُس کے موبائل پر یہ SMS آیا تھا۔ اور وہ گھبرائی ہوئی صادقہ بیگم کے کمرے کی طرف دوڑی تھی۔ شکیل بھائی اُن کے دور کے رشتہ دار تھے۔ ثمن، صادقہ بیگم کی سگی بھتیجی تھی اور شکیل بھائی کی والدہ مرحومہ نفیسہ بیگم، اُس کی ساس صادقہ بیگم کی اچھی دوست بھی ہوا کرتی تھیں۔ اسی لیے ثمن انہیں بتانے کے لیے ساس کے پاس چند لمحوں میں موجود تھی۔

"مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا ہے۔ مانا کہ وہ بیمار تھیں کافی دنوں سے۔ لیکن یوں اچانک!"

"انا للہ وانا الیہ راجعون۔" صادقہ بیگم نے افسردگی سے کہا تھا۔ جو ظہر کی نماز کے لیے جائے نماز پر بیٹھی تسبیح و اذکار میں مصروف تھیں۔ اب نفیسہ بیگم کے انتقال کی خبر سُن کر مغموم نظر آ رہی تھیں۔ مگر ثمن

افسردگی کے ساتھ ساتھ تاسف اور بے یقینی کا بھی شکار تھی۔ اپنے موبائل پر شکیل بھائی کا Text Message پڑھ کر اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ شکیل بھائی کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔

موت تو ہر ذی روح کو آنی ہے۔ اس پر حیرانی کیسی......! مگر حیرانی تو اُسے شکیل بھائی کی والدہ کی موت کے حادثے پر نہیں بلکہ شکیل بھائی کے ''ایس ایم ایس پیکیج'' پر ہورہی تھی۔ اور وہ چند لمحوں تک گنگ بیٹھی رہ گئی تھی۔ یہ سوچ کر کہ کیا موت جیسا دل دہلانے والا حادثہ، جو مضبوط سے مضبوط وجود کی دیواروں کو ہلا کے رکھ دیتا ہے۔ اب اتنا غیر اہم اور معمولی نوعیت اختیار کر چکا ہے کہ عزیز و اقارب اور سگے خونی رشتے اپنے پیاروں کی موت کی اطلاع محض ایک پیکیج ٹیکسٹ میسج کے ذریعے کر کے بری الذمہ ہونے لگے ہیں۔ کیا شکیل بھائی ایک چند منٹ کا فون نہیں کر سکتے تھے۔ کیا اب ہماری عزیز ترین ہستیوں کے دنیا سے چلے جانے کی اطلاع کا واقعہ اتنی عام سی نوعیت اختیار کر گیا ہے۔ اور شاید چند پیسوں کا یہ ایس ایم ایس اب تک ''اطلاعی نامے'' کی صورت پورے خاندان والوں تک گردش کرتا ہوا اپنا مقصد سرانجام دے چکا ہوگا۔ اور وہ سوچ رہی تھی کہ کیا مہنگائی کے اس طوفان میں جب لوگ اپنی پسند کی عیاشیوں کے لیے بے جا پیسا خرچ کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ وہاں موت اتنی ارزاں اور بے وقعت ہوگئی ہے کہ ایک ایس ایم ایس پیکیج کے ذریعے اطلاع نامہ بن کے رہ گئی ہے۔

کیا مرنے والی ہستی کی قدر و اہمت یہی تھی اُس کے عزیز و اقارب اور خونی رشتوں کے لیے؟

اُسے لگ رہا تھا کہ خونی رشتوں کی ناقدری اور بے وقعتی کی طرح اب زندگی کے ساتھ ساتھ موت بھی سستی اور بے وقعت ہوگئی ہے۔ وہ شدید تاسف اور شاکڈ کی کیفیت میں مبتلا تھی۔ تب ہی صادقہ بیگم کی آواز نے اُس کی کیفیت اور سوچوں کے ارتکاز کو توڑا تھا۔

''ارے ثمن بیٹا...... تم اس طرح چپ چاپ کیوں کھڑی ہو۔ جا کر محسن کو فون کرو۔ وہ آفس سے چھٹی لے کر فوراً گھر آجائے۔ ہمیں ابھی نفیسہ آپا کی طرف جانا ہوگا۔ شام کو تدفین ہے۔ ہمیں اُس سے پہلے وہاں پہنچنا ہوگا۔'' صادقہ بیگم نے ثمن کی طرف دیکھ کر فکرمندی سے کہا تھا۔

''جی امی! میں ابھی جا کر محسن کو فون کرتی ہوں۔ آپ تب تک اپنے کپڑے وغیرہ چینج کرلیں۔ ابھی بچوں کو بھی اُٹھا کر تیار کرنا ہوگا۔ وہ تو اسکول سے آکر سو گئے تھے۔ ہم لوگ بچوں کو امی کی طرف چھوڑ دیں گے۔ اور واپسی میں لے لیں گے۔'' ثمن نے جلدی سے لائحہ عمل سنایا۔

''ٹھیک ہے بیٹا...... پہلے تم محسن کو فون تو کرو جا کر۔ اُسے گھر آنے میں ابھی اچھا خاصا وقت لگ جائے گا۔''

''جی امی!'' ثمن نے برجستہ کہا تھا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ صادقہ بیگم جاء نماز تہہ کرتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

☆......☆......☆

نفیسہ خالہ ایک خوش اخلاق، نیک سیرت اور بہت باہمت خاتون تھیں۔ سب کی خوشی غمی میں شریک ہونے والی، حوصلہ دینے والی۔ شادی کے دس سالوں بعد شوہر کی مہربان رفاقت نے اچانک ہی ہاتھ چھڑا لیا تھا۔ وہ ہارٹ پیشنٹ تھے۔ ہارٹ فیل جان لیوا ثابت ہوا تھا اور شادی کے صرف دس سالوں بعد وہ بیوگی کی سفید چادر اوڑھ کے چار چھوٹے چھوٹے بچوں کا سہارا، اُن کی کفیل بن گئیں۔ اُن کے ہاتھ میں سینے پرونے کا ہنر تھا، سو

ماں باپ یا بھائی بہن کے سامنے دست دراز کرنے کے بجائے اپنے زورِ بازو کی طاقت پر بھروسہ اور توکل کر کے حوصلے سے بچوں کی پرورش و تربیت میں جت گئیں۔ دو بیٹوں اور دو بیٹیوں کو پڑھایا لکھایا، اُن کی شادیاں کیں۔ دونوں بیٹے برسر روزگار تھے۔ بیٹیاں اپنے سسرال کی گرہستی میں مگن تھیں۔ مگر برسوں کی محنت مشقت کے ساتھ گزرتے وقت کے بہتے دھارے نے اُن کے ناتواں بازو اور کمزور ہستی کو بیماریوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ شوگر اور جوڑوں کے درد کی مریضہ تھیں۔ پچھلے ایک ماہ سے ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھیں۔ بڑا بیٹا شکیل اور چھوٹا بیٹا جمیل دونوں ہی بساط بھر ماں کی خدمت و تیمارداری میں لگے ہوئے تھے۔ خُدا کا شکر تھا۔ نفیسہ بیگم کی پرورش اور اچھی تربیت کے باعث اولاد تابعدار نکلی تھی۔ ورنہ آج کل کے نفسا نفسی کے دور میں جب سگے خونی رشتے ایک دوسرے سے منہ موڑ کر اپنی غرض اور مفاد سے وابستہ اپنی ذات و زندگی میں مگن ہیں۔ وہاں ماں باپ جیسے معتبر رشتے بھی وقت اور زمانے کی، رشتوں کی بے حسی اور ناقدری کی ٹھوکروں میں آ چکے ہیں۔ نفیسہ بیگم اس لحاظ سے خوش قسمت تھیں کہ اپنی برسوں کی محنت اور تپسیا کے بعد اولاد کی صورت میں بڑھاپے کے آخری ایام سکھ چین سے کاٹ رہی تھیں کہ اچانک بیماری اور پھر موت کے شکنجے نے جیتے جاگتے وجود کو بے رحمی سے نگل لیا اور پیچھے ہنستے مسکراتے چہروں کو پژمردہ اور ویران کر گیا۔

ثمن کو نفیسہ خالہ کے بارے میں یہ ساری باتیں صادقہ بیگم یعنی اُس کی ساس نے بتائی تھیں۔

☆......☆......☆

محسن کو فون کرنے کے بعد وہ جلدی جلدی بچوں کو تیار کر رہی تھی۔ تب ہی محسن چلے آئے تھے۔

''مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا ہے محسن......!'' ثمن نے افسردگی اور تاسف سے محسن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''اس میں یقین نہ آنے والی کیا بات ہے ثمن۔ ہر انسان کو ایک نہ ایک دن اس دنیا سے کوچ کر جانا ہوتا ہے۔ یہ دنیا اُس کا عارضی مقام ہے اور پھر نفیسہ خالہ تو کافی عرصے سے بیمار بھی تھیں۔'' محسن نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ ثمن کی بات کی گہرائی کو سمجھ نہیں سکا تھا۔ ثمن نے یہ بات بھی تو ادھوری ہی کی تھی۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا محسن۔ میں جانتی ہوں، موت برحق ہے اور ہر ذی روح کو اس کا ذائقہ چکھنا ہے۔ میں تو شکیل بھائی کے ایس ایم ایس کرنے والی بات کر رہی ہوں۔ انہوں نے اپنی ماں کی موت کی اطلاع دینے کے لیے ایک چند منٹ کی کال کرنے کی زحمت تک نہیں کی۔ بس ایک سستے سے 'ایس ایم ایس پیکیج' سے ٹیکسٹ میسج کر کے اطلاع دے دی کہ اُن کی ماں کا انتقال ہو گیا ہے۔'' اور اس ٹیکسٹ میسج کو کسی سستے 'ایس ایم ایس پیکیج' کے تھرو پورے خاندان کو Send کر دیا ہوگا۔''

محسن یکدم چونک کر ثمن کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ یقیناً اس بار وہ ثمن کی بات کی گہرائی کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ مگر اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ شکیل بھائی کی اس نامناسب حرکت کی کس طرح اور کن لفظوں میں مذمت کرے۔

''میں جانتا ہوں ثمن! تم بہت حساس ہو۔ مگر کیا کریں۔ آج کل زندگی کا اسٹائل ہی کچھ عجیب سا ہو گیا ہے۔ ہر طرف افراتفری کا عالم ہے۔ ہر شخص اپنی زندگی کے لگے بندھے معمولات میں مصروف، وقت کے تیز دوڑتے پہیے پر سفر کر رہا ہے۔ اوپر سے

مہنگائی کا جن ہر سال، جون تک بے قابو ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہر شخص دو وقت کی روٹی کمانے کے چکر میں کولہو کے بیل کی طرح مشقت کی چکی میں پس کر گول گول چکر کاٹ رہا ہے۔ دن رات اپنے دائرے میں رواں دواں۔ اب ایسے میں جب تمام موبائل کمپنیز نے سستے ایس ایم ایس اور کال پیکیجز شروع کردیے ہیں۔ مہنگائی کے مارے، ستائے لوگوں نے یہ سہل راستہ اختیار کرکے اپنی انسانی و اخلاقی اقدار کے ساتھ ساتھ سگے خونی رشتوں کی توقیر و تعظیم کو بھی نظرانداز کرنا شروع کردیا ہے۔

اب کمیونیکیشن کا دور ہے اور اس کی بڑھتی ہوئی ترقی میں آج بڑے سے بڑے حادثے اور واقعے کی خبر محض ایک چھوٹے سے ایس ایم ایس کے تھرو ساری دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ لہٰذا انسانی رشتے بھی اس ترقی کی نذر ہوکر بے وقعتی کا شکار ہورہے ہیں۔'' محسن کے جواز سے وہ مطمئن اور قائل نہیں ہوئی تھی۔

''لیکن محسن...... یہاں بات کمیونیکیشن کی ترقی کی نہیں، خونی رشتوں کی قدر و منزلت کی ہورہی ہے۔ اس طرح تو رشتوں کا تقدس بھی پامال ہورہا ہے۔ کیا ہماری ذات سے جڑے، ہمارے خونی رشتوں کی ہمارے نزدیک بس اتنی سی ہی اہمیت اور وقعت رہ گئی ہے کہ ایک سستے سے پیکیج کے ٹیکسٹ میسج پر آ کر ختم ہوجائے۔'' اور محسن چند لمحوں کے لیے خاموش ہوگیا۔

''ثمن ٹھیک کہہ رہی ہے محسن۔ لیکن شاید تم اُس کی بات کی حساسیت اور گہرائی تک اب بھی نہیں پہنچ سکے ہو۔ یا شاید ہم عورتیں ضرورت سے زیادہ حساس ہوتی ہیں۔''

صادقہ بیگم کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ محسن اور ثمن اُن کی آواز پر ہی مڑ کر داخلی دروازے کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ محسن فوراً ہی ماں کے احترام میں بیڈ سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''سوری امی...... میں بس بچوں کو تیار کررہی تھی۔ اسی لیے محسن کے سامنے مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں بس دو منٹ میں انہیں ریڈی کردیتی ہوں۔'' ثمن نے فوراً شرمندگی سے وضاحت دی تھی۔ وہ بھی تھی کہ اُس کی ساس صاحبہ دیر ہونے کی وجہ سے انہیں یاددہانی کرانے آئی ہیں کہ انہیں شکیل بھائی کی طرف ابھی نکلنا ہے۔

''امی، میں ثمن کی بات پوری طرح سمجھ چکا ہوں۔ لیکن ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ لوگوں کے تیزی سے بدلتے ہوئے رجحانات، رویوں اور اُن کی سوچ وخیالات کے ساتھ طرزِعمل کو بھی تبدیل کرنا ہمارے اختیار میں نہیں رہا ہے۔ سوائے اپنے مذہبی و معاشرتی اور اخلاقی اقدار کی تنزلی اور خونی رشتوں کی ناقدری و بے وقعتی پر کڑھنے اور افسوس کرنے کے۔ حالانکہ ماں باپ کا رشتہ تو سب سے افضل اور برتر ہوتا ہے انسانی رشتوں میں۔'' محسن نے واقعی تاسف کا اظہار کیا تھا۔

''ہم کیوں نہیں کچھ کرسکتے بیٹا...... اور کچھ ناں سہی تو لوگوں کو اُن کے غلط طرزِعمل اور نامناسب رویوں کا احساس تو دلا ہی سکتے ہیں۔ کیوں ثمن بیٹا! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں۔'' صادقہ بیگم نے برجستہ کہتے ہوئے ثمن کی طرف تائید کے لیے دیکھا تھا۔

''جی امی! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں موقع دیکھ کر ثمینہ بھابی سے اس کوتاہی کے بارے میں بات ضرور کروں گی۔'' ثمن نے فوراً ساس کو تسلی دلائی تھی۔

''مگر امی! میرے خیال سے فی الحال یہ وقت اور موقع مناسب نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ شکیل بھائی بُرا مان جائیں اور سب کی موجودگی میں انہیں شرمندگی بھی محسوس ہو۔ اس وقت تو انہیں صرف تسلی و تشفی کی ضرورت

ہوگی۔‘‘ محسن نے برجستہ ٹوکا تھا ثمن کی بات پر۔
’’نہیں بیٹا! اگر کچھ باتوں اور کوتاہیوں کا احساس وقت گزرنے کے بعد دلایا جائے تو وہ اپنی وقعت کھونے کے ساتھ اپنا اثر بھی زائل کر دیتی ہیں۔ لوہا گرم ہو تو چوٹ بھی گہرائی تک جا کر لگتی ہے۔ یہی مناسب موقع ہے شکیل کو اُس کی کوتاہی کا احساس دلانے کے لیے۔ تدفین کے بعد میں خود اکیلے میں شکیل سے بات کروں گی۔ اگر اصلاحِ احوال کے ساتھ اصلاحِ معاشرہ بھی مقصود ہو تو اُس کے لیے ابتدا ہمیشہ پہلے اپنے گھر سے کرنی چاہیے۔ تم پریشان مت ہو۔ مجھے یقین ہے شکیل بُرا نہیں مانے گا کیونکہ اُس کی تربیت نفیسہ آپا نے کی ہے۔‘‘ ثمن اور محسن اُن کی بات سے متفق نظر آ رہے تھے۔
’’جی بہتر امی! مجھے آپ کی بات سے بالکل اختلاف نہیں ہے۔ چلو ثمن تم جلدی سے بچوں کو لے کر گاڑی میں چل کر امی کے ساتھ بیٹھو۔ ہمارا وقت پر پہنچنا ضروری ہے۔ میں آتا ہوں۔‘‘
’’جی، میں بس اپنا بیگ لے لوں۔ چلیں امی۔‘‘ ثمن نے ڈریسنگ ٹیبل سے اپنا ہینڈ بیگ اُٹھا کر بچوں کا ہاتھ پکڑ کے صادقہ بیگم کی طرف دیکھا تھا۔
’’ہاں بیٹا چلو۔ شکر ہے، اس وقت راستے میں زیادہ ٹریفک جام بھی نہیں ہوگا۔‘‘ ثمن اور صادقہ بیگم ایک ساتھ دونوں بچوں کو لے کر نکل گئی تھیں جبکہ محسن گاڑی کی چابی اور موبائل لینے رُک گیا تھا۔

☆......☆......☆

اور جب تدفین کے بعد ایک ایک کر کے تمام دُور کے رشتے دار رخصت ہو گئے تو اس کے کمرے میں شکیل اور اُس کی بیوی ثمینہ کو دیکھ کر صادقہ بیگم نے اپنا فرض پورا کرنا ضروری سمجھا تھا۔
’’میں بہت شرمندہ ہوں صادقہ خالہ! پچھلے دو ماہ سے امی کی مسلسل بیماری، ہاسپٹل کے چکروں اور اپنی جاب کے معاملات میں اُلجھ کر مجھے تو اپنا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔ اور پھر مہینوں کی تھکن کے ساتھ امی کی دائمی جدائی کے صدمے نے دماغ ماؤف کر کے رکھ دیا۔ میں تو صبح سے تدفین وغیرہ کے معاملات میں مصروف تھا۔ میں نے رضوان سے کہا تھا کہ فون پر سارے رشتے داروں اور عزیز و اقارب کو اطلاع دے دو۔ اب اُس نے اپنی سمجھ کے مطابق یہ سب...... میں واقعی بہت شرمندہ ہوں اپنی کوتاہی کے لیے صادقہ خالہ!‘‘ محمد شکیل کے چہرے پر ندامت اور پشیمانی کے تاثرات دیکھ کر صادقہ بیگم سے رہا نہیں گیا تھا۔
’’ارے نہیں بیٹا! ہمارا مقصد تمہیں شرمندہ کرنا نہیں تھا۔ اور رضوان تو بچہ ہے۔ اُس کا کیا قصور ہے۔ ہمارا مقصد صرف تمہیں احساس دلانا تھا کہ خونی رشتوں اور گھر کے بڑے بزرگوں کا رُتبہ اور قدر رو

منزلت صرف اُن کی زندگی میں ہی نہیں اُن کے بعد بھی ہونی چاہیے۔ وہی بزرگ تو زندگی کی تپتی دھوپ میں بچوں کے لیے شجر سایہ دار کا کام کرتے ہیں اور ماں کا تو رُتبہ و مقام سب سے بڑھ کر ہے۔'' صادقہ بیگم نے نرمی سے شکیل بھائی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہیں شرمندگی کے گہرے احساس سے باہر نکالا تھا۔

''جی صادقہ خالہ! اور آپ نے بہت اچھا کیا جو میری اس کوتاہی کا احساس دلا دیا۔ میں تو آپ کا شکر گزار ہوں۔ مگر نجانے اور کس کس نے میری اس کوتاہی کو نوٹس کیا ہوگا۔ سب خاندان والے، رشتے دار کیا سوچتے ہوں گے۔ میں رضوان کی خبر لوں گا۔'' محمد شکیل اور ثمینہ شرمندہ و پشیمان بیٹھے تھے۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ رضوان ابھی بچہ ہے۔ اُس کا اتنا قصور نہیں ہے۔ اُسے نرمی سے سمجھا دیجیے گا۔ ویسے بھی اُس نے تو وہی کیا جو فی زمانہ آج کل چلن چل رہا ہے۔ ان پیکیجز نے ہماری اخلاقی اقدار کی مضبوط دیواروں میں دراڑ ڈال دی ہے۔ ہم لوگ مغرب والوں کی دی ہوئی سہولتوں سے فائدہ تو اٹھاتے ہیں مگر اُس کا صحیح استعمال کرنا نہیں جانتے۔ اور اگر بچوں کے اوپر اُن کے بساط سے بڑھ کر ذمے داری ڈال دی جائے تو وہ اپنی سمجھ کے مطابق ہی اُس ذمے داری کو نبھاتے ہیں۔ غلطی آپ سے ہوئی ہے اور اس کا ازالہ بھی آپ نے کرنا تھا۔ اور وہ کسی حد تک ہو بھی گیا ہے۔ آپ کو بھی اپنی کوتاہی کا احساس ہو گیا ہے۔ یہ کافی ہے۔ بس اب نفیسہ خالہ کی مغفرت اور بُلند درجات کے لیے دعا کریں۔ اللہ اُن کی مغفرت فرمائے۔'' ثمن نے کہا تو 'آمین!' صادقہ بیگم نے برجستہ کہا تھا اور شکیل بھائی نے تشکر آمیز نگاہوں سے صادقہ اور محسن کو دیکھتے ہوئے محسن اور صادقہ بیگم کے ساتھ نفیسہ بیگم مرحومہ کے لیے دعا کو ہاتھ اٹھا دیے تھے۔

☆☆......☆☆

''شکیل بھائی اور ثمینہ بھابی واقعی بہت شرمندہ تھے۔'' ثمن نے رات کے کھانے کے بعد صحن کی کھلی فضا میں بیٹھے محسن اور صادقہ کے لیے چائے لے کر صحن میں داخل ہو کر کہا تھا۔ ثمن ساس اور شوہر کو چائے سرو کر کے خود اپنی چائے لے کر قریب رکھی چیئر پر بیٹھ گئی تھی۔

''شکر ہے، شکیل بھائی نے اس بات کا برا نہیں منایا اور اپنی غلطی کو کھلے دل سے تسلیم بھی کر لیا۔ ورنہ آج کل تو لوگ اصلاحِ احوال کو اُلٹا انا کا مسئلہ بنا کر برا ماننے کے ساتھ قطع تعلق اختیار کر لیتے ہیں۔ اپنی غلطی کو مانتا ہے۔ ہر کسی میں ظرف کا پیمانہ الگ ہوتا ہے۔'' محسن نے رسانیت سے کہا تھا۔

''وہ اس لیے بیٹا کہ مرحومہ نفیسہ آپا نے اپنے بچوں کی تربیت بہت اچھی کی تھی۔ شادی کے دس سالوں میں بیوگی کی چادر اوڑھنے کے بعد چار چھوٹے چھوٹے بچوں کو بڑے حوصلے سے سنبھالا۔ محنت، مشقت کر کے بچوں کو رزقِ حلال کھلا کے پالا تھا۔ اپنی جوانی اولاد کی پرورش اور خوشیوں کی خاطر تج دی۔ کبھی کسی سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔ اسی لیے اولاد بھی اللہ کے کرم سے تابعدار تھی۔ بس اللہ مرحومہ کی مغفرت فرمائے اور سب کی اولادوں کو ماں باپ کا فرماں بردار، قدردان اور دین دار بنائے، آمین۔''

محسن اور ثمن نے ایک آواز میں آمین کہا تو صادقہ بیگم محبت اور نرمی سے بہو، بیٹے کی طرف مسکرا کے دیکھنے لگیں۔ اور ثمن سوچنے لگی کہ کاش! ایسی چھوٹی بڑی روزمرہ ہونے والی کوتاہیوں کا ادراک اگر ہم انسانوں کو بنا کسی کے احساس دلائے ہو جائے تو ہم سے بڑی بڑی غلطیاں سرزد نہ ہوں۔ جو ہمارے لیے شرمندگی اور ندامت کا باعث بنیں۔ آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟

☆☆......☆☆

عبدالہادی نے اچنبھے میں گھر کر یہ منظر ملاحظہ کیا تھا۔اس کے لیے تو یہ ہی بہت بڑا معجزہ تھا کہ علیزے نے خود کال کر کے اسے بلوایا تھا۔اس وقت وہ جامعہ میں تھا اور بچوں کو درس دے رہا تھا۔اس کے بعد ہی باقاعدہ کلاس لگتی تھی۔مگر وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ......

زندگی کے ساتھ سفر کرتے کرداروں کی فسوں گری، ایمان افروز ناول کا ساتواں حصہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بیک وقت حال و ماضی کے دریچوں سے جھانکنے والی یہ کہانی دیا سے شروع ہوتی ہے۔ جسے مرتد ہونے کا پچھتاوا، ملال، رنج، دکھ اور کرب کا احساس دل و دماغ کو شل کرتا محسوس ہوتا ہے۔ جو رب کو ناراض کر کے وحشتوں میں مبتلا ہے۔ گندگی اور پلیدگی کا احساس اتنا شدید ہے کہ وہ رب کے حضور سجدہ ریز ہونے میں مانع رکھتا ہے۔ مایوسی اس کی اتنی گہری ہے کہ رب جو رحمٰن ورحیم ہے، جس کا پہلا تعارف ہی یہی ہے۔ اسے یہی بنیادی بات بھلائے ہوئے ہے۔ دیا جو درحقیقت علیزے ہے اور اسلام آباد چاچا کے ہاں میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مکین ہے۔ یوسف کرسچن نوجوان جو اپنی خوبروئی کی بدولت بہت سی لڑکیوں کو استعمال کر چکا ہے۔ علیزے پر بھی جال پھینکتا ہے۔ علیزے جو دیا بن کر اس سے ملتی ہے اور پہلی ملاقات سے ہی یوسف سے متاثر ہو چکی ہے۔

یہ ملاقاتیں چونکہ غلط انداز میں ہو رہی ہیں۔ جبھی غلط نتائج مرتب کرتی ہیں۔ یوسف ہر ملاقات میں ہر حد پار کرتا ہے علیزے اسے روک نہیں پاتی مگر یہ انکشاف اس پر بجلی بن کر گرتا ہے کہ یوسف مسلمان نہیں ہے۔ دنیا میں آنے والے اپنے ناجائز بچے کو باپ کا نام اور شناخت دینے کو علیزے یوسف کے مجبور کرنے پر اپنا مذہب نا چاہتے ہوئے بھی چھوڑ کر عیسائیت اختیار کرتی ہے مگر ضمیر کی بے چینی اسے زیادہ دیر اس پر قائم نہیں رہنے دیتی۔ وہ عیسائیت اور یوسف دونوں کو چھوڑ کر رب کی ناراضگی کے احساس سمیت نیم دیوانی ہوتی سرگرداں ہے۔ سالہا سال گزرنے پر اس کا پھر سے بریرہ سے ٹکراؤ ہوتا ہے جو خیالات کی چکی میں پس کر خود بھی سراپا تغیر کی زد میں ہے۔ علیزے کی واپسی کی خواہاں ہے اور علیزے کی مایوسی اور اس کی بے اعتباری کو اُمید میں بدلنا چاہتی ہے۔ مگر یہ اتنا آسان نہیں۔

علیزے اور بریرہ جن کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے۔ بریرہ علیزے کی بڑی بہن مذہب کے معاملے میں بہت شدت پسندانہ رویہ رکھتی تھی۔ اتنا شدت پسندانہ کہ اس کے اس رویے سے اکثر اس سے وابستہ رشتوں کو تکلیف سے دوچار ہونا پڑا۔ خاص کر علیزے...... جس پر علیزے کی بڑی بہن ہونے کے ناتے پوری اجارہ داری ہے۔ عبدالغنی ان کا بڑا بھائی ہے۔ بریرہ سے بالکل متضاد صرف پرہیزگار نہیں عاجزی وانکساری جس کے ہر انداز سے جھلکتی ہے اور اسیر کرتی ہے۔ درپردہ بریرہ اپنے بھائی سے بھی خائف ہے۔ وہ صحیح معنوں میں پرہیزگاری و نیکی میں خود سے آگے کسی کو دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ ہارون اسرار شوبز کی دنیا میں بے حد حسین اور معروف شخصیت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ گھر کی دینی محفل میں وہ بریرہ کی پہلے آواز اور پھر حسن کا اسیر ہو کر

اس سے شادی کا خواہاں ہے۔ مگر بریرہ ایک گمراہ انسان سے شادی پر ہرگز آمادہ نہیں۔ ہارون اس کے انکار پر اس سے بات کرنے خودان کے ہاں آتا ہے اور شوبز تک چھوڑنے پر آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے رضامند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہیں اس موقع پر اس کی پہلی ملاقات عبدالغنی سے ہوتی ہے۔ ہارون اسرار کسی بھی صورت عبدالغنی کو اس رشتہ پر رضامندی پر التجا کرتا ہے۔ عبدالغنی سے تعاون کا یقین پا کر وہ مطمئن ہے۔ اسے عبدالغنی کی باوقار اور شاندار شخصیت بہت بھاتی ہے۔ محلے کا اوباش لڑکا علیزے میں دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ جس کا علم بریرہ کو ہونے پر بریرہ علیزے کی کردار کشی کرتی ہے۔ علیزے اس الزام پر سوائے دل برداشتہ ہونے کے اور کوئی صفائی پیش کرنے سے لاچار ہے۔

اسامہ ہارون اسرار کا چھوٹا بھائی حادثے میں اپنی ٹانگیں گنوا چکا ہے۔ ہارون کی ممی اپنی یتیم بھتیجی سارہ سے زبردستی اس کا نکاح کراتی ہیں۔ جس کے لیے اسامہ ہرگز راضی نہیں اور نہ ہی سارہ کو اس کے حقوق دینے پر آمادہ ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے سارہ کی اچھائی کی وجہ سے وہ اس کا اسیر ہونے لگتا ہے اور بالآخر اس کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ لاریب سارہ کی چھوٹی بہن جو بہت لاابالی نظر آتی ہے۔ ہارون کے ہمراہ کالج واپسی پر پہلی بار عبدالغنی کو دیکھ کر اس کی شخصیت کے سحر میں خود کو جکڑا محسوس کرنے لگتی ہے۔ لاریب کی دلچسپی عبدالغنی کی ذات میں بڑھتی ہے۔ جسے بریرہ اپنی منگنی کی تقریب میں خصوصاً محسوس کر جاتی ہے۔ لاریب محبت کی راہوں کی تنہا مسافر ہے۔ عبدالغنی انجان بھی ہے اور لاتعلق بھی۔ لاریب کے لیے یہ بات بہت تکلیف کا باعث ہے کہ وہ کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گا۔ علیزے لاریب کی ہم عمر ہے۔ دونوں میں دوستی بھی بہت ہو چکی ہے۔ وہ لاریب کی اپنے بھائی میں دلچسپی کی بھی گواہ ہے مگر وہ لاریب کی طرح ہرگز مایوس نہیں ہے۔

شادی کے موقع پر بریرہ کا رویہ ہارون کے ساتھ بھی بہت لیا دیا اور سرد مہری نہیں حاکمیت آمیز بھی ہے۔

اسے ہارون کے ہر اقدام پر اعتراض ہے۔ وہ اس پر ہر قسم کی پابندیاں عائد کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھتی ہے اور اس کی ساتھی اداکارہ سوہا کی ہارون سے بے تکلفی اسے سخت گراں گزرتی ہے۔ ممی کو اپنی بیٹی کا عبدالغنی جیسے نوجوان میں دلچسپی لینا ایک آنکھ نہیں بھاتا جبھی ایک معمولی بات پر وہ لاریب کے سامنے عبدالغنی کی بے حد تحقیر کرتی ہیں۔ اس سے پہلے وہ لاریب کو بھی جتلا چکی ہوتی ہیں کہ وہ ایسے خواب دیکھنا چھوڑ دے۔ لاریب کو عبدالغنی سے روا رکھا جانے والا ممی کا رویہ بغاوت پر ابھارتا ہے۔ وہ تمام لحاظ بھلائے جواب تک اس کے قدموں کو اس راہ پر آگے بڑھنے سے روکے تھے اپنا گھر چھوڑ کر عبدالغنی کے پاس آ کر عبدالغنی سے خود کو اپنانے کی گزارش کرتی ہے۔ عبدالغنی اس کی جذباتی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اسے بہلا، سمجھا کر واپس بھیجتا ہے۔ مگر لاریب اس مصالحانہ عمل کو سمجھے بغیر اسے اپنی ریجیکشن اور تذلیل سمجھتے ہوئے شدید ہیجان میں مبتلا ایکسیڈنٹ کروا بیٹھتی ہے۔ ممی اس کی حالت پر حراساں جبکہ لاریب اسی ہسٹریائی کیفیت میں مبتلا عبدالغنی کے حوالے سے اپنی ہر شدت اور شدت پسندانہ بے بسی ان کے سامنے عیاں کر جاتی ہے۔ ممی جو بریرہ کے حاکمانہ رویے اور ناشکرانہ انداز کی بدولت سخت دل برداشتہ ہیں اور اپنی بیٹی کو اس کے بھائی کے حوالے کرنے میں شامل ہیں۔ لاریب کی خوشی کی خاطر اس شادی پر بالآخر آمادہ ہونے پر ایک بار پھر مجبور ہو جاتی ہیں۔ لاریب کی دائمی مسکراہٹ کی چاہ انہیں عبدالغنی کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کرتی ہے۔

بریرہ لاریب کو ناپسند کرتی ہے۔ جبھی اسے یہ اقدام ہرگز پسند نہیں آتا مگر وہ شادی کو روکنے سے قاصر ہے۔ لاریب عبدالغنی جیسے منکسر المزاج بندے کی قربتوں میں جتنا سنورتی ہے۔ ہارون بریرہ کے حوالے سے اسی قدر اذیتوں کا شکار ہے۔ لیکن اس وقت تنہا ہوتی ہے۔ جب وہ علیزے کے حوالے سے اس پر الزام عائد کرتی ہے۔ صرف ہارون نہیں...... اس سطحی حرکت کے بعد علیزے بھی بریرہ سے نفرت پہ مجبور ہو جاتی ہے۔ وقت کچھ اور آگے سرکتا ہے۔ بریرہ کے دل شکن رویے کے باوجود ہارون اس کی توجہ کا منتظر بار بار اس کی طرف پیش رفت کرتا ہے۔ اس خواہش کے ساتھ کہ وہ بھی لاریب کی طرح سدھار کا متمنی ہے۔ مگر بریرہ جو علیزے کی بے راہ روی کا باعث خود کو گردانتی ہے اور احساس جرم میں مبتلا رب کو منانے ہر صورت علیزے کی واپسی کی ملتمس ہے۔ ہارون کے ہر احساس سے گویا بے نیاز ہو چکی ہے۔ ہارون اس بے نیازی کو لاتعلقی اور بے گانگی سے تعبیر کرتے ہوئے مایوسی کی انتھاہ گہرائیوں میں اترتا نا صرف شوبز کی دنیا میں دوبارہ داخل ہوتا ہے بلکہ ضد میں آ کر بریرہ کو جھنجوڑنے کی خاطر سوہا سے شادی بھی کر لیتا ہے۔ علیزے کے حوالے سے بالآخر بریرہ کی دُعائیں مستجاب ہوتی ہیں۔ لیکن تب تک ہارون کے حوالے سے گہرا نقصان اس کی جھولی میں آن گرا ہوتا ہے۔

علیزے کی واپسی کے بعد عبدالغنی سمیت اس کے والدین بھی علیزے کے رشتے کے لیے پریشان ہیں۔ علیزے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد خود بھی یہ علم بانٹ رہی ہے۔ عبدالہادی اپنے روحانی استاد کے زیر تربیت ایک کامل مومن کی شکل میں ان کے سامنے ہے۔ وہ اسے نور کی روشنی پھیلانے کو ہجرت کا حکم دیتے ہیں۔

میرا ایک بدفطرت عورت کے بطن سے جنم لینے والی باکردار اور باحیا لڑکی ہے۔ جسے اپنی ماں بہن کا طرز زندگی بالکل پسند نہیں۔ وہ اپنی ناموس کی حفاظت کرنا چاہتی ہے۔ مگر حالات کے تارِ عنکبوت نے اسے اپنے منحوس پنجوں میں جکڑ لیا ہے۔ کامیاب علاج کے بعد اسامہ پھر سے اپنے پیروں پر چلنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اسامہ چونکہ فطرتاً کاملیت پسند ہے۔ کسی بھی چیز کا ادھورا پن اسے ہرگز گوارا نہیں مگر اس کے بیٹے میں بتدریج پیدا ہونے والی معذوری کا انکشاف اسے سارہ کے لیے ایک سخت گیر شوہر، متکبر انسان کے طور پر متعارف کراتا ہے۔ وہ ہرگز اس کمی کے ساتھ بچے کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔

(اب آپ آگے پڑھیے)

''میں خود کو شاید کبھی معاف نہ کر سکوں گا ممی! میری وجہ سے آپ اس نوبت تک پہنچ گئیں۔'' وہ یونہی ان سے لپٹا کسی بچے کی طرح سسکیاں بھر رہا تھا۔ علیزے کے چہرے پر زہر خند پھیل گیا۔ کچھ کہے بغیر وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹی تھی۔ ہاتھ باندھے کھڑی ملازمہ جو مخصوص قسم کے جدید تراش خراش کے پینٹ کوٹ میں ملبوس تھی، اسے منتظر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''جی میم!'' وہ گویا حکم کی منتظر تھی۔

''میں یہاں نہیں رک سکتی۔ کیا میرے لیے کوئی کمرہ تیار ہوا ہے؟'' وہ سرد آواز میں سوال کر رہی تھی ملازمہ نے سر مؤدب انداز میں تسلیم خم کیا۔

''جی میم! مادام نے آپ کی آمد کی اطلاع پا کر خصوصی طور پر کمرہ تیار کروایا ہے، آیئے۔'' علیزے کچھ کہے بغیر اس کے ہمراہ ہو لی تھی۔ کارپٹ سے سجی طویل راہداریاں عبور کر کے وہ جس کمرے میں لائی گئی، وہ اس خواب گاہ سے ہرگز کم آرائش زدہ نہیں تھا جس سے وہ ابھی نکلی تھی۔

''آپ فریش ہو جائیں، میں تب تک چائے کا انتظام کراتی ہوں، اس کے علاوہ کچھ چاہیے تو حکم فرمائیں۔'' ملازمہ کا اردو لہجہ بھی انگلش لیے ہوئے تھا علیزے نے نفی میں سر کو جنبش دی تھی اور صوفے پہ چادر اتار کر رکھ دی۔ دوپٹہ گلے سے نکالا اور واش روم میں بند ہو گئی۔ منہ ہاتھ گرم پانی سے دھو کر بال سنوارے اور پلٹ کر کمرے میں آتے ہی عبدالہادی کو موجود پا کر اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئی تھیں۔

''تو کیا تم بھی یہیں رہو گے؟ اسی کمرے میں؟''

وہ اس کے ہاتھ میں اس کا سفری بیگ دیکھ کر تلخ ہوئی۔

عبدالہادی نے چونک کر اسے دیکھا پھر پہلے بیگ سائیڈ پہ رکھا پھر صوفے پر ٹکتے ہوئے کلائی پہ بندھی واچ کھول کر میز پر ڈالی تھی۔

''یہ سوال میرا خیال ہے بے معنی ہے۔ ظاہری بات ہے۔'' اس کا لہجہ نہ جانے کیوں خشک سا تھا۔ علیزے نے محسوس کیا تھا اور قہر سے بھرنے لگی۔

''مگر میں یہ ضروری نہیں سمجھتی۔'' وہ زور سے چیخی تھی اور اپنی چادر اٹھا کر اوڑھی۔

''آپ کو میری والدہ سے ملنا چاہیے تھا۔ یہ بہت غیر اخلاقی حرکت تھی کہ.....'' وہ غصے میں بولتا یکدم خاموش ہوا جیسے غلطی کا بروقت احساس ہونے پہ خود کو زبردستی روکا ہو۔ علیزے اسے جھلتی، طنز آمیز نظروں سے دیکھتی رہی۔

''دل دکھانا بہت غلط حرکت ہے علیزے! وہ بیمار بھی ہیں۔ آپ کی اس حرکت سے انہیں تکلیف ہوئی ہے۔'' وہ جیسے بہت بے بسی کی کیفیت میں مبتلا ہو کر بولا تھا۔

''تم آگئے ہو نا ہر قسم کا ازالہ کرنے کو، تمام ارمان نکال لو۔ میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے، یہ بھی جان لوں گی میں۔ اور سنو...... میں کسی غیر مسلم کو سلام کرنا ضروری نہیں سمجھتی۔'' وہ جواباً جو منہ میں آیا کہہ گئی، عبدالہادی نے سرد آہ بھری تھی۔

''بہت پچھتاوا ہے تمہیں......؟'' اس کی آنکھوں میں حقارت اترنے لگی۔

''عنقریب تم اعتراف کرو گے۔ تم نے یہ سب دکھاوے کو کیا تھا۔ تم آج بھی عیسائی ہو۔ مانو گے ناں؟''

وہ کف اڑانے لگی۔ عبدالہادی خاموش رہا، چپ سادھے رکھی۔ علیزے کی آنکھوں میں غصے کی جگہ دکھ اترنے لگا

، گہرا صدمہ، رنج ملال، تاسف، نمی۔

"کاش...... کاش اس سے پہلے کہ تم میری زندگی میں آتے مجھے موت آ جاتی۔ یہ سزا تو بہت کٹھن ہے۔" وہ گھٹ گھٹ کر رونے لگی عبدالہادی مضطرب نظر آنے لگا۔

"حدیث مبارکہ ہے رسول ﷺ نے فرمایا! اللہ کی قسم اگر تمہارے ذریعے ایک آدمی کو بھی ہدایت مل جائے تو وہ تیرے لیے سرخ اونٹنیوں سے بھی بہتر ہے۔ علیزے! آپ کی تسلی اور خوش بختی کے لیے یہ کافی نہیں کہ آپ صرف ایک نہیں، دو انسانوں کے لیے ہدایت کا ذریعہ بنی ہیں۔ ممی اسلام قبول کر چکی ہیں۔ یہ میرے لیے عظیم خوشخبری ہے۔ میں آپ کی بدولت اس نعمت سے سرفراز ہوا اور ممی میری وجہ سے۔ وسیلہ تو آپ ہی ٹھہری ہیں۔" وہ کتنی عاجزی سے کہہ رہا تھا۔ علیزے رونا بھول گئی تھی گویا۔

"خدا جب اپنا آپ منوانا چاہتا ہے۔ اپنا اعتراف کروانا چاہتا ہے۔ تو پھر وہ چھین لیتا ہے۔ جس کے بغیر جینا سب سے مشکل ہو، جو غفلت کا باعث ہو۔ اس نے مجھ سے آپ کو چھینا تھا۔ مقصد توجہ اپنی جانب دلانا تھا۔ ممی تو وہ تھیں جن سے اپنے بھائی کا مسلم ہونا برداشت نہیں ہوا تھا۔ اور جواباً ایک چال انہوں نے چلی تھی مگر جو داؤ اللہ کا ہوتا ہے، وہ سب سے بہترین ہوا کرتا ہے۔ یہ اللہ کا داؤ تھا، جو آج ہم سے اپنا آپ تسلیم کروا چکا۔ میں کیوں یہ امید چھوڑ دوں کہ ایک دن وہ آپ کے دل میں بھی یہ یقین ڈال دے گا۔" اس کا لہجہ نرم تھا۔ اس کا انداز معمول کا تھا۔ علیزے لاجواب تھی، گنگ تھی۔

"ممی چل نہیں سکتیں، ورنہ خود یہاں آ کر تم سے ملتیں۔ انہیں اپنی اکلوتی بہو سے ملنے اور اس سے باتیں کرنے اور جی بھر کے دیکھنے کا بہت ارمان ہے، اپنے بیٹے کی طرح۔ ہو سکے تو ان کی یہ خواہش ضرور پوری کر دیجیے گا۔ اللہ راضی ہو آپ سے۔" اس کا گال تھپک کر کہتا وہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ علیزے یونہی ساکن بیٹھی تھی، یقین و غیر یقینی کے درمیان ڈولتی ہوئی، مضطرب، بے چین، بے قرار، اسے یاد آیا تھا۔

اس نے علیزے سے کہا تھا۔

"بعض دفعہ خاموشی وجود پر نہیں دل پر اترتی ہے۔ پھر اس سے زیادہ بامعنی، مکمل اور خوبصورت گفتگو کوئی اور چیز نہیں کر سکتی اور یہ گفتگو انسان کی ساری زندگی کا حاصل ہوتی ہے۔ اور اس گفتگو کے بعد پھر دوبارہ خود سے کچھ کہنا اور سمجھانا نہیں پڑتا۔ کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ الہام ہوتے ہیں۔ جو اللہ کی طرف سے اتارے جاتے ہیں، مکمل پہچان کے ساتھ۔ میں خود سے یہ گفتگو کر چکا ہوں۔" پتا نہیں کیسا تاثر تھا جو دل میں مغلوب تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اگلی صبح جب ملازمہ اس سے ناشتے کا پوچھنے آئی اس نے منع کر دیا تھا۔

"وہ...... عبدالہادی کی والدہ...... انہوں نے ناشتا کر لیا؟"

"مادام پرہیزی کھانا کھاتی ہیں۔ اور بہت تھوڑا سا۔" ملازمہ نے حیرانی سے جواب دیا تھا۔

"کھا چکیں......؟" علیزے کا سوال اپنی جگہ تھا۔ "ان کے ساتھ ہی میرا کھانا لے کر آنا ان کے کمرے میں۔ مجھے وہاں ان کے روم تک چھوڑ آؤ۔" اتنے بڑے گھر کی بھل بھلیوں میں کھو جانے سے خائف تھی وہ۔ ملازمہ نے مخصوص مؤدب انداز میں اس کی اس کمرے تک رہنمائی کی تھی جہاں ایک نرس ہر وقت ان کی خدمت پر مامور رہتی تھی اس وقت بھی موجود تھی۔ علیزے کو اندر داخل ہوتا پا کر وہ مؤدبانہ اٹھ کر جھکی تھی۔

"السلام وعلیکم!" علیزے بڑھ کر ان کی پائنتی کی جانب رک کر بولی تھی۔ انہوں نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور چند لمحوں کو غیر یقینی سے اسے دیکھتی رہ گئی تھیں۔ پھر ان کے زرد چہرے پر جیسے روشنی سی چھا گئی ہو۔ سلام کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے اسی والہانہ

انداز میں بانہیں پھیلائی تھیں، جیسے عبدالہادی کو روبرو پا کے اسے سینے سے لگانے کی تڑپ لیے ہوئے تھیں۔ علیزے جھکتی ہوئی ان کے قریب آئی، انہوں نے بے حد محبت سے اسے خود میں سمو لیا تھا۔

"ماشاء اللہ! بہت خوب صورت ہو۔ عبدالہادی صحیح تمہارا اسیر ہوا تھا۔" اس کا چہرہ ہاتھوں میں بھر کے وہ وفورِ شوق سے گویا ہوئی تھیں۔ علیزے کی رنگت یکدم بے تحاشا سرخ پڑگئی، لانبی پلکیں مغلوب انداز میں لرز کر جھک گئیں۔

"میں آپ سے کل نہیں ملی، مجھے بہت افسوس ہے۔" اس نے بات بدل دی۔ ممی نرمی سے مسکرانے لگیں۔

"کوئی بات نہیں بیٹی! مجھے تمہاری تھکاوٹ کا احساس تھا۔ بلکہ مجھے افسوس اور شرمندگی ہے کہ میں تمہارے شایانِ شان استقبال نہیں کر سکی۔ اس بیماری نے کچھ کرنے کے قابل چھوڑا ہی نہیں۔" وہ ملول اور افسردہ نظر آنے لگیں۔

"عبدالہادی بتا رہے تھے کہ آپ اسلام قبول کر چکی ہیں۔" علیزے نے دل میں مچلتا سوال بالآخر کر لیا تھا۔ اسی سوال کا جواب جاننے کی تمنا اسے یہاں لے آئی تھی۔

"الحمدللہ! اللہ نے مجھے یہ نعمت بخشی ہے۔" وہ طمانیت سے مسکرائی تھیں۔ علیزے کی ہرگز تشفی نہیں ہو سکتی تھی، اتنے سے مختصر جواب سے۔

"یہ کیسے ممکن ہو سکا؟ میں نے تو سنا تھا، آپ اپنے بھائی کے اسلام لانے پر بہت برانگیختہ تھیں۔ اپنے بیٹے کو بے دخل کر دیا تھا، ہر شے سے خود سمیت...... کجا خود......" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ٹھیک کہا بیٹے! میرے لیے میرا بھائی سب کچھ تھا۔ پھر میرا بیٹا! یہ وسیع جائیداد، روپیا پیسا مجھے کبھی بھی اتنا عزیز نہیں تھا جتنے یہ دونوں اشخاص۔ جب ایک کے بعد دوسرا بھی مجھے چھوڑ کر اسی راستے کا اسیر ہوا تو پیچھے وحشت اور تنہائی میرا مقدر ٹھہرے تھے۔ ایسی تنہائی اور وحشت، جہاں حواس کھو کر انسان خودکشی جیسے اقدام کا بھی مرتکب ہوا کرتا ہے۔ میں نے بھی کی۔ میرے لیے یہ حقیقت قابلِ قبول نہیں تھی کہ میرا بیٹا بھی میرے بھائی کی طرح خود راضی بارضا ہو کر مشرفِ اسلام ہوا ہے۔ وہ عورتیں تو بہانا تھیں، ورنہ اصل مقصد تو اسلام کی قبولیت تھا۔ کیوں......؟ میرے اندر اتنا شور تھا، ایسی قیامتیں تھیں جو پورے وجود کو تہہ بالا کیے رکھتی تھیں۔ ان دنوں میں ذات کے ایسے جنگلوں میں بھٹک رہی تھی، جہاں بیرونی دنیا کے تعلق اور حوالے کا رابطہ منقطع ہو جایا کرتا ہے۔ میں کسی سے بات نہیں کرتی تھی۔ میں ہر دم، ہر پل اس سوال کا جواب کھوجتی تھی۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟ میرے ساتھ ہی کیوں؟ اور ایک دن مجھے اس کا جواب مل ہی گیا، جانتی ہو کیسے......؟"

وہ بولتے ہوئے یکدم تھم گئیں، علیزے جو مبہوت سن رہی تھی، حیران نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"کیوں کہ...... اللہ یہ چاہتا تھا۔ وہ مجھ سے اپنا آپ تسلیم کرانا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے جتلایا تم نے میری ایک بندی کو راہ سے بھٹکانا چاہا مگر ایسا نہ کر سکیں، وہ تو پھر میری بن گئی۔ دیکھو...... میں نے تم سے سب کچھ چھین لیا۔ تمہاری اصل دولت، تمہارا بیٹا وہی بیٹا، جس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہ تھا تمہارے پاس۔ اب تم جی رہی ہو مگر یہ زندگی موت سے بدتر ہے۔ میں نے بہت پہلے کہیں یہ الفاظ پڑھے تھے کہ ایک اللہ کی رضا ہے اور ایک بندے کی رضا ہے اور میں نے خود کو ذلیل ہوتے محسوس کر لیا۔ میں نے تسلیم کر لیا میں نے مان لیا۔ وہ جو منوانا چاہتا تھا میں جان گئی تھی۔ میری بقاء اسی میں ہے کہ میں اس کو مان لوں جب مان لیا تو اس نے میری دولت، میری خوشی مجھے واپس لوٹا دی۔ وہ بے شک اپنے وعدوں میں بہت سچا ہے۔"

وہ خاموش ہو گئیں۔ علیزے خاموش بیٹھی رہی۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ ملازمہ ناشتا لیے منتظر تھی، ممی نے اس کی توجہ اس کی جانب دلائی۔ وہ بے دلی سے

ناشتا کرنے لگی۔ نرس انہیں سوپ پلانا شروع کر چکی تھی، ان کی کمر پر تکیہ لگائے، سہارا دیتے۔

''میرا بیٹا بہت بدل گیا ہے۔ بلکہ پیارا لگنے لگا ہے۔ پہلے سے میں نے اسے بہت سنجیدہ محسوس کیا ہے۔ مگر مجھے یقین ہے وہ تمہیں پا کر خوش ہوگا۔'' انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مزید سوپ پینے سے منع کر دیا اور پھر نیم دراز ہو کر اس سے ہم کلام ہوئی تھیں۔ علیزے کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

''تم خوش ہو بیٹے؟'' انہوں نے سوال ہی نہیں کیا۔ اس کا ہاتھ بھی تھام لیا تھا۔ علیزے نظریں چرا گئی۔ وہ یک ٹک اس کا چہرہ تکتی رہی تھیں، اک آس لیے۔

''تمہاری آنکھیں بہت حسین ہیں۔ بہت چمکدار اور دن کی روشنی کی مانند اجلی، سورج کی پہلی کرن جیسی روشن روشن۔'' وہ بہت محبت بھرے نرم گرم انداز میں کہہ رہی تھیں۔ علیزے خفیف سی ہو گئی۔

''میں نے عبدالہادی سے بھی کل کہا تھا۔ تم سے بھی کہہ رہی ہوں۔ بیٹے! میری خواہش ہے تمہیں دلہن بنے دیکھوں۔ اپنے بیٹے کے سر پہ سہرا سجانے کی خواہش بہت شدید رہی ہے۔ کچھ رسمیں بھی ادا کرنی ضروری ہیں۔ کیا تم میری یہ خواہش پوری کر سکتی ہو؟'' وہ سوال کر رہی تھیں۔ علیزے کی توجہ ہٹ گئی کہ دروازہ ناک ہوا تھا۔ عبدالہادی اندر داخل ہوا اور جیسے پہلے ہی مرحلے پر ٹھٹک کر رہ گیا۔ اسے وہاں دیکھنا اس کے چہرے پہ ایک امید کی روشنی، ایک خوشی کا تاثر پھیلا گیا تھا۔ دونوں کی نظریں لمحہ بھر کو چار ہوئی تھیں۔ نگاہ چھڑانے اور چرانے میں پہل علیزے نے کی۔ اس کی خوشگوار، پرُامید نظروں کو سہنا، تاب لانا بہرحال علیزے کی بس کی بات نہیں تھی۔ ابھی رات ہی تو ان کے درمیان اچھی خاصی تلخی ہوئی تھی۔ وہ ہرگز بھی اس کے ساتھ ایک کمرے میں رہنے کو آمادہ نہیں تھی۔ ہوٹل کے ایک کمرے میں رات گزارنے کا جو تجربہ ہوا تھا وہ اسے محتاط کرنے کو کافی تھا۔

اس کی آنکھ کسی احساس کے تحت کھلی تو اسے اپنے اوپر جھکے پا کر وہ اپنی دھڑکنیں تھمتی محسوس کرنے لگی تھی۔

یوں ہم سے روٹھ کر سونا بھی ٹھیک نہیں
اک بار تو یاد کر لیتے تاکہ ہمیں بھی نیند آ جاتی

وہ عجیب سے بہکے ہوئے انداز میں گویا تھا۔ علیزے کی روح فنا ہونے لگی تھی۔ گویا اسے صحیح معنوں میں صورتِ حال کی گھمبیرتا کا اندازہ ہوا تھا۔ رات کا وقت، تنہائی، مابین کے تعلق کا احساس...... ایسے میں اتنی سی بے تکلفی تو عام بات تھی۔ علیزے کو اس سے زیادہ خود پر غصہ آیا۔ بھلا وہ اس اہم بات کو کیونکر فراموش کر گئی تھی۔ جو اس پر اتنا یقین کر بیٹھی تھی۔

''کیوں پریشان ہوتی ہیں۔ کمبل کے بغیر سکڑ کے سو رہی تھیں، کمبل درست کر رہا تھا بس۔'' اس کی سہمی ہوئی نظروں کے جواب میں عبدالہادی نے وضاحت دی تھی مگر آنچ دیتے لہجے میں جو تپش اور سلگن تھی اسے بخوبی سمجھ سکتی تھی۔ وہ عبدالہادی نے گہرا سانس بھرا اور فاصلہ بڑھا کر اپنے بستر پہ چلا گیا۔ علیزے صوفے پر مزید سکڑ گئی تھی۔ نماز سے فراغت کے بعد وہ اپنی شال اوڑھ کر صوفے پر سو گئی تھی۔ کمبل ہی ایک تھا ظاہر ہے جو وہ اسے اوڑھا چکا تھا۔

''مجھے بھی وہ نسخہ سمجھا دیں۔'' اپنی جگہ پر نیم دراز ہو جانے کے بعد بھی وہ نیم باز آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''اتنی بے فکری سے سو جانے کا۔ قسم سے سخت بے سکون ہوں'' اپنی بات معنی خیز وقفے سے مکمل کر کے وہ زیرِ لب مسکرانے لگا جبکہ علیزے کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ اسے اپنے اور عبدالہادی کے درمیان کا فاصلہ یکدم بے معنی لگا۔ اتنی دوری کے باوجود وہ جیسے محض اس کی نظروں کی تپش پا کر پور پور سلگ اٹھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے کروٹ بدلی اور رخ دوسری جانب پھیر لیا، گویا بے نیاز ہوئی مگر عبدالہادی پہ جانے کیوں شرارت سوار ہونے لگی تھی۔

بہت ظالم ہو یہ طے ہوا یعنی

وہ آہ بھر کے کہہ رہا تھا پھر مزید گویا ہوا۔

جان بلب دیکھ کے مجھ کو میرے عیسیٰ نے کہا
لادوا درد ہے یہ کیا کروں مر جانے دو
گر محبت ہے تو وہ مجھ سے پھرے گا نہ کبھی
غم نہیں ہے مجھے غماز کو بھڑکانے دو

علیزے کی جان جل کر خاک ہوئی تھی۔ ضبط انتہا درجے پہ پہنچا، جب ہی کمبل جھٹک کر تیزی سے اٹھی اور جوتے پہنے بغیر بالکنی کی جانب لپکی تھی کہ عبدالہادی نے بے اختیار ہوتے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

ٹھہرو تیوری کو چڑھاتے ہوئے جاتے ہو کدھر
دل کا صدمہ تو ابھی سر سے اتر جانے دو

علیزے دھک سے رہ گئی۔ اس نے مضطرب ہوتے نگاہ بھر کے اسے دیکھا۔ وہ اسے وہی یوسف لگا تھا۔ ہو بہو وہی، اشعار پڑھتا، نفس کے آگے ہارا ہوا انسان۔

ایک عالم نظر آئے گا گرفتار تمہیں
اپنے گیسوئے رسا تا بہ کمر جانے دو

اس نے اسی شریر انداز میں ہاتھ بڑھایا اور اس کے جوڑے میں بندھے بال کھول دیے۔ علیزے کے اندر ایسا تنفر، ایسی نفرت اتری تھی جو پورے وجود کو اپنے زہر سے نیلا کر دے۔ کچھ کہے بغیر اس نے قہر خیز انداز میں ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑوایا اور تقریباً دوڑتے ہوئے دروازہ پار کر گئی۔ سرد ہواؤں کی شوریدہ سری کو اپنے وجود پر سہتی وہ بری طرح سے روتی رہی تھی۔ عبدالہادی کو اپنی غلطی کا احساس اس کے شدید ردعمل سے ہوا تھا۔

''آئی ایم سوری! میں تو محض مذاق کر رہا تھا۔'' وہ کتنا شرمسار لگ رہا تھا ہر انداز سے۔

''اندر تو آجائیں سردی میں بیمار پڑ جائیں گی۔''

جواب میں علیزے نے جن نظروں سے دیکھا تھا اسے وہ جیسے خود کو زمین میں گڑا ہوا محسوس کرنے لگا۔

''یہی ہے اصل روپ تمہارا یہی۔ مان کیوں نہیں لیتے؟'' وہ حلق کے بل چیخ پڑی۔ عبدالہادی کے وجیہہ چہرے پر ایک لمحے میں کتنے رنگ آ کر گزر گئے تھے۔

''ہمارے مابین تعلق مجھے کبھی کبھار یہ اہم بات فراموش کرا دیتا ہے علیزے کہ آپ کتنی نفرت کرتی ہیں مجھ سے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میرا یہ عمل ناقابلِ معافی ہے نہ معذرت طلب، بہرحال غلطی میری ہے۔ مجھے یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ میری محبت سے کہیں زیادہ طاقتور ہے آپ کی نفرت......اور مجھے خود کو اس کے دائرے سے باہر نہیں نکالنا چاہیے۔ اگین سوری۔'' وہ بولا تو اس کا لہجہ بوجھل تھا۔ اس کے بعد وہ رکا نہیں تھا۔

علیزے نے اس کی کسی بات پہ دھیان نہیں لگایا تھا۔ اسے ضرورت نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں آنے کے بعد وہ اس کے ساتھ بیڈروم شیئر کرنے کے خیال سے ہی بدک اٹھی تھی اور اس سے الجھنے کھڑی ہو گئی۔

''والدہ بہت بیمار ہیں۔'' پلیز علیزے! انہیں ملازموں کے تھرو یہ خبر مل جائے گی کہ ہم الگ رہ رہے ہیں۔ انہیں تکلیف نہیں دینا چاہتا میں اسی لیے......''

''تم بس اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہو مگر سن لو! میں تمہیں اس میں کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔'' وہ اس کی بات قطع کر کے غرائی تھی۔ عبدالہادی نے جواباً آنکھوں میں اس کی آنکھیں گاڑ دی تھیں۔

''کون سا مقصد......؟ کس مقصد کی بات کر رہی ہیں آپ علیزے؟ واضح رہے ہماری شادی کو کتنے دن گزر گئے۔ آپ میرے گھر یہ میری پہنچ سے کبھی دور نہیں تھیں۔ میں مقاصد حاصل کرنے والا ہوتا تو......''

اس نے یکلخت بات ادھوری چھوڑ دی تو اس کی وجہ علیزے کا سفید پڑتا ہوا چہرہ تھا۔ عبدالہادی نے ہونٹ بھینچ کر خود کو کمپوز کیا تھا۔

''یہاں اس بیڈروم میں اسٹڈی بھی ہے اٹیچ اور ڈریسنگ روم بھی اتنا وسیع ہے کہ میں باآسانی وہاں قیام کر سکتا ہوں۔ میں یقین دلاتا ہوں میری وجہ سے

آپ کو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔"

اس کا انداز اتنا ملتجی، اتنا عاجزانہ تھا کہ وہ جتنا بھی جھنجھلاتی مگر کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ اس کے بعد وہ واقعی جیسے وہاں موجود ہوکر بھی کہیں نہیں رہا تھا لیکن یہ بھی سچ تھا کہ علیزے بہر حال اس پر اعتماد نہیں کرتی تھی، نہیں کر سکتی تھی۔

"آپ کیسا محسوس کر رہی ہیں ممی!" عبدالہادی اس طرح ان کے پاس آکر بیٹھا تھا کہ علیزے اس کے پہلو میں آگئی تھی۔ وہ جز بز ہوئی تھی اور فاصلہ کچھ اور بڑھایا۔

"تمہاری دلہن کو دیکھ کر بہت دنوں بعد بڑے دل سے خوش ہوئی ہوں میں تو، مگر مجھے یہ بچی کچھ بہتر نہیں لگتی۔ سست، بے زار اور نڈھال محسوس ہوتی ہے۔ تم اس کا خیال نہیں رکھتے یا طبیعت ٹھیک نہیں۔"

عبدالہادی ان کا ہاتھ سہلاتے ہوئے مستفر ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے ساتھ اس کی توجہ بھی علیزے کی جانب مبذول کرلی تو علیزے واقعی گڑ بڑا کر رہ گئی۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ کہہ پاتی وہ خود ہی قیاس آرائی میں مشغول ہوئیں۔

"مجھے لگتا ہے تم باپ بننے والے ہو بیٹے! ہماری بہو اسی لیے اتنی سست ہو رہی ہے۔" ان کی نحیف آواز میں جیسے یکدم اک زندگی کا احساس اتر آیا۔ امید، خوشی، جوش، علیزے نے بے ساختہ قسم کی گھبراہٹ میں مبتلا ہوتے سٹپٹا کر عبدالہادی کو دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ نگاہ ملنے پہ مسکراہٹ دبالی۔ علیزے کا چہرہ اشتعال اور خفت کی زیادتی سے دہک کر انگارہ ہونے لگا۔

"ایسا نہیں ہے ممی!" علیزے کی بے چینی اور اضطراب کو محسوس کرتا ہوا وہ وضاحت پیش کر رہا تھا مگر ممی کو یہی بات پسند نہیں آسکی تھی۔

"کیوں نہیں ہوسکتا؟ تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو۔ مجھے تو یقین ہے ایسی ہی بات ہوگی۔ بیشک ڈاکٹر سے ٹیسٹ کروالو۔" انہوں نے اپنی بات پر زور دیا تھا علیزے کا تپتا ہوا چہرہ مزید جھلس اٹھا۔ اس سے وہاں مزید ٹھہرا نہیں جا سکا تھا، جبھی کچھ کہے بغیر ایک جھٹکے سے اٹھ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ اسے لگ رہا تھا پورے بدن پر چیونٹیاں رینگ رہی ہوں۔ آنکھیں نم تھیں اور دل بھرایا ہو۔ پتا نہیں اسے صبر کیوں نہیں آ رہا تھا۔ منہ پہ ہاتھ رکھے سسکیاں دباتی ہوئی وہ اندھا دھند بھاگ رہی تھی، یہ سوچے اور خیال کیے بغیر کہ اردگرد موجود ملازم حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے ہیں۔

☆......☆......☆

تُو مجھے کہاں رکھ کے بھول گئی؟
میلے کپڑوں کی گٹھری میں
برتنوں کی الماری میں
قد سے اونچی شیلف پر
مقفل دراز میں
یا پھر دل کے کسی دور دراز گوشے میں
قسمت تُو یاد کر
تُو نے مجھے کہاں ڈالا تھا

اس نے خود کو کمرے میں بند کرلیا۔ طبیعت بھی بہتر نہیں تھی۔ بدن بخار میں تپتا تھا۔ ایک آگ اس کے اندر تھی، ایسی بھڑکتی ہوئی جو جلا کر خاک کر دے۔ وہ کتنا روئی تھی مگر آنسو پھر بھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ داہنے گال پہ جیسے کوئی برزخ بھڑکتا تھا۔ اسے تا حال یقین نہ تھا کہ عبدالغنی اس پہ ہاتھ بھی اٹھا سکتا ہے۔ وہ...... جس نے کبھی سخت نگاہ نہ ڈالی تھی، اگر اتنا برہم ہوا تھا تو وجہ دوسری عورت تھی۔ یہ ہی بات ناقابلِ برداشت تھی۔ پوری روح پر آبلے پڑ گئے تھے۔ اس وحشت انگیز خیال کے ساتھ ہی۔ جب وہ آ رہی تھی عبد الغنی اس سے پہلے گھر سے چلا گیا تھا۔

"میں واپس آؤں گا تو مجھے گھر نظر آؤ تم۔ لاریب غصہ ختم کرو۔ بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں غصے میں اس لیے آیا تھا کہ تم خدا کی تخلیق کا مذاق اڑا

رہی تھیں۔ مجھ سے بس یہی برداشت نہیں ہوسکا۔ شاید اتنے سال تمہیں یکسر تبدیل پا کر میں ان توقع کر رہا تھا تم سے کہ تم ایسی تکبرانہ بات نہیں کر سکتی ہو۔ یہ ردعمل اس باعث تھا اور لاریب...... ! تم یہ بھی جانتی ہو میں وضاحتوں کا قائل بھی نہیں رہا۔ آج اگر ایسا کر رہا ہوں تو جان لو کتنی اہم ہو تم اور تمہاری ناراضگی میرے لیے۔ میں تم سے اپنا رشتہ بچانا چاہتا ہوں، اس میں غلط فہمی کو داخل نہیں ہونے دینا چاہتا۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔'' اس کا گال تھپک کر اس نے کتنی رسانیت سے کہا تھا۔ وہ تب بھی پتھر کے بت کی مانند ساکت بیٹھی رہی تھی۔ عبدالغنی نے گہرا سانس بھرا تھا اور اس کے نزدیک جھک آیا۔

''ناراضگی ختم نہیں ہوئی......؟'' وہ اس کی توجہ کا طالب بنا ہوا تھا، لاریب نے اُسے اِسی سے محروم کر دیا تھا۔ اسے نہیں دیکھا۔ اسے جواب نہیں دیا۔ عبدالغنی نے بھی کہاں ہمت ہاری تھی۔

''اس کا مطلب نہیں ختم ہوئی۔ اٹس او کے'' وہ مسکرا رہا تھا۔ پھر کچھ اور جھکا اس کا گال چوم لیا۔

''اب ختم ہوئی......؟'' اس کا انداز شوخ و شنگ اور شریر تھا۔ لاریب مر سکتی تھی اس ادا پہ، جان لٹا سکتی تھی اگر عبدالغنی درمیان میں دوسری عورت کو نہ لے آیا ہوتا۔ یہ وہ شخص تھا جس سے اس نے پہلی نگاہ کا عشق کیا تھا پھر اسے دنیا میں اور طلب باقی نہیں رہی تھی۔ پہلی نگاہ کی خوشی، بار بار دیکھنے کی تمنا، آج تک اس کے چہرے کو دیکھنا اس کے دل کو خوشی اور طمانیت سے بھرتا رہا تھا۔ عام سے لباس، عام سے حلیے کے باوجود وہ اس پہ ہمیشہ سحر طاری کرتا رہا تھا۔ اب بھی کل کی طرح ایک امتحان تھا اسے دیکھنا، محسوس کرنا، فخر جیسے احساس سے ہمکنار کرتا تھا۔ پھر کیا وہ اس کی شدتوں سے بے خبر تھا جو اسے دکھ سے ہمکنار کر گیا؟ اس کا دل غم سے پھٹتا جا رہا تھا۔ دکھ کی شدت سے ادھڑتا جا رہا تھا اور وہ کتنا غافل بنا ہوا تھا۔ اسے لگا وقت پانچ سال پیچھے چلا گیا ہے۔ یہ وہی عبدالغنی ہے جو اس پر نگاہ تک بھی نہیں ڈالا کرتا تھا اور وہ اس کی خاطر کیسی پاگل ہوئی پھرتی تھی۔

''تم مجھ سے خفا نہیں رہ سکتیں اس لیے مجھے چھوڑ کے بھی جا نہیں سکتیں۔'' عبدالغنی نے کہا تھا اور وہ غم و غصے کی شدتوں سے بپھر گئی تھی۔ اس کے کالج جانے کے محض پانچ منٹ بعد ڈرائیور گاڑی سمیت آ گیا تھا اور لاریب عبدالعلی کے ساتھ عبدالغنی کو، اس کے گھر کو چھوڑ آئی تھی۔ حالانکہ عبیر نے اس کے ارادے کو بھانپتے ہوئے اسے جانے سے روکنے کو باقاعدہ منتیں کی تھیں اس کی۔

''ایسا مت کریں پلیز! مجھے کچھ اور نہ سمجھیں۔ اپنی ادنیٰ ملازمہ سمجھ لیں۔ میں......''

''خاموش ہو جاؤ تم بدبخت عورت!'' وہ چلا پڑی۔ اس کے لہجے میں نفرت چھلکی پڑتی تھی۔

''جو تم نے کیا تھا اس کی سزا خود بھگت لو گی تم۔ کسی کو اجاڑ کر خود تم کیسے بس سکتی ہو؟ میری بددعائیں کبھی تمہیں چین نہیں لینے دیں گی دیکھ لینا۔ عبدالغنی کو نہیں چھینا تم، نے مجھ سے میری کل کائنات ہتھیالی ہے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

''تم کیا جانو عبدالغنی کیا تھا، میرے لیے۔''

وہ یونہی روتے ہوئے گاڑی میں جا بیٹھی تھی اور سارے رستے روتی رہی تھی۔ گھر پہ اس کا سب سے پہلا سامنا ہی ممی سے ہوا تھا۔ وہ جیسے اسی کی منتظر تھیں اور پریشان بھی۔ اس طرح تو کبھی گاڑی نہیں منگوائی تھی اس نے اس سے قبل...... یہی بات وہ بار بار بریرہ سے کہہ رہی تھیں۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ ہوسکتا ہے بھائی کو ایمرجنسی میں کہیں جانا پڑ گیا ہو اور وہ چھوڑنے سے قاصر ہوں لاریب کو۔''

بریرہ کی تسلیاں بھی ان کی الجھن ختم نہیں کر سکی تھیں نہ پریشانی میں کمی لا سکیں یہاں تک کہ وہ خود حال سے بے

حال ،اجڑی بچھڑی وہاں پہنچ گئی تھی۔ آنسوؤں اور آہوں کے درمیان جو وجہ اس نے بتائی تھی وہ ناقابلِ یقین تھی۔ ممی اور بریرہ بھی بھونچکی رہ گئی تھیں۔

"یہ...... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ عبدالغنی اور شادی......؟

"ممی کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ بریرہ سراسیمہ تھی۔ لاریب کی حالت گواہ تھی کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی۔ ایسی بات تو وہ مذاق میں بھی کرنے کی قائل نہ رہی تھی۔

"بھائی نے ایسا کیوں کیا؟ میں ابھی پوچھتی ہوں ان سے......" بریرہ نے لرزتی آواز میں کہا تھا اور اٹھنے لگی تھی کہ ممی نے روک دیا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ مناسب سمجھے گا تو خود بتا دے گا۔" ان کے انداز میں ناراضگی اور گہرا دکھ اتر آیا تھا۔ لاریب کی طبیعت پھر سے بگڑ رہی تھی۔ انہیں سب کچھ بھول کر اس کی فکر لگ گئی تھی۔ سارہ ممی، لاریب کی دیکھ بھال میں لگ گئی تھیں جبکہ بریرہ حواس باختہ سی وہیں بیٹھی رہ گئی تھی۔ اسے یقین نہیں آتا تھا عبدالغنی ایسا کر سکتا تھا۔ گر کیا تو اس کی وجہ محض بدلہ تھا؟ اسے یہ بالکل یقین نہیں آسکتا تھا۔ عبدالغنی کو وہ بہت اچھی طرح سے جانتی تھی جب کسی طور چین نہیں آیا تو اپنے کمرے میں آکر عبدالغنی کا نمبر ڈائل کر لیا تھا۔ عبدالغنی کا نمبر مسلسل آف جا رہا تھا۔ اس نے طیش اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہوتے فون پٹخ دیا۔ کچھ سوچا اور گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وارڈروب سے عبایا نکال کر پلٹی تو اندر داخل ہوتے ہارون کو دیکھ کر اس کا دل سینے میں ڈول کر رہ گیا تھا۔

"السلام وعلیکم!" وہ بامشکل پھنسی پھنسی آواز نکال سکی۔

"کہاں ہیں سب؟" ہارون نے کوٹ اتار کر بیڈ پر اچھالتے ہوئے سرسری انداز میں سوال کیا تھا۔ اس کے سلام کا جواب وہ عرصہ ہوا دینا چھوڑ چکا تھا۔ ناراضی کی یہ انتہا تھی کہ وہ اللہ سے اس کی سلامتی کا خواہش مند بھی نہیں تھا۔

"اندر ہیں سب۔" بریرہ کا دل رک رک کر دھڑکنے لگا۔ اس صورتِ حال میں وہ ہرگز اتنی جلدی ہارون کے قہر کا شکار نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ بھی اس صورت کہ عبدالغنی کے اس اقدام کی وجہ معلوم نہیں ہوسکی تھی۔

"چائے بھجوا دو اور ڈسٹرب نہ کرو۔ آرام کرنا چاہتا ہوں۔" بٹن کھول کر وہ خشک آواز میں بولا تھا۔

بریرہ نے جان عارضی طور پر چھوٹنے پر شکر منایا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ کچن میں آکر خود چائے بنائی تھی اور ملازمہ کے ہاتھ بھجوا دی۔ خود ممی کے کمرے کی جانب آگئی، لاریب یہیں تھی فی الحال۔

"اب طبیعت کیسی ہے لاریب کی؟" وہ بغیر کسی جرم کے خود کو مجرم سمجھ رہی تھی جیسے۔ ممی نے ایک نظر اسے دیکھا تھا۔

"بہت اسٹریس لے رہی لاریب! ڈاکٹر نے تشویش ظاہر کی ہے کہ ایسی حالت میں مس کیرج ہو سکتا ہے اس کا۔" ان کی آواز سے لگتا تھا وہ خود بھی رو چکی ہیں۔ بریرہ کا بوجھل دل کچھ اور بوجھل ہو گیا۔

بھائی کا نمبر آف جا رہا ہے پتا نہیں کیوں" اس نے جیسے اک اور جرم کا اعتراف کر لیا۔ ممی کچھ نہیں بولی تھیں۔

"مجھے لگتا ہے میری بیٹی مر جائے گی۔ پتا نہیں میرے نصیب میں اپنی ساری اولاد کی جانب سے اتنے بڑے بڑے دکھ دیکھنا کیوں لکھا گیا ہے۔"

بالآخر وہ ضبط کھو کر سسکنے لگی تھیں۔ بریرہ نے بے اختیار انہیں اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

"ہارون بھی آگئے ہیں۔ مجھے ڈر ہے وہ......"

"اووف......!" ممی نے سر تھام لیا پھر جیسے بلبلائی تھیں۔

"اسی کا کیا دھرا ہے۔ سارا فساد اسی کا ڈالا ہوا ہے۔ وہ غصے میں چیخی تھیں۔ بریرہ نے نرمی نے انہیں تھپکا۔

"آپ لیٹ جائیں۔ کچھ دیر آرام کرلیں۔ اس مسئلے کا انشاء اللہ کوئی نہ کوئی بہتر حل نکل آئے گا۔" اس نے زبردستی تھام کر انہیں لٹا دیا تھا۔

"لاریب بتا رہی تھی کہ وہ کسی اچھے خاندان سے

نہیں ہے یعنی گانے بجانے والی ہے۔ تو کیا عبدالغنی کا ایسی عورتوں سے بھی......"

"ممی بھائی ہرگز ایسے نہیں ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ خود یہاں آ کر اپنی بات کی وضاحت کریں گے۔ آپ ٹینس مت ہوں۔" بریرہ نے عاجزی سے کہا تھا۔ ممی سرد آہ بھر کے رہ گئی تھیں۔ بریرہ متفکر سوچوں میں الجھی جارہی تھی۔

☆......☆......☆

دریچے میں کھڑے ہو کر اس نے چہار جانب نظر دوڑائی۔ راستے، گلیاں، درخت، چھتیں ہر چیز نے گویا برف کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ برف باری کا سلسلہ وقفے وقفے سے یونہی جاری تھا۔ اس نے اکتا کر مخملیں پردہ چھوڑ دیا اور پلٹ کر آتش دان کے قریب آ گئی۔ ابھی ایزی چیئر پہ بیٹھی ہی تھی کہ دروازہ ناک ہونے لگا تھا اگلے لمحے عبدالہادی اندر داخل ہو گیا تھا۔ علیزے نے فی الفور نگاہ کا زاویہ بدل ڈالا۔

"بات سنو......" وہ اسی خاموشی سے ڈریسنگ کا رخ کر چکا تھا۔ جہاں اس کا قیام تھا۔ وہ نیچے بستر لگا کر سوتا تھا یہ بات علیزے کے علم میں تھی۔ عبدالہادی اس پکار پہ چونک کر مڑا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"مجھے نہیں پتا تم کتنے عرصے کے قیام کے لیے آئے ہو۔ عین ممکن ہے یہ عیش و عشرت چھوڑ کے نہ جانے کا ارادہ ہی نا ہو تمہارا مگر میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔" رخ پھیرے وہ بے حد رکھائی سے گویا تھی۔ عبدالہادی نے گہرا سانس بھرا تھا۔

"ٹھیک ہے میں ممی کو قائل کر لوں گا اور ہم واپس چلے جائیں گے لیکن......" اس نے بات اسی انداز میں ادھوری چھوڑی تھی کہ علیزے نا چاہتے ہوئے بھی اسے منتظر نظروں سے دیکھنے پہ مجبور ہوئی۔

"ممی کی خواہش ہے کہ وہ کچھ رسمیں کر یں۔ پلیز آپ کے تھوڑے سے تعاون سے انہیں بہت خوشی مل سکتی ہے۔ وہ بہت بیمار ہیں علیزے! ان کی خواہش کو رد نہیں کیجیے گا پلیز!" اس کا انداز قائل کر دینے والا تھا، اصرار آمیز، علیزے جذبز ہوئی تھی۔

"مگر وہ بالکل دلہن بنانا چاہتی ہیں۔ ایسا لباس پہننا پسند نہیں ہے مجھے۔"

اس نے جھنجلاہٹ میں مبتلا ہو کر کہا تھا کہ شام میں ملازمہ جو لباس دے کر گئی تھی وہ ریڈ عروسی شرارہ تھا، ساتھ میں میچنگ کے زیورات اور دیگر لوازمات۔

"انہیں اپنے بیٹے کی دلہن دیکھنے کا ارمان ہے۔ روایتی سی خواہش ہے۔ پوری کرنے میں کیا حرج ہے۔ ویسے بھی محض فارمیلٹی ہو گی۔ اگر آپ کو ہمارا اوریجنل نکاح میری دلہن نہیں بنا سکا تو محض برائیڈل ڈریس کیا تیر مارے گا۔"

عبدالہادی کا لہجہ یکدم ترش اور تلخ ہو گیا تھا۔ اپنی بات کا تاثر دیکھنے کو وہ رکا نہیں تھا آگے بڑھ کر دروازہ اپنے پیچھے بند کر دیا، علیزے کے چہرے پہ جیسے الاؤ دہک اٹھا۔

"کرتے رہو بکواس، مجھے بہر حال کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جانتی ہوں اصل تکلیف ہی یہی ہے تمہیں۔" میز کو ٹھوکر مارتے ہوئے اس نے بھڑکے ہوئے انداز میں خود کلامی کی تھی اور ذہن بٹانے کو پھر سے کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی تھی۔

درختوں کے پتے جھڑ گئے تھے۔ ٹنڈ منڈ درختوں پر بھی جمی برف اور زمین پہ بچھی برف کی چادر بڑا عجیب تاثر دل میں ابھارتی تھی فضا میں پُر ہول اور جان لیوا سناٹا اور سکوت تھا۔ دوپہر کو رک جانے والا برف باری کا سلسلہ پھر سے شروع ہو چکا تھا۔ فضا سفید روئی کے گالوں سے بھرتی جارہی تھی۔ وہ گہرا سانس بھرتی ایک بار پھر کھڑکی سے ہٹ گئی تھی۔ کمرے کا ماحول بے حد خواب ناک تھا۔ کارپٹ سے لے کر پردوں تک ہی نہیں چھوٹے چھوٹے ڈیکوریشنز پیس میں بھی نفاست کا رنگ جھلک رہا تھا۔ دیوار پر لگی پینٹنگ میں نیلگوں سمندر اور بیک گراؤنڈ میں اڑتے سفید بادل بہت

خوش گوار تاثر چھوڑ رہے تھے۔ اس سے کچھ فاصلے پہ سنہری فریم میں عبدالہادی کی مسکراتی ہوئی تصویر آویزاں تھی۔ وہ بے خیال اسے دیکھنے لگی۔ وہ آج بھی اتنا ہی دلآویز تھا۔ حواسوں پر چھا جانے کی حد تک سحر انگیز، شاندار مگر شاید تبدیلی آ گئی تھی کہیں نہ کہیں۔ وہ حیران ہوئی اور غیر یقین بھی۔ وہ غلط تھا، بُرا تھا دھوکے باز، فریبی، تشدد پسند بھی نفس کا تابع عام انسان۔ آخر کب تک خود کو سنبھالتا۔ یہ ملمع کب تک چڑھائے رکھتا مگر اس کا یہی روپ تھا جو اس کے علاوہ سب کے لیے تھا۔ چھوٹی موٹی شرارت ......شوخی اور شوخ بر جستہ جملوں سے بات کبھی آگے نہ بڑھ سکی حالانکہ وہ منتظر تھی کہ وہ ایسی حرکت کرے اور وہ فردِ جرم عائد کر ڈالے اس پر۔

تنہائی میں بھلا خوف تھا بھی کس کا اسے یہ بند دروازے یہ معمولی احتیاطیں اس کی راہوں میں رکاوٹ بن بھی کیسے سکتی تھیں۔ اتنے بڑے آدمی سے اس درجہ ضبط کی امید کیسے رکھی جا سکتی تھی مگر وہ اس معر سے گزرا تھا، گزر رہا تھا، کیوں؟ کس لیے؟ وجہ واضح تھی۔ وہ اس کی رضا مندی کا منتظر تھا۔ جبر اور من مرضی کا قائل نہ تھا۔ علیزے کی حیرت تمام نہ ہوتی تھی اور جب حیرت کا وقفہ گزرا تو دستک کا عمل ساتھ شروع ہونے لگا اور یہ ضرب کچھ ایسے پڑتی تھی کہ نشان رہ رہا تھا۔ حیرت اور خوف کی سرحدیں عبور کرتی، انکشاف کے جنگلوں میں بھٹک رہی تھی اب وہ۔ خود سے بھاگنے، حقیقت سے نظریں چرانے کا عمل بھی جاری تھا جبھی تو بات بات پہ جھنجلاتی تھی۔ یہ بات قابلِ قبول ہی نا تھی کہ واقعی سچ ہے۔ اس کا سچا ہونا اور اپنی نظروں میں اپنا جھوٹا پڑنا اسے خفت سے دوچار کرنے لگا تھا۔ ایسا بھی ہوتا ہے ہم شعوری یا لاشعوری طور پر اپنے کسی عمل پہ نازاں ہوتے ہیں۔ خود کو برتر اور دوسرے کو کمتر سمجھتے ہوئے ہم درجات بھی از خود ہی مرتکب کر لیا کرتے ہیں۔ اسے جھوٹا، منافق اور دغا باز سمجھتے وہ اسے خود سے ہمیشہ کمتر درجہ پر فائز کرتی رہی تھی یہی وجہ تھی کہ اس کے خلاف کسی Clue کا نہ ملنا بھی اسے جھلاہٹ سے دوچار کر جاتا تھا۔ یہ بھی سچ تھا کہ اس نے بار ہا چھپ چھپ کر اس کی کھوج لگانے کی کوشش کی تھی اور ہر بار بجائے کوئی کامیابی حاصل کرنے کے خود شرمندہ ہوتی رہی تھی وہ۔ عبدالہادی کو اس نے کہتے سنا تھا۔

”دیوانگی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک دیوانگی وہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے حواس مختل ہو جاتے ہیں اور انسان ارزل ترین مخلوق بن جاتا ہے۔ لیکن ایک دیوانگی وہ ہے جو انسان کو بلندیوں کی جانب کھینچتی ہے۔ جیسے آندھی میں تنکا اوپر اٹھتا ہے ایسے ہی انسان جنوں میں بلندی کا سفر طے کرتا ہے۔ عام انسانوں سے کٹ کر۔ دیکھنے والے اسے دیوانہ سمجھتے ہیں لیکن وہ اوپر اور اوپر چڑھتا جاتا ہے۔ آگہی و عرفان کی منزلیں طے کرتا ہے لیکن یہ سچ ہے کہ انسان جب بھی ترقی کرتا ہے پاگل بن کر ہی کرتا ہے۔ کسی بھی چیز کی محبت ......دیوانگی یا جنون دار حقیقت کامیابی کا دروازہ کھولنے کو ہی عطا ہوتا ہے۔ ممی مجھے لگتا تھا میں اپنی ریاست سے کٹ جانے والا جزیرہ بن گیا تھا۔ مجھے دھرتی سے ملنا تھا۔ چاروں طرف سے سمندر کی اتھاہ گہرائیاں مجھے گھیر رہی تھیں۔ طوفان کے تھپیڑے مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ کر ہمیشہ نگل لینے کے درپہ تھے۔ مگر میں خود کو بچانا چاہتا تھا۔ اکیلے پن کی وحشت سے جتنا بھی سہا ہوا تھا۔ مگر ہمت ہارنا نہیں چاہتا تھا کسی شاعر نے کیا خوب کہا۔

مجھ سے کافر کو تیرے عشق نے یوں شرمایا
دل تجھے دیکھ کے دھڑکا تو خدا یاد آیا

علیزے کی محبت تو بہانا بنائی گئی تھی ممی! اس ”کن“ فرمانے والے نے ”کن“ فرمایا اور سب خود بخود ہوتا چلا گیا۔ اسی نے مجھے سمجھایا کہ وہ ہمیشہ سے ہے، ہمیشہ رہے گا۔ ہم کچھ نہیں تھے، کچھ نہیں ہیں، کچھ نہیں ہوں گے۔ تب ہی میں نے جانا ممی کہ کافر بخشا جا

سکتا ہے، مگر منافق بخشا نہیں جاسکتا۔ کافر کی بخشش محض ایک استعارہ ہے یعنی وہ اگر اللہ کی وحدانیت کا سچے دل سے اقرار کرے تو اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ ہمارے لیے حکم یہ ہے کہ ہمیں منافقوں کی صف سے باہر آنا ہے۔ یہ نا ہو کہ ہم نماز بھی پڑھیں اور بے حیائی کے کام بھی کریں۔ روزہ بھی رکھیں اور جھوٹ بھی بولیں۔ یہ بھی منافقت ہے۔ مسجد سے نکلنے والا کم تولتا ہے کیوں......؟ نماز کے مکمل کرتے وقت دونوں طرف سلامتی بھیجی جاتی ہے اور نماز کے بعد لوگ ہمارے شر سے پناہ مانگتے ہیں...... یہ سب کیا ہے؟ عبادات عمارت کے ستونوں کا درجہ رکھتی ہیں لیکن اخلاقیات اس کی چھت ہے۔ ہم بنا چھت کے رہ رہے ہیں۔ ایک بار ہمارے آقا سید الانبیاء ﷺ نے فرمایا! تم میں سے بہتر وہ ہے جس کا اخلاق اچھا ہے۔'' ہمیں اپنے اخلاق کو اچھا کرنا ہے۔ اپنی زندگی سے جھوٹ کو نکالنا ہے۔ یہ بہت بڑی چیز ہے۔ آپ اخلاقیات کو عملی زندگی میں لے کر آؤ، اگر عبادات کا اثر ہماری معمولات اور معاملات میں نظر آنے لگے تو پھر ہم ہر وقت ہی حالتِ عبادت میں ہیں۔ یہ ہی حقیقت ہے کہ...... علم کا ایک قطرہ جہالت کے سمندر سے بہتر ہے۔ عمل کا ایک ذرہ علم کے ذخیرے سے بہتر ہے اور اخلاص کا ایک قطرہ عمل کے سمندر سے بہتر ہے۔''

علیزے کھڑکی کے پاس ساکن و سامت کھڑی رہ گئی تھی۔ وہ اگر بخل کی حد کرتے ہوئے بھی یہ قیاس کرتی کہ عبدالہادی کو اس کی یہاں موجودگی کی خبر ہے اور وہ جانتا ہے وہ سن رہی ہے اور محض اسے متاثر کرنے کو یہ سب کہہ رہا ہے تو اس کے لہجے میں موجود گہرائی کی شدت اور جذب خود اس کے خیال کی نفی کرنے کو ثابت ہوتا۔ وہ پلٹ گئی تھی اور خود سے نظریں چراتی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ زندگی کے اس مقام پہ وہ کیا کرے۔ بریرہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

''محبت کے گلابی پھول کو مسلسل تحقیر، ارتداد اور بے رخی کا پانی دیا جائے تو وہ مرجھا کر سیاہ ہو جاتا ہے بالکل ایسے جیسے لال خون جم کر سیاہ ہو جایا کرتا ہے۔ محبت مرتی بھلے نہیں ہے مگر مرجھا ضرور جاتی ہے۔'' اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ محبت کو مرجھانے کو چھوڑ دے یا اس کی بقا کی جدوجہد میں مصروف ہو جائے۔

☆......☆......☆

عجیب کشمکش میں ہوں میں
عجیب امتحاں میں ہوں
جسے بچا بچا کر رکھتا ہوں
وہی ٹوٹ جاتا ہے
جسے سوچ سوچ کر رکھتا ہوں
اکثر وہی بھول جاتا ہے
جسے کھونا نہیں چاہتا، وہی روٹھ جاتا ہے
جنھیں بڑی احتیاط سے سنبھال کر رکھتا ہوں
اکثر وہی قیمتی چیزیں گم ہو جاتی ہیں

اداسی سے لبریز خاموشی نے پورے ماحول کو پھر سے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ اس کے وجود میں اضمحلال بھری تھکن اتری ہوئی تھی۔ روم روم میں اضطراب کسی دہکتے ہوئے سیال مادے کی مانند گھومتا تھا۔ کالج سے واپس آنے پر جو انکشاف عبیر کے ذریعے اس پر ہوا وہ تو دل میں کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے یقین تھا لاریب ایسا نہیں کر سکتی مگر وہ تو بہت کچھ ایسا کر گئی تھی جس کی عبدالغنی کبھی توقع نہیں کر سکتا تھا اس سے۔

''آپ انہیں جا کر منا لائیں شاہ! ورنہ یہ احساسِ جرم مجھے چین لینے نہیں دے گا کہ میری وجہ سے......''

عبیر کی آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر گئی تھیں۔ عبدالغنی شرمسار، خفت زدہ کھڑا رہ گیا تھا۔ زندگی کا یہ ایسا عجیب موڑ تھا جس نے اسے بے بسی کی انتہا پر لا کھڑا کیا تھا۔ بات معمولی تھی، سیدھی رہ سکتی تھی۔ اگر لاریب اسے سمجھ لیتی۔ ایک ایسی لڑکی جسے تحفظ چاہیے تھا، جو بے

اماں تھی۔ اسے اپنا نام دے کر اس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا مگر اس کا یہ عمل کسی انتہا پسند رویے کے باعث مجرمانہ رنگ پیش کر رہا تھا۔ عبیر کو کوئی بھی حرف تسلی دیے بغیر وہ ویسے ہی اٹھ کر سسرال چلا آیا تھا۔ اس کی شرمندگی لاریب کے رویے نے مزید بڑھا دی۔ وہ اس سے ملنے سے انکاری تھی۔ ممی خاموش لب، بستہ ...... مگر شاکی لگتی تھیں۔ بریرہ سراپا سوال اور احتجاج۔

''لاریب نے جو بتایا سچ ہے بھائی؟'' اور عبدالغنی اثبات میں سر ہلاتا ہوا وہ ساری وضاحت پھر سے پیش کرنے لگا جسے سننے کے بعد بریرہ کو اگرچہ چپ لگ گئی تو ممی کے چہرے کا تناؤ بھی ڈھیلا پڑا تھا۔

''آپ کو چاہیے تھا بھائی ایسا قدم اٹھانے سے قبل لاریب کو اعتماد میں لے لیتے۔ شاید وہ اتنا ہرٹ نہ ہوتی۔'' بریرہ کے سمجھانے پر عبدالغنی نے گہرا متاسفانہ سانس بھرا تھا۔

''حالات ایسے تھے بریرہ کہ یہ حکمت عملی نہیں اپنائی جا سکتی تھی۔ خاتون سخت مشکل میں تھیں اور عدم تحفظ کا شکار بھی۔ مذہب میں ایک سے زائد شادیوں کی اجازت ایسی ہی سچویشن میں دی گئی ہے۔ ہوس پوری کرنے کی یا ایذا رسانی کے لیے بہر حال نہیں۔ اور نیتوں کے حال سے اللہ آگاہ ہے۔'' عبدالغنی نے جیسے ایک بار پھر مجبوراً صفائی دی تھی۔ ممی شرمندہ ہوئے بغیر نہیں رہیں۔

''بیٹے ہم جانتے ہیں آپ ایسے انسان ہو بھی نہیں ورنہ اگر ایسا قدم اٹھانا ہوتا تو آپ تب اٹھاتے جب ہارون نے یہ فضول حرکت کی تھی۔'' عبدالغنی جواب میں خاموش رہا تھا بریرہ ہونٹ کچلتی رہی۔

''میں عبدالعلی سے ملنا چاہتا ہوں بریرہ۔'' عبدالغنی کے مخاطب کرنے پر وہ چونک کر متوجہ ہوئی تھی اور چہرے پہ جیسے سخت لاچاری چھا گئی۔

''میں بات کرتی ہوں لاریب سے'' وہ ممی کی جانب دیکھتی ہوئی اٹھی تھی۔

''ابھی وہ صدمے میں ہے اور ضد میں بھی۔ میں خود سمجھاؤں گی بیٹے اسے۔ آپ پریشان نہ ہوں اللہ نے چاہا تو سب بہتر ہو جائے گا۔''

''جی انشاء اللہ مجھے اجازت دیجیے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا بریرہ ناکام لوٹے گی اور وہی ہوا تھا۔

''عبدالعلی سو رہا تھا بھائی!'' وہ نظریں چرا کر بولی تھی اور عبدالغنی کی مسکراہٹ لڑکھڑا گئی تھی۔

''شاید نہیں یقیناً میرا یہ عمل یہاں تمہاری مشکلات کو بڑھانے کا سبب بنا ہے۔ بریرہ مجھے معاف کر دینا۔ اللہ حامی و ناصر ہو تمہارا۔''

اس کا سر تھپکتا ہوا وہ وہاں سے چلا گیا۔ اس بات سے غافل رہ کر کہ اپنے کمرے کے دریچے سے جھانکتی ہوئی لاریب جو اس کی کمرے میں آمد کی منتظر تھی، اس کی جانب سے منت سماجت کی خواہش مند تھی، اسے یوں جاتا دیکھ کر بے جان ہوتی وہیں نیچے بیٹھ گئی تھی زار و قطار روتی ہوئی۔

ہم سے جو بات بھی کرنے کا روادار نہیں
غیر نے کس طرح شیشے میں اتارا ہوگا

☆......☆......☆

عبدالغنی گھر لوٹا تو عبیر جیسے اس کی منتظر تھی۔ اسے تنہا آتے دیکھ کر اس کے اندر عجیب سا خوف اتر آیا۔ وہ کوئی سوال کرنے سے خائف بس مضطربانہ نظروں سے اسے گاہے بگاہے دیکھ لیتی تھی۔

''کھانا لاؤں آپ کے لیے؟''

اسے معلوم نہیں تھے عبدالغنی کے معمولات، جبھی وہ جھجک رہی تھی۔ عبدالغنی جیسے کسی خیال سے چونک اٹھا۔ بے خیالی سی بے خیالی تھی، اس کی روشن کشادہ آنکھوں میں۔ اس کے باوجود عبیر کی لانبی پلکیں لرز کر جھک گئی تھیں۔

''آں...... آپ نے کھا لیا؟'' وہ منع کرتا کرتا جیسے کسی خیال کے زیر تحت سوال کر گیا۔ عبیر انگلیاں چٹخا رہی تھی۔ بے چینی اس کے ہر انداز سے متحرک تھی۔

"بھوک محسوس نہیں ہوئی۔ آپ گئے تھے لاریب کو لینے؟" اس کے مدھم سے لہجے میں بیک وقت خوف کی آمیزش بھی تھی اور آس کی بھی۔ عبدالغنی نے سرد آہ بھری اور دانستہ بات کا رخ پھیر دیا۔ آپ کھانا لے آئیں۔ پہلے کھانا کھا لیتے ہیں۔" وہ اٹھ کر واش بیسن کے پاس جا کر کھڑا ہوا تھا اور نل کھول کر پانی کے چھپاکے مارنے لگا۔ پانی بند کیا اور اسٹینڈ کی جانب تولیہ لینے کو ہاتھ بڑھایا مگر اس سے قبل عبیر نے تولیہ اس کی جانب بڑھا دیا۔ عبدالغنی نے چونک کر دیکھا۔ عبیر کی جگہ وہ لاریب تھی۔ ہونٹوں پہ مسکراہٹ دباتی، آنکھوں میں ڈھیروں شرارت بھرے۔

"پتا ہے عبدالغنی جب میں شادی سے پہلے یہاں آیا کرتی تھی تو کچن کی کھڑکی کی جالی سے لگ کر آپ کو چوری چوری دیکھتی رہتی تھی۔ آپ چاہے یہاں کھڑے ہو کر منہ دھوتے، چاہے برآمدے کی کرسی پہ بیٹھ کر ام جان سے باتیں کرتے ہوئے چائے پی رہے ہوتے۔ مجھے آپ کا ایک ایک انداز ازبر ہوئے جاتا۔ مگر آپ محترم اتنے غافل تھے کہ کبھی جان ہی نہ سکے۔ ایسے میں میرا دل پتا ہے کیا کرتا تھا؟" وہ دانت پیس کر پوچھتی عبدالغنی مسکراہٹ دبا لیتا۔ "کیا؟" اس کی آنکھیں لو دینے لگتی ایسے سمے۔

"آپ کو ایک نظم سنانے کو دل مچل جاتا تھا جو کبھی سنا ہی نہ پائی۔ پتا ہے وہ نظم کیا تھی؟"

اور عبدالغنی کی آنکھیں مسکراہٹ کا رنگ گہرا کر کے مزید حسین ہو جایا کرتیں۔ لاریب باقاعدہ لہک لہک کر وہ نظم گنگنانا شروع کرتی تھی۔

اٹھائی ہے جو نفرت کی اٹھا دیوار بسم اللہ
میری سچی محبت سے تُو کر انکار بسم اللہ
کہا اس نے میری خاطر یہ کوہِ غم اٹھاؤ گے؟
جواباً ہم بھی بول اٹھے مرے دلدار بسم اللہ
جہاں کو چھوڑ کر جب ہم تیرے کوچے میں آ بیٹھے
تو پھر سنگِ ملامت سے ہو کیوں انکار بسم اللہ
ہمیں تو عہدِ الفت کو قیامت تک نبھانا ہے
وہ رہتا ہے اگر ہم سے رہے بے زار بسم اللہ!

وہ ہنس رہی تھی۔ اس کی ہنسی کی جھنکار چہار سو پھیلی تھی۔ عبدالغنی کا ارتکاز نہیں ٹوٹا البتہ عبیر اس کی نگاہوں کے حصار میں ضرور پگھل کر موم کی مانند ڈھیر ہونے لگی۔

"دس از ناٹ فیئر لاریب......" عبدالغنی نے تولیہ پکڑنے کے بجائے اس کا ہاتھ پکڑا تھا اور یہیں یہ تصور بکھرا، طلسم ٹوٹ گیا۔ عبدالغنی متحیر اور شرمندہ جبکہ عبیر کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ کچھ کہے بغیر وہ آہستگی سے کچن کی سمت میں پلٹ گئی تھی۔ عبدالغنی چند ثانیے یونہی منجمد کھڑا رہ گیا۔ خفت ایسی کہ وہ اس لڑکی سے نگاہیں بھی چار نہیں کر سکا۔ خود کو کمپوز کرنے کے بعد وہ کچن میں آیا تو عبیر میز پہ برتن سجائے اس کی منتظر تھی۔

"آ جائیے آپ بھی۔" عبدالغنی نے نرمی سے مخاطب کیا تھا۔ وہ صاف گریزاں لگتی تھی۔

"آپ کھائیے میں طلب نہیں محسوس کرتی" وہ آہستگی سے کہتی چائے کا پانی رکھنے لگی۔ عبدالغنی نے اس کا ہاتھ روک لیا، پھر اس کی نازک کمر کو دیکھا جس پہ موٹی سی سیاہ چوٹی دوپٹے کے سرے سے بھی لہراتی نظر آ رہی تھی۔

"عبیر یہاں آئیے۔" اس نے صرف کہا نہیں خود ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے مقابل دوسری کرسی پہ بٹھا لیا۔ عبیر کی گھبراہٹ اور گریز دیکھنے والا تھا۔ جھکی پلکوں والی بادامی آنکھوں میں عجیب سا اضطراب در آیا۔

"مجھے افسوس ہے میں چاہنے کے باوجود آپ کو نارمل حالات نہیں دے پا رہا لیکن مجھے اللہ سے امید ہے، سب بہتر ہو جائے گا اب تک میں آپ سے تعاون کا خواہش مند ہوں اور......" اس نے توقف کیا اور کرتے کی بغلی جیب میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالا۔

"یہ آپ کے لیے...... آپ کی رونمائی ہے۔" چھوٹی سی دل شیپ گلابی رنگ کیس تھی۔ عبیر نے اچنبھے میں مبتلا ہو کر اس شخص کو دیکھا تھا جو کٹھن حالات سے اس کی وجہ سے دوچار تھا مگر تقاضے نبھانے میں

کوشاں۔ اسے حافظ بابا کی بات یاد آئی۔
"میں اپنی ذمہ داری کو احسن طریقے سے نبھانے کا خواہش مند ہوں بیٹی!" جبھی ایسا شخص منتخب کیا ہے جو حقوق وفرائض کے معاملات میں اللہ سے ڈرنے والا ہے۔ اللہ کے بعد میں تمہیں عبدالغنی کے سپرد کرکے کمل طور پر مطمئن ہوں۔"
"میری پوری کوشش رہے گی آپ کی حق تلفی نہ ہو۔ آپ بھی بلا جھجک ہر مسئلہ مجھ سے شیئر کرسکتی ہیں۔" رنگ کیس کھول کر رنگ نکالتے ہوئے وہ خود انگوٹھی اس کی انگلی میں سجاتے ہوئے مدبرانہ انداز میں گویا تھا عبیر کو سب کچھ بھولنے لگا۔ اسے خود پہ ایک بار پھر جی بھر کے رشک آیا تھا۔ حجاب کے رنگ نے اس کا چہرہ دہکا ڈالا۔
"لاریب کیوں نہیں آئی آپ کے ساتھ؟" وہ گڑبڑا کر بات کا رخ بدل گئی۔ عبدالغنی نے اس کی کیفیت کو محسوس کیا تھا اور نرمی سے مسکرادیا۔
"یہ معاملہ بھی انشاء اللہ العزیز سلجھ جائے گا۔ آپ ٹینشن نہ لیں۔" عبیر کی پلکیں حیا سے بوجھل ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ نظریں چراتی بہت انوکھی، بہت خاص لگ رہی تھی۔ عبدالغنی کو لاریب کے کتنے رنگ یاد آئے، کتنے عکس نگاہوں میں جھلملائے۔ وہ سر جھکا کر کھانے کی سمت دھیان لگانے لگا۔ یہ طے تھا وقتی آزمائش سے گھبرا کر اسے اپنے حقوق، اپنی ذمہ داری سے نگاہ نہیں چرانی تھی۔

☆......☆......☆

اس کا وائٹ فراک بے حد خوبصورت اور نفیس تھا، جس کے دائیں کندھے پر ایمبرائیڈری اور کٹ ورک کا بڑا سا پھول بنا ہوا تھا۔ باقی سارا فراک سادہ تھا۔ البتہ اس کی چوڑی دار سلیوز کے سرے پر بھی وہی ایمبرائیڈری اور کٹ ورک بنا ہوا تھا۔ رسموں کی ادائیگی کے لیے اس نے نہایت سادہ لباس پہن کر تیاری کی تھی۔ ممی نے اس لباس پر بھی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ عبدالہادی خاموش ضرور رہا تھا مگر آنکھیں کلام کرتی محسوس ہوتی تھیں۔ سراہنے سے لے کر شکوہ کرنے تک لاریب نظریں چرا گئی تھی۔ یہ محض ایک اتفاق تھا کہ اس پل عبدالہادی بھی سفید لباس میں تھا اس کا لانبا قد اس لباس اور اس پہ عربیک طرز کے مخملیں گاؤن میں بہت نمایاں لگتا تھا۔ ملازمہ نے جو اسے یہاں تک لائی تھی ہاتھ پکڑ کر عبدالہادی کے مقابل صوفے پر بٹھا دیا تھا۔ ممی بھی بیڈ پر تکیوں کے سہارے نیم دراز تھیں اور روشن آنکھوں سے مسکرا مسکرا کر دونوں کو دیکھتی تھیں۔ کمرے دونوں فانوس روشن تھے اور خاص ملازمائیں اس رسم میں شامل تھیں۔ علیزے کے ڈائمنڈ کے زیورات ان روشنیوں میں جگمگانے لگے۔
"میرا خیال ہے کہ پہلے سویٹ کھلا دو۔" ممی نے کہا تھا خوبصورت ڈش میں شیشے کے بلورین باؤل میں بہت نفاست سے سجے ہوئے فروٹ ٹرائفل کے جار سامنے آگئے۔
"سر آپ میم کو کھلائیں گے۔ پھر یہ آپ کو بعد میں کھلائیں گی۔" ملازمہ نے روانی سے کہہ کر گویا طریقہ سمجھایا۔ عبدالہادی نے ممی کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "مگر اس کا فائدہ کیا ہے ممی؟"
"اسے جھوٹا کھلانا کہتے ہیں۔ داناؤں کا کہنا ہے کہ اس سے دولہا دولہن میں باہمی محبت پیدا ہوتی ہے۔" ممی کی وضاحت پر عبدالہادی کی نگاہیں بہت بے ساختہ انداز میں علیزے کی جانب پلٹی تھیں۔ دیکھنے کا انداز بہت شوخ تھا۔
"امیزنگ پھر تو میرا سارا جھوٹا انہیں کھلا دیں۔ جو حالات ہیں، ضرورت اسی امر کی ہے۔" اس کا لہجہ ہرگز بھی سرگوشی سے بلند نہ تھا۔ علیزے کے چہرے پہ سرخی چھا گئی۔ عبدالہادی ہرگز بھی اس گلابی پن کی وجہ سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔ علیزے کا اسے سویٹ کھلانے کا انداز بہت ہی مشینی قسم کا ہی تھا۔ تیسرے چمچ پہ عبدالہادی نے منہ کھولنے کے بجائے چمچ اس کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔
"اب آپ کی باری ہے، میں تو بہت محبت کرچکا آپ سے۔" وہ باقاعدہ ہنسا تھا اور چمچ اس کے منہ کی جانب بڑھا دیا

تھا۔ علیزے چند ثانیوں کو ساکن رہی تھی پھر منہ کھول دیا۔ عبدالہادی کو اس سے یہ توقع نہیں تھی جبھی حیرت، خوشگواریت اس کے انداز میں خود بخود اتر آئی تھی مگر یہ ترنگ اس وقت جاتی رہی تھی جب علیزے کی آنکھ سے مچلتا ہوا آنسو لپک کر اس کے ہاتھ کو گیلا کر گیا تھا۔ اس نے ٹھٹک کر چہرہ اوپر کیا اور جیسے لمحوں میں اندر تک ٹوٹ کر بکھرتا چلا گیا۔

''اب بس بھی کرو۔'' گود میں پھل ڈالو۔ اللہ جلدی گود ہری کرے گا۔'' ممی ساتھ ساتھ ہدایات دے رہی تھیں عبدالہادی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''تم کہاں جا رہے ہو؟'' ممی نے اسے ٹوکا تھا۔

''میرا خیال ہے اس کام میں میری ضرورت نہیں ہے۔'' وہ آہستگی سے کہہ کر لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔ ممی بڑبڑا رہی تھیں۔ علیزے سر جھکائے بیٹھی اس بات پر غور کر رہی تھی کہ اب اس کا موڈ خراب کرنے کا باعث کیا بات ٹھہری ہوگی۔

''مجھے ڈاکٹر نے زیادہ سے زیادہ چھ ماہ تک زندہ رہنے کی نوید سنائی ہے۔ میری خواہش تھی کہ میں اپنی نسل کو بڑھتا دیکھ لیتی۔ عبدالہادی سے بھی ذکر کیا تھا میں نے۔ یہ سن کر مایوسی ہوئی تھی کہ ابھی کوئی امید نہیں ہے مگر یہ خوش خبری تو مل سکتی ہے ناں۔'' رسموں کی ادائیگی کے بعد ممی نے ملازماؤں کو مٹھائی وغیرہ تقسیم کرنے کا حکم دے کر بھیج دیا تو بہت حسرت زدہ انداز میں اُس سے مخاطب ہوئی تھیں۔ علیزے کو اس مہربان عورت پہ رحم بھی آیا اور ہمدردی بھی محسوس ہوئی۔ ''آپ مایوس کیوں ہوتی ہیں۔ آپ بہت لمبی عمر تک جئیں گی انشاء اللہ!'' ان کے ہاتھ پہ نرمی سے اپنا ہاتھ رکھتے وہ بے حد نرمی سے تسلی دے رہی تھی۔ ممی جواباً دل گیری سے مسکرانے لگیں۔

''اس کے بجائے اگر تم یہ کہتیں بیٹے کے اللہ مجھے جلد دادی بننے کی خبر سے نوازے گا تو مجھے یقین کرو زیادہ خوشی ہوتی۔'' علیزے کو ان سے ایسی بات کی توقع نہیں تھی، جبھی چند ثانیوں کو کچھ بول نہیں سکی۔ ایک خفت کا احساس بھی جو تھا وہ الگ تھا۔ ''کیوں نہیں اس کے گھر میں بھلا کوئی کمی تھوڑی ہے۔'' اس کے الفاظ سراسر ان کا دل رکھنے کے لیے ہی تھے۔ مگر عبدالہادی ضرور خوش گمان ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں کو چھونے والی دلکش مسکان سے علیزے نے اس پل نگاہ چرائی تھی۔

''میں آپ کی تعریف نہیں کر سکتا اس لباس میں خوبصورتی کی۔ مگر آپ کو تھینکس ضرور کہوں گا۔ آپ نے والدہ کا دل رکھ لیا اور ہمارا دل خوش فہمی میں مبتلا ہوا ہے۔ اس کے لیے بھی تھینکس۔'' جب وہ اٹھ کر کمرے سے باہر آئی عبدالہادی بھی اس کے پیچھے آ گیا تھا۔ اس کا مدھم لہجہ اتنا گمبھیر، اتنا دلکش تھا کہ اس کا زیر و بم دل کی دھڑکنوں کو منتشر کرنے کا باعث بن سکتا تھا اور علیزے اس کے تاثر سے بچنے کی خاطر ہی زہرخند سے بولی تھی۔

''جب وجہ معلوم ہو تو ایسی حماقت کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔'' عبدالہادی چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا بلکہ چلتے چلتے رک گیا۔ علیزے نہیں رکی بلکہ وہ آگے بڑھتی گئی تھی۔ ''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ آپ کی بات پہ غور کیا جا سکتا ہے۔'' اس نے خود کلامی کی تھی اور وہیں سے قدموں کا رخ بدل دیا تھا۔ علیزے کو بہت آگے چل کر احساس ہوا تھا۔ وہ نہ صرف پیچھے رہ گیا بلکہ وہاں سے بھی پلٹ گیا تھا۔ وہ اس کے پیچھے نہیں آئے گا اسے اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔

☆......☆......☆

اس کی پلکیں ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔ گالوں پہ آنسوؤں کی نمی کا احساس تازہ تھا۔ گلابی ہونٹ نیم وا تھے اور وقفے وقفے سے سسک پڑتے تھے۔ ممی نے دکھ بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

''عبدالغنی سے مل لیا ہوتا بیٹے!''

''مجھے نہیں ملنا۔ مجھے نہیں کرنی بات۔'' وہ کراہی تھی۔ بے زار سا نحیف لہجہ، چہرے پہ وہی تناؤ اور سختی در آئی تھی۔ جو عبدالغنی کے تذکرے پہ لازم ہو چکی تھی۔

''مسئلے کا حل اس طرح کیسے نکلے گا بیٹے؟ تم کیوں اپنا

گھر، اپنا دل برباد کرنے پہ تل گئی ہو۔" ممی عاجز ہوئی تھیں۔ لاریب نے چونک کر انہیں دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"خدا نہ کرے ممی میرا گھر اور میرا دل برباد ہو۔ عبدالغنی کو میری بات ماننی پڑے گی۔ میں ان کے دو بچوں کی ماں ہوں۔ میری حیثیت مضبوط ہے۔"

"کون سی بات......؟" ممی نے ٹھٹک کر اس کی شکل دیکھی تھی۔

"اس عورت کو طلاق دینے کی بات۔" لاریب کا لہجہ ہٹ دھرم اور تلخ تھا۔ ممی گہری سانس بھر کے رہ گئیں۔ "بیٹے عبدالغنی عام انسان نہیں ہے۔ اُس کا مقصد سمجھو تم۔"

"مقصد جو بھی ہو ممی! میں بس اتنا جانتی ہوں عبدالغنی بس صرف میرے ہیں۔ میں انہیں ہرگز بھی کسی سے شیئر نہیں کروں گی۔" وہ پھر رونے کو تیار تھی۔

"آپ کو اندازہ نہیں ہے ممی! آپ اندازہ کر ہی نہیں سکتیں کہ عبدالغنی میرے لیے کیا ہیں یا میں اس وقت کس اذیت کا شکار ہوں۔ کوئی مجھ سے میری ساری کائنات لے لیتا مگر مجھے یہ دکھ نہ ملتا۔ مجھے عبدالغنی کو کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرنا پڑتا۔ میں صبر کرنا بھی چاہوں تو مجھے صبر نہیں آسکتا۔ کاش یہ آزمائش نہ آتی مجھ پر۔ عبدالغنی بس صرف میرے رہتے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ممی گم صم بیٹھی رہ گئی تھیں۔ اس کی جذباتیت سے آگاہ بھی تھیں جبھی اس کا دکھ اپنے دل میں محسوس کر رہی تھیں۔

"میں نے بار بار ہاتھ پھیلائے تھے اور اتنی منتوں سے اللہ سے انہیں مانگا تھا۔ میں عبدالغنی سے اتنی محبت کرتی تھی کہ ان کی خاطر میں نے سب کچھ چھوڑ دیا۔ ہر آسائش، ہر سہولت اور مجھے ان سب کے کھونے کا کبھی پچھتاوا نہ ہوا۔ میرے پاس عبدالغنی تھے تو جیسے سب کچھ تھا۔ کوئی کمی نہیں تھی، کوئی حسرت نہیں تھی۔ انہوں نے مجھے ان سہولیات کو مہیا کرنے کو باہر جانا چاہا تھا ممی۔ میں نے نہیں جانے دیا جانتی ہیں کیوں......؟ اس لیے ممی کہ مجھے ان سے دوری برداشت نہیں ہو سکتی تھی۔ میں پھر اب ان کی بٹی ہوئی توجہ......بٹی ہوئی محبت کیسے برداشت کرلوں؟"

اس کے رونے میں مزید شدت آئی تھی۔ اس کی آواز میں بلک تھی۔ ممی کا کلیجہ منہ کو آنے لگا، کچھ کہے بغیر انہوں نے اسے گلے سے لگا کر بھینچ لیا۔

"وہ سب ٹھیک ہے بیٹا! مگر اب ایسا ہو چکا ہے تو تمہیں عبدالغنی کے مسائل کو سمجھنا چاہیے۔ اس لیے بھی کہ مرد کو وہی بیوی اچھی لگتی ہے، جو اس کے مسائل کو سمجھے نہ کہ اس کے لیے مسائل پیدا کرے۔"

وہ اسے ہر ممکن طریقے سے قائل کرنا چاہ رہی تھیں اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ وہ عبدالغنی کے اقدام کو اگر سراہ نہیں بھی سکی تھیں تو کم از کم اس کی مخالفت بھی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ مگر لاریب نے تو جیسے ان کی بات سنی ہی نہیں تھی۔

"عورت کے مقابل دوسری عورت کا ہونا بہت سنگین حادثہ ہے۔ دماغ کے مردہ خلیے تک دوبارہ متحرک ہو جاتے ہیں۔ وہاں تک سوچ جاتی ہے جہاں جہاں تک امکان کا دائرہ پھیلتا ہے بلکہ ناممکنات بھی تب ممکن ہوتے معلوم ہوتے ہیں، پھر وہ عورت تو شدید توہین سے پاگل بھی ہو سکتی ہے، جسے ٹوٹ کر چاہا گیا ہو پھر اس سے منہ پھیر کر کسی اور کی جانب بڑھا جائے۔ کیوں......؟ کیوں......؟ ممی میرے اندر ایک قیامت کا شور برپا ہے اور اذیت لامحدود......ممی عبدالغنی کو حساب تو دینا ہوگا۔ یا تو وہ مجھ سے محبت نہیں کرتے تھے یا پھر......آہ میں تو ہر پل انہیں سوچتی تھی۔ سوچتی ہوں۔ وہ اس بددیانتی کے مرتکب ہوئے کیسے؟"

وہ اور زیادہ شدتوں سے رونے لگی۔ ممی نے سر پکڑ لیا تھا۔

"اس طرح کر کے آخر تمہیں کیا حاصل ہو جائے گا بیٹے! ہمارے معاشرے میں قربانی عورت کو ہی دینی پڑتی ہے۔ عورت کو ہی قربانی اور برداشت سے اپنے لیے عزت و مقام بنانا پڑتا ہے۔ چاہے زندگی میں یہ

مقام کبھی بھی آئے یا نہ آئے، کامیاب وہی ہے، مضبوط بھی، جو ایسا کرے۔ جو ایسا نہیں کرتی، وہ اپنے سے وابستہ رشتوں کا لطف کھو دیتی ہے۔ مرد کے مقابل کھڑی ہو کر عورت کبھی مرد نہیں بن جاتی البتہ اپنا عورت پن بھی کھو ڈالتی ہے۔ وہ اپنا بہت بڑا نقصان کرتی ہے تمہارا یہ کہنا تھا کہ تم اپنے شوہر کے ساتھ دوسری عورت برداشت نہیں کر سکتیں، کیوں بیٹے......؟ اگر یہ صبر اور برداشت کی حد سے باہر ہوتا تو اللہ اسے حلال کیوں بناتا۔ بیٹے اللہ کا وعدہ ہے وہ کسی پہ ظلم نہیں کرتا، کسی پہ اس کی ہمت اور برداشت سے بڑھ کر بوجھ نہیں ڈالتا۔ بریرہ کو دیکھ لو۔ ہارون کے اتنے ناروا سلوک اور حق تلفی کے باوجود کیسے ڈٹی ہوئی ہے۔ جبھی تو عزیز ہے سب کو۔ اگر وہ بھی مقابلے پر اتر آتی۔ کون پسند کرتا اسے؟ یہ آزمائش دیکھ لینا ختم ہو جائے گی۔ اک دن جیت اسی کی ہو گی۔ اس لیے کہ وہ صبر کر رہی ہے، اس لیے کہ وہ حق پر ہے۔ سارہ کی مثال سامنے ہے تمہارے۔ مرد کی کسی بھی شہ زوری پر عورت کو صبر اور برداشت کرنا ہی پڑتا ہے، ورنہ گھر ٹوٹ جاتے ہیں دل بھی آباد نہیں ہوتے۔''

لاریب آنکھوں میں اذیت کا رنگ لیے ممی کو دیکھتی رہی پھر کراہ کر جلتی آنکھیں بند کر لیں۔

''جلن کا احساس ہمیشہ جان لیوا ثابت ہوتا ہے ممی۔ یہ جلن جسم کی ہو یا احساسات کی۔ جسم کی جلن کے لیے تو علاج ممکن ہوتا ہے۔ مرہم پٹی بھی ہو سکتی ہے مگر احساس کی جلن کی کوئی دوا نہیں ہے۔ میں اسی جلن کے احساس سے جاں بلب ہوں ممی! میں کیسے بتاؤں کہ علاج کس کے پاس ہے۔ عبدالغنی آ کر مجھے کوئی ایسی بات کہہ دیں جس سے لگے وہ صرف میرے ہیں۔ تو میں جانبر ہو سکتی ہوں بس۔

میں تو خود پر بھی کفالت سے اسے خرچ کروں
وہ ہے مہنگائی میں مشکل سے کمایا ہوا شخص
یاد آتا ہے تو آتا ہی چلا جاتا ہے
کارِ بیکار سی باتوں میں بھلایا ہوا شخص

آنسو قطار در قطار اس کی پلکوں سے ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا وہ اس غم سے کبھی سمجھوتا نہیں کرے گی۔ وہ اس دکھ سے کبھی چھٹکارا حاصل نہیں کرے گی۔

☆......☆......☆

جب شہر خزاں میں آئے ہو
کچھ دیر چلو تنہا تنہا
کچھ دیر سنو سناٹے میں
کوئی نوحہ پیلے پتوں کا
کچھ گرد سجاؤ پلکوں پر
پھر اجڑی سونی گلیوں میں
کوئی ڈھونڈوں یار کا نقشِ قدم
جب شہر خزاں میں آئے ہو
کچھ دور چلو تنہا تنہا

لیکچر تیار کرتے بے خیالی میں رائٹنگ پیڈ پہ نظم لکھتے ہوئے وہ یکدم چونکا اور متاسفانہ گہرا سانس بھرا۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ کلاس میں بھی غائب دماغی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اسٹوڈنٹس اسے ٹوکتے اور حیرانی سے تکتے تھے۔ وہ ذمہ دار، قابل استاد کے طور پر مانا جاتا تھا۔ لاریب کے حوالے سے پریشانی نے کہیں کا رہنے نہیں دیا تھا گویا۔ گھر پہ عبیر اس کی بے دھیانی نوٹ کرتی تھی۔

''آپ گئے تھے آج لاریب کی طرف؟'' چائے کا مگ اس کے پاس رکھتے ہوئے عبیر نے وہی سوال کیا جو وہ روز کرتی تھی۔ عبدالغنی نے نگاہ کا زاویہ بدل لیا۔ مقصد واضح تھا عبیر سرد آہ بھر کے رہ گئی۔

''آپ کو جانا چاہیے تھا۔ اُم جان اور بابا جان کی واپسی سے قبل شاہ آپ کو لاریب کو ہر صورت منا کر لے آنا چاہیے گھر......''

عبیر کے لہجے میں التجا بھی تھی، بے بسی بھی، خوف بھی تھا، بے قراری بھی۔

(باقی انشاء اللہ ماہ جنوری میں ملاحظہ فرمائیے)

افسانہ

معجزے ہاتھوں میں ہیں

اس دن صبح سے ہی افشاں کا دل بری طرح سے گھبرا رہا تھا جیسے کچھ انہونی ہونے والی ہے۔ بار بار اسے برے برے خیالات آتے اور وہ انھیں ذہن سے جھٹک دیتی۔ اچانک زور زور سے دروازہ پیٹنے کی آواز آئی۔ ''افشاں! ارے افشاں، بیٹا دروازے پر جا کر......

صبح کا بھُولا، شام کو گھر آ جائے تو اُسے بھُولا نہیں کہتے......

عمران کو آج افشاں پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا۔ وہ اُس کی لاپروائی اور غیر ذمہ داریوں سے آئے دن پریشان رہتا تھا۔ پر آج تو حد ہی کر دی افشاں نے۔ کل رات ہی عمران نے افشاں سے کہا تھا کہ میرے کپڑے رات میں ہی Press کر دینا، صبح آفس میں میٹنگ ہے اور مجھے جلدی جانا ہے، پر حسب دستور افشاں کی وہی لاپروائیاں ''افشاں...... افشاں......'' عمران نے زور سے چلاتے ہوئے اُسے آواز دی۔

''ارے کیا ہو گیا جو آپ اس قدر چلا رہے ہیں؟ افشاں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا ''آپ تھوڑا آہستہ آواز میں بھی مجھے بلا سکتے ہیں۔ آپ کو پتا ہے کہ پارلر میں میری کلائنٹ آئی ہوئی ہیں'' افشاں نے تھوڑی سی ناراضگی کا اظہار کیا۔

''اوہ.... اچھا اپنے کلائنٹ کی بہت فکر ہے۔ شوہر کی ذمہ داریوں کا کوئی احساس ہے تمہیں'' عمران نے غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

''اوفوہ..اب ایسا بھی کیا ہو گیا جس پر آپ اتنا طیش کھا رہے ہیں؟'' افشاں کو بھی جیسے غصہ آنے لگا۔

''کچھ یاد ہے تمہیں رات کو میں نے کیا کہا تھا؟ کپڑے Press کرنے کو مگر آپ کو کیسے یاد رہ سکتا ہے۔ آپ کو تو بس اپنا میکہ اور اپنا پارلر یاد رہتا ہے۔ باقی آپ کی بلا سے دنیا میں کچھ ہوتا رہے آپ کو اس کی کیا پروا'' وہ رکا اور پھر بات پوری کرتے ہوئے بولا۔

''رہا میں تو.... میں تو کسی کھاتے میں ہی نہیں آتا اور میرے وہ دو بچے اگر میرے گھر والے میرے ساتھ نہ ہوتے اور بچوں کو اُن کی سپورٹ نہ ہوتی تو سمجھو ان بے چاروں کا بھی کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ کوئی احساس ہے تمہیں کہ وہ تمہاری ذمہ داری ہیں۔ ایک اچھی بیوی نہ بن سکیں تو کم از کم ایک اچھی ماں ہی بن جاؤ''

آج عمران واقعی پہلی دفعہ اتنے غصے میں دکھائی

دے رہا تھا ورنہ افشاں ہمیشہ اُس پر حاوی دکھائی دیتی اور اپنی من مانی کرتی رہی تھی۔ عمران اگر اتنا رعب و دبدبہ شروع دن سے ہی رکھتا تو ایسی نوبت کیوں آتی۔

ایسا سوچنا تھا عزیز صاحب کا جن کی فیملی میں کل چار افراد تھے، جس میں دو بیٹے اور وہ خود میاں بیوی۔ بڑے بیٹے عمران کی شادی چھ سال پہلے اُس کی پسند سے ہوئی تھی۔ عمران کے دو بچے تھے ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ عمران کی شادی کر کے عزیز صاحب کو کچھ زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔ ایک تو یہ کہ بہو اُن کی مرضی کی نہیں تھی اور دوسری بات جو عزیز صاحب کو بہت کھلتی تھی کہ بہو کو بھی سسرال والوں سے کوئی خاص دلچسپی نظر نہیں آتی تھی۔

اُن کا بیٹا عمران چونکہ فطرتاً سیدھا سادا انسان تھا تو افشاں اُس کی سادگی سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُسے اپنا مرید بنا کے رکھتی تھی۔ سسرال سے زیادہ وہ اپنے میکے کو اہمیت دیتی اور آئے دن کسی نہ کسی بہانے اپنے میکے پہنچ جاتی۔ افشاں کے اس رویے سے اس کے سسرال والے بے حد عاجز تھے۔ سسرال میں کوئی بھی کام ذمہ داری سے نہیں کرتی تھی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ افشاں کی ساس رفعت بیگم بھی سیدھی خاتون تھیں اور اُن کے ساتھ کچھ نفسیاتی مسائل بھی تھے تب ہی رفعت بیگم شاید وہ ساس نہ بن سکیں جیسے کے عموماً ساسیں ہوتی ہیں۔ بہو کو تھوڑا بہت ڈر خوف اگر کسی سے ہوتا ہے تو وہ ساس ہی کا ہوتا ہے، پر افشاں کی ساس تو تھی بیچاری اللہ میاں کی گائے بس وہ اپنی ہی دنیا میں مگن رہتیں تو افشاں کے لیے سارے راستے صاف تھے۔ کوئی آس پڑوس والی کبھی افشاں کی کوتاہیوں کی طرف اشارہ کرتیں تو افشاں کی ساس ہمیشہ اس کی حمایت کرنے لگتیں، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے بیٹے عمران سے بہت محبت کرتی تھیں اور دوسری اہم وجہ اُن کی وہ نفسیاتی پرابلم تھی جس کی وجہ سے وہ کسی بھی معاملے کو ٹھیک طرح سے ہینڈل نہیں کر پاتی تھیں اور اسی بات کا افشاں فائدہ اُٹھاتی تھی۔

افشاں کی ان حرکتوں کو بڑھاوا دینے میں کچھ ہاتھ افشاں کی ماں کا بھی تھا۔ افشاں کی ماں اُن چند خواتین میں سے تھیں جن کو شادی کے بعد بھی بیٹیاں اپنے سسرال سے زیادہ اپنے گھر میں اچھی لگتی ہیں۔ وہ بھی افشاں کو اپنے گھر آنے کی بہت شہ دیا کرتیں۔ جس کی وجہ سے افشاں بھی آئے دن سسرال کی ذمہ داریوں سے لاپروا ہو کر میکے میں پڑی رہتی اور عمران کو تو ایسا لگتا تھا کہ جیسے کچھ گھول کر پلا دیا گیا ہو۔ وہ سب دیکھتا رہتا تھا پر منہ سے کچھ نہ کہتا... عزیز صاحب آئے دن عمران کی کلاس لیتے رہتے تھے پر عمران کی آنکھوں پر تو جیسے پٹی بندھ گئی ہو، اُسے تو کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا کہ افشاں کیا غلط کر رہی ہے اور کیا ٹھیک... عمران تو خود افشاں کے آگے پیچھے پھرتا تھا۔ لیکن جب بھی عمران کو غصہ آتا تو افشاں اُس کے غصہ سے ڈر بھی جاتی۔ پر وہ ڈر صرف وقتی ہوتا تھا، پھر وہی افشاں ہوتی اور اُس کی من مانیاں... حالانکہ افشاں کے سسرال والے بہت عزت دار، شریف اور محبت کرنے والے لوگ تھے۔ اگر افشاں اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتی اور اُنھیں ٹھیک طرح سے نبھاتی تو وہ اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے پر اُس کے سسرال والے افشاں کی لاپروائیوں کے باوجود اُس سے اور اُس کے دونوں بچوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ افشاں کو اس کی بھی قدر نہیں تھی۔ اس کے خیال میں تو یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس پر ان کا شکریہ ادا کیا جائے۔ اس کے باوجود سسرال میں اسے برداشت کیا جا رہا تھا تو یہ اُس کی خوش قسمتی تھی ورنہ کوئی اور لوگ ہوتے تو افشاں کی زندگی جہنم

بن چکی ہوتی جیسا کہ اکثر لڑکیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

عمران کو بھی احساس تو تھا کہ افشاں اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہیں کرتی پر وہ زبان سے کچھ نہیں کہتا تھا۔دل ہی دل میں عمران افشاں کی ان حرکتوں سے پریشان رہتا تھا۔جیسے اکثر اس قسم کے شوہر رہا کرتے ہیں۔

افشاں کی اور عمران کی ملاقات بھی بہت عجیب انداز سے ہوئی۔افشاں کے بھائی کا دوست ندیم اتفاق سے عمران کا بھی دوست تھا اور اُس دوست کا گھر افشاں کے گھر کے بالکل سامنے تھا۔جہاں اکثر عمران کا آنا جانا رہتا تھا ایسے ہی ایک دن عمران کو افشاں کے بھائی سہیل سے کوئی کام آن پڑا اور وہ اس کے گھر جا پہنچا۔دروازہ افشاں نے کھولا۔افشاں سمجھی دودھ والا ہے۔عمران کو بنا دیکھے ہی اس نے پتیلی آگے بڑھا دی لیکن پھر شرمندہ ہو کر ایک دم سے افشاں کی ہنسی چھوٹ گئی اور وہ بے اختیار ہنستی ہی چلی گئی۔بس پھر کیا تھا عمران کو افشاں کی ہنسی نے جیسے لوٹ ہی تو لیا۔وہ اب بہانے بہانے سے اپنے دوست سہیل سے ملنے جانے لگا اور اس طرح اس کی افشاں سے بھی سرسری سی ملاقات ہو جاتی تھی۔پھر یہی سرسری ملاقاتیں باقاعدہ ملاقاتوں میں بدل گئیں اور یہ سلسلہ شادی پر تمام ہوا۔پہلے تو عمران کے والد یہ سن کر ایک دم بھڑک اُٹھے اور اُن کے بھڑکنے کی وجہ عمران کی پسند کی شادی نہیں بلکہ افشاں کا طلاق یافتہ ہونا تھا۔افشاں پہلے سے طلاق یافتہ تھی اور عزیز صاحب ایک طلاق یافتہ عورت سے اپنے کنوارے بیٹے کی شادی ہرگز نہیں کرنا چاہتے تھے پر عمران پر تو افشاں کی محبت کا بھوت سوار تھا عمران نے اُنھیں جیسے تیسے کر کے منا ہی لیا بالآخر بیٹے کی محبت اور ضد کے سامنے عزیز صاحب نے ہتھیار ڈال دیے اور یہ شادی نہ چاہتے ہوئے بھی ہو گئی۔ ہر ایک کا یہی خیال تھا کہ افشاں کو دوسری بار دلہن بن کر یہ ضرور سوچ لینا چاہیے کہ ایک دفعہ اس کا گھر خراب ہو چکا ہے اور اگر اس نے اپنی پہلی شادی کے تجربے سے کچھ نہ سیکھا تو اسے کہیں دوسری بار بھی پچھتانا نہ پڑے۔اس سے بھی زیادہ خواتین کی ایک بڑی اکثریت یہ سوچ کر حیران تھی کہ ان دنوں جب اچھے لڑکے کنواری لڑکیوں کو نہیں مل رہے تو افشاں تو پھر بھی طلاق یافتہ تھی۔عمران کو دیکھ کر سب ہی کو افشاں کی زبردست قسمت پر رشک آ رہا تھا کہ عمران جیسا انسان تو کسی کنواری لڑکی پر بھی انگلی رکھ دیتا تو وہ خوشی خوشی اس کی دلہن بننے کو تیار ہو جاتی پر اسی کو قسمت کہتے ہیں کہ جس کو چاہے نواز دے اور جس کو چاہے اجاڑ دے۔ایک خاتون نے تو یہ بھی کہا کہ بھئی دل گدھی پر آ جائے تو پری کیا چیز ہے" ایسا تو بہرحال نہیں تھا کہ افشاں کوئی بہت معمولی عورت تھی وہ تھی تو ایسی کہ عمران کا اس پر فریفتہ ہو جانا ممکنات میں سے تھا۔دوسری خوش قسمتی یہ کہ سسرال میں ساس نام کی جو خوفناک چیز ہوتی ہے وہ نہ ہونے کے برابر تھی سمجھ لیں کہ بس اللہ میاں کی گائے تھی افشاں کی ساس اور اسے بھی قسمت کا لکھا ہی سمجھنا چاہیے۔

سسرال میں صرف اور صرف رات کا کھانا بنانا افشاں کی ذمہ داری تھی۔ وہ بھی صرف اُس وقت جب اُس کا موڈ ہوتا۔رات کے گیارہ بجے ہوں یا بارہ اگر افشاں کا موڈ نہ ہوتا تو وہ صاف منع کر دیتی تھی اور اس وقت اس کی ساس کسی نہ کسی طرح گھر کے ماحول کو بگڑنے سے بچا لیتی تھیں۔اگر کوئی اتنی دیر سے کھانا پکنے کا غلطی سے پوچھ بھی بیٹھتا تو افشاں ہمیشہ کہتی پارلر میں میرے کلائنٹ آ گئے تھے تو دیر ہو گئی۔ اکثر دیور بیچارہ باہر سے جا کر کھانا لے آتا۔ ناشتے کی تیاری تو افشاں کی ویسے بھی ذمہ داری نہیں

تھی۔ وہ عمران کو ناشتا دے کر دوبارہ سو جاتی اور دوپہر تک پڑی سوتی رہتی۔ یہ سب معمولات ساس سے زیادہ افشاں کے سسر کے لیے ناقابل برداشت ہوتے جا رہے تھے۔ افشاں جب اٹھتی تو تیار ہو کر پہلے اپنی ماں کے گھر جاتی اور پھر پارلر میں آ کے بیٹھ جاتی میکے میں روز روز جانا کوئی اچھی بات نہیں ہوتی دبے لفظوں میں یہ بات افشاں کے ساس اور سسر دونوں کی اس سے کہہ چکے تھے پر جسے پیا چاہے اسے ڈر کس کا۔ افشاں ایک کان سے سنتی اور دوسرے سے نکال دیتی، اس طرح افشاں کا یہ معمول اس گھر کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔

عزیز صاحب گھر کے اس ماحول سے ہر وقت بیزار رہتے حالانکہ عمران اپنے ماں باپ کا بہت خیال رکھتا تھا اور اُن کا ادب واحترام میں کوئی کمی نہیں آنے دیتا تھا۔ پھر بھی عزیز صاحب کو اپنے بڑے بیٹے کی بیوی سے جو توقعات تھیں افشاں بیگم اُن میں پوری طرح ناکام ہو چکی تھیں وہ ہر وقت اپنے دوسرے بیٹے سے کہتے رہتے کہ کاش بڑی بہو اس گھر میں سمجھدار آ جاتی تو وہ اس گھر کو سنبھال لیتی۔'' وہ یہ سب کچھ دیکھ کر جیسے اندر ہی اندر کڑھتے رہتے ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ عمران کو بھی سمجھاتے رہتے کہ اب بھی وقت ہے افشاں کو سمجھاؤ گھر ایسے نہ بنتے ہیں اور نہ چلتے ہیں۔

کیا کوئی بھی عورت ایسی ناسمجھ ہو سکتی ہے؟ یہی وہ سوال ہے جس نے سب کے دل و دماغ میں ہلچل مچا رکھی تھی اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ افشاں ایسی کیوں ہے۔ افشاں یہ سب شعوری طور پر نہیں کرتی تھی کچھ باتیں انسان کے لاشعور میں اس طرح سما جاتی ہیں کہ اس کو خود پتا نہیں چلتا کہ وہ کیا کر رہا ہے ایسا ہی کچھ افشاں کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔

مہوش افشاں کی بہترین دوستوں میں سے تھی بہت اچھا وقت دونوں نے ایک ساتھ گزارا تھا۔ مہوش کی شادی افشاں سے پہلے ہو گئی تھی افشاں مہینے میں ایک آدھ بار مہوش سے ملنے اُس کے سسرال چلی جاتی پر اُسے کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا جیسے مہوش کچھ زیادہ خوش نہیں ہے۔ وہ سوچتی کہیں یہ میرا وہم تو نہیں ہے یا مہوش واقعی اپنی شادی سے ناخوش ہے۔ اس نے کئی بار مہوش سے اس قسم کے سوالات کیے تھے پر مہوش پتا نہیں کس مٹی کی بنی ہوئی تھی اس نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ وہ اپنی شادی سے بھی خوش ہے اور اسے سسرال والوں سے بھی کوئی شکایت نہیں ہے۔ پھر بھی پتا نہیں کیوں افشاں کا دل اس کے جواب سے مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ مہوش کی شادی کو قریب قریب ایک سال ہونے والا تھا اور اس ایک سال میں افشاں نے مہوش کے چہرے پر خوشی کی جگہ ہمیشہ ایک بے نام سی اُداسی ہی دیکھی تھی۔ عموماً شادی کے بعد لڑکی کے چہرے پہ ایک خاص قسم کی کشش اور چمک آ جاتی ہے پر مہوش کے چہرے کو دیکھ کر ایسا نہیں لگتا تھا۔ وہ ہمیشہ کھوئی کھوئی سی رہتی۔

☆......☆......☆

اس دن صبح سے ہی افشاں کا دل بری طرح سے گھبرا رہا تھا جیسے کچھ انہونی ہونے والی ہے۔ بار بار اسے برے برے خیالات آتے اور وہ انھیں ذہن سے جھٹک دیتی۔ اچانک زور زور سے دروازہ پیٹنے کی آواز آئی۔

''افشاں...ارے افشاں، بیٹا دروازے پر جا کر دیکھو تو ذرا کون ہے جو اس بری طرح دروازے کو پیٹ رہا ہے'' افشاں کی ماں نے اُسے آواز دے کر کہا افشاں اوپر چھت پر صفائی کر رہی تھی ماں کی آواز سن کر دوڑتی ہوئی باہر دروازے کی طرف لپکی۔ دروازہ کھولا سامنے ہی مہوش کا بھائی عاشر کھڑا تھا۔

اُس کے چہرے پر پریشانی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ کبھی اُن کے گھر اس طرح نہیں آیا تھا۔

''یاالٰہی خیر'' افشاں کے منہ سے بے اختیار نکلا

''افشاں باجی! مہوش آپی کی طبیعت بہت خراب ہے انہیں اسپتال میں ایڈمٹ کیا گیا ہے۔ وہ آپ کو بہت یاد کر رہی ہیں۔ امی نے کہا ہے جا کر افشاں کو بلا لاؤ۔ میں آپ کو اطلاع دینے آیا ہوں ہوسکے تو جلد سے جلد ہوسپٹل آجائیں'' عاشر کا یہ کہتے ہوئے جیسے گلا رندھ گیا اس نے بڑی مشکل سے اپنی بات مکمل کی۔

''خدا خیر کرے ایسا کیا ہوگیا اچانک سے مہوش کو؟'' افشاں نے گھبرا کر پوچھا۔

''میں آپ کو ٹھیک سے بتا نہیں سکوں گا۔ آپ کو اگر چلنا ہے تو جلدی سے آجائیں میں ہوسپٹل ہی جارہا ہوں'' عاشر نے کہا۔

''اچھا تم ایک منٹ یہیں رُکو میں امی سے اجازت لے کر بس ابھی آئی۔''

☆......☆......☆

سارے راستے وہ مہوش کے بارے میں ہی سوچتی رہی کہ آخر اُس کی طبیعت اچانک سے کیسے خراب ہوگئی۔ ابھی تین چار دن پہلے تو اُس کی ملاقات مہوش سے ہوئی تھی تب تو وہ ٹھیک تھی یا خود کو ٹھیک دکھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ان ہی سوچوں میں ڈوبی ہوئی آخر کار وہ اسپتال پہنچ گئی مگر اسپتال میں اس نے جو مہوش کی حالت دیکھی تو اس کی چیخیں نکلتے نکلتے رہ گئیں۔ اُسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ وہی مہوش ہے اس وقت وہ شاید سو رہی تھی یا اسے نیند کی دواؤں سے سلادیا گیا تھا۔

''آنٹی یہ مہوش کو کیا ہوا یوں اچانک؟'' اُس نے مہوش کی ماں سے پوچھا مہوش کی امی نے زخموں سے چور اپنی بیٹی کو اور جگہ جگہ سے مار پیٹ کے نشانات کی طرف دکھ سے دیکھا اور بولیں۔

''بس بیٹا کیا بتاؤں۔ میری بچی کے نصیب میں ایسا ہی لکھا تھا۔ اس کے سسرال والے کچھ اچھے لوگ نہیں تھے دو سال ہوگئے اس کی شادی کو پر ایک دن بھی اس نے وہاں چین وسکون سے نہیں گزارا، کون سی ذہنی وجسمانی اذیت ہے جو اس نے نہ اُٹھائی ہو۔ پر بہت ہمت اور صبر والی ہے میری بچی جو سب کچھ خاموشی سے برداشت کرتی رہی۔ پر کل تو اُنھوں نے حد ہی کردی۔ اسے بہت زیادہ مارا پیٹا اور اس کی یہ حالت بنادی۔ پڑوسیوں نے مجھے فون کیا اور جب میں وہاں پہنچی تو مہوش بے ہوش تھی۔ میں فوراً اسے اسپتال لے آئی'' اتنا کہہ کر وہ افشاں سے لپٹ کر زاروقطار رونے لگیں۔

''پر یہ سب کس لیے کیوں کیا انھوں نے؟''

''مہوش کی ساس کو اولاد کی جلدی ہے اور میری مہوش ماں نہیں بن سکی۔ اب اس میں اس کا کیا قصور ہے اولاد تو اللہ کی دین ہے...اور ابھی کون سے دس برس ہوئے ہیں۔ دو سال ہی ہوئے ہیں۔ اس کی ساس اپنے بیٹے کی دوسری شادی کرانا چاہتی ہے اور اسے گھر سے نکال کر طلاق دلوانا چاہتی ہے، اسی لیے کیا انھوں نے یہ سب ڈراما...'' ان کے آنسو تھے کہ تھمتے نہ تھے۔ یہ سب سن کر افشاں کے دل ودماغ سلگ اٹھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کر ڈالے پر بے بسی اس کے آڑے آرہی تھی۔

''بیٹا میں بھی اب تھک گئی ہوں اس کے دکھ سہتے سہتے۔ جب آتی تھی سسرال والوں کے مظالم کی ایک لمبی داستان ہوتی تھی اس کے پاس''

''تو آپ اتنے دن تک خاموش کیوں رہیں؟''

''میں سمجھتی تھی جیسے ہی کوئی خوشخبری ہوگی اور مہوش ماں بننے والی ہوئی تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔ رو رو کے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگا کرتی تھی۔ پر

اب میرا صبر بھی جواب دے گیا ہے۔ اب میں اسے واپس اُس جہنم میں نہیں جانے دوں گی جہاں وہ پل پل مرتی ہے۔'' اُنھوں نے روتے ہوئے لہجے میں اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''بیٹیاں بری نہیں ہوتیں پر اُن کے نصیبوں سے ڈر لگتا ہے۔ بیٹا اب دیکھو اسے کیا حال کر دیا ظالموں نے'' اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کہہ سکیں اور افشاں دم سادھے اُن کی باتیں سنتی رہی، اس کا مطلب ہے میں نے جو مہوش کے بارے میں اندازہ لگایا تھا وہ ٹھیک تھا۔'' اُس نے نہایت کرب سے ایک نظر سوئی ہوئی مہوش پر ڈالی۔ مہوش کچھ دیر کے لیے ہوش میں آتی تھی اور پھر بے ہوش ہو جاتی تھی۔ ڈاکٹر نے اس سے بات کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اس لیے وہ پھر آنے کا کہہ کر وہاں سے چلی آئی۔

گھر آ کر بھی وہ مسلسل مہوش کے بارے میں سوچتی رہی اور اُسی وقت اُس نے اپنے دل میں یہ تہیہ کر لیا کہ وہ مہوش کی طرح ہرگز اپنے سسرال والوں اور اپنے شوہر سے دب کر نہیں رہے گی۔ چاہے اسے طلاق ہی کیوں نہ ہو جائے۔ ایسے ظلم وستم وہ کسی قیمت پر نہیں سہے گی۔ یہ بات اُس کے لاشعور میں کہیں چھپ کر بیٹھ گئی۔

پھر جب افشاں کی پہلی شادی ہوئی تو اُس کے سسرال والے مہوش کے سسرال والے جیسے تو نہیں تھے مگر افشاں کے رویوں نے انھیں ان جیسا بنا دیا چنانچہ جلد ہی افشاں نے ان کی باتوں اور نصیحتوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ وہ سمجھی اس مطالبے سے وہ اپنے سسرال والوں کو تیر کی طرح سیدھا کر دے گی پر ایسا نہ ہو سکا اور افشاں کو طلاق ہو گئی۔

کچھ عرصے بعد اُس کی ملاقات عمران سے ہوئی اور یہ ملاقات محبت میں بدل گئی اور بالآخر تھوڑی سی مخالفت کے بعد دونوں کی شادی ہو گئی۔ عمران سے اس نے شادی سے پہلے ساری باتیں منوالی تھیں کہ وہ کیا برداشت کر سکتی ہے اور کیا نہیں۔ بلکہ اس نے صرف برداشت نہ کرنے کی ایک لمبی لسٹ عمران کو گنوائی تھی جسے محبت کے نشے میں چور عمران نے بنا سوچے سمجھے مان لیا۔ ویسے بھی عمران کے گھر والے فطرتاً اچھے لوگ تھے لیکن افشاں کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اس نے تو یہ تجزیہ کرنے کی کوشش بھی کبھی نہیں کی کہ عمران کے گھر والے اس کے پہلے سسرال کے مقابلے میں ایسے تھے جیسے وہ آدمیوں کا گھر تھا تو یہ فرشتوں کا مسکن ہے۔ بنا سوچے سمجھے وہ بدستور اپنی روش پر چل رہی تھی۔ اسی لیے اس دن عمران نے اس سے اس قدر اونچے لہجے میں بات کی اور وہ دیر تک عمران کی اس تبدیلی پر حیران ہوتی رہی لیکن اس نے اپنی روش کو بدلنے کے بجائے زیادہ سے زیادہ دیر تک اپنی ماں کے گھر گزارنا شروع کر دیا اور یہ دورانیہ پہلے سے زیادہ ہوتا چلا گیا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ عمران اس سے اپنے رویے کے لیے سوری بولے گا، پر ایسا نہیں ہو سکا۔

اسی دوران افشاں کے بھائی سہیل کی شادی کا وقت آ گیا۔ اب تو افشاں کے پاس سولڈ ریزن بھی تھا میکے میں رہنے کا، ویسے بھی ان حالات میں اسے سسرال کہاں یاد رہنے والا تھا۔ دوسری طرف عزیز صاحب کی برداشت جواب دینے لگی تھی۔

ایک دن اتفاق سے عمران گھر پہ موجود تھا اور افشاں حسب دستور اپنی ماں کے ہاں رکی ہوئی تھی۔ عزیز صاحب جو پہلے سے ہی موقع کی تلاش میں تھے اس سے اچھا موقع بات کرنے کا اُنھیں نہیں مل سکتا تھا۔ اپنے چھوٹے بیٹے عرفان سے کہہ کر اُنھوں نے عمران کو اپنے کمرے میں بلوا لیا۔ کچھ ہی دیر بعد عمران اُن کے کمرے میں موجود تھا۔
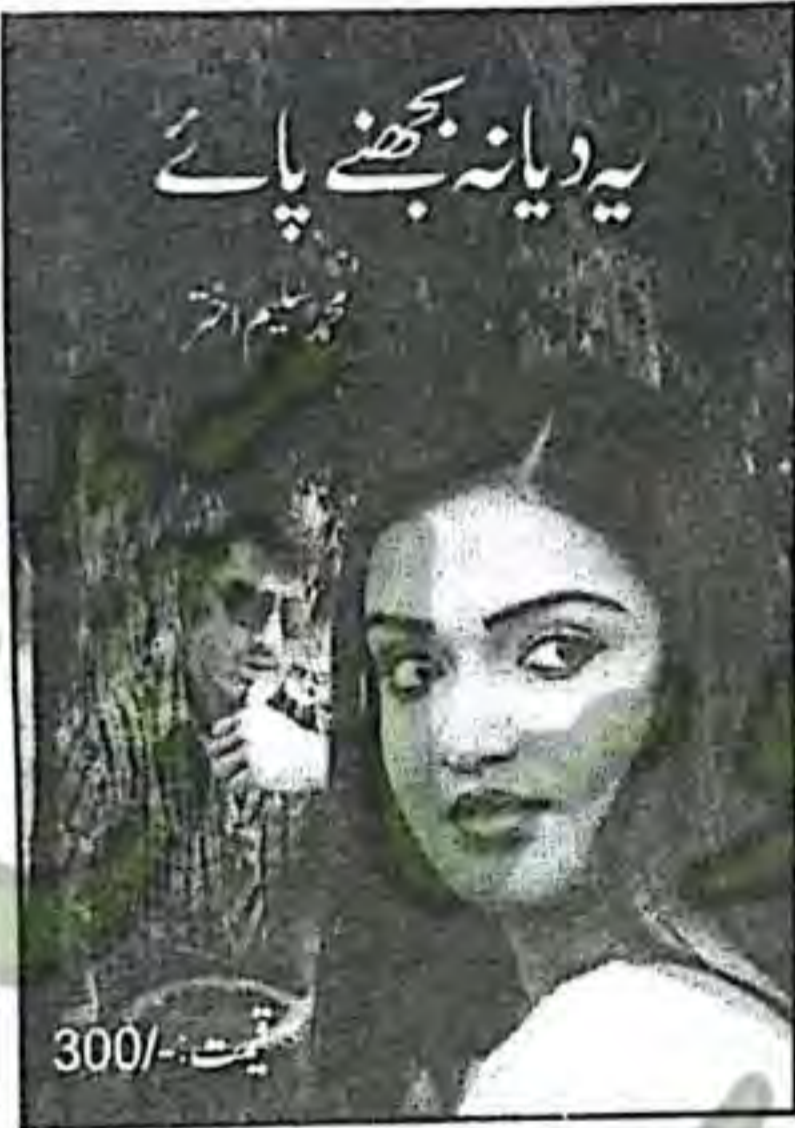
''ابو جی آپ نے بلوایا خیریت تو ہے؟'' عمران کو یہ بات اچھی طرح پتا تھی کہ عزیز صاحب بلاوجہ کسی کو اس طرح نہیں بلاتے، ضرور کوئی اہم بات ہے۔

''میں نے تمہیں کیوں بلوایا ہے یہ تم اچھی طرح سے جانتے ہو۔'' عزیز صاحب نے اپنی بات شروع کرتے ہوئے مزید کہا ''آخر یہ سلسلہ کب تک چلنے والا ہے۔ تمہاری ماں آئے دن بیمار رہتی ہے۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے کیا نہیں، کوئی دیکھنے والا نہیں۔ جو گھر کے بڑے ہیں اُنہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہی نہیں ہے یا پھر وہ اپنی ذمہ داریوں سے جان بوجھ کر پہلو تہی کر رہے ہیں۔ تمہاری بیوی تو اس گھر میں سمجھو ہوتی ہی نہیں ہے۔ ہوتی بھی ہے تو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ اسی لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے۔ اب ہمیں عرفان کی شادی کر دینی چاہیے۔ شاید اُس کی دلہن آ کر اس گھر کے بکھرے ہوئے شیرازے کو سمیٹ سکے۔ کیوں کہ تمہاری بیوی میں کوئی تبدیلی ہوتی ہوئی نظر نہیں آ رہی اور میری تو اب ہمت جواب دے چکی ہے۔'' انھوں نے ہلکا سا توقف کیا اور پھر بولے۔

''اور ہاں ایک بات جو بہت اہم ہے وہ یہ کہ ہم سوچ رہے ہیں الگ ہو جائیں کیوں کہ ہمیں لگتا ہے کہ اس گھر میں ہماری کوئی ضرورت نہیں رہی'' عزیز صاحب نے اپنی بات تقریباً ختم کرتے ہوئے عمران کی طرف دیکھا۔ عمران نے بھی ایک نظر اٹھا کر اپنے ابو کی طرف دیکھا اور بولا۔

''کیا کمال کا ظرف ہے ابو آپ کا، یعنی گھر آپ کا۔ بجائے اس کے کہ آپ مجھے کہتے کہ میں اپنی بیوی اور بچوں کو لے کر اس گھر سے چلا جاؤں الٹا آپ خود جانے کا کہہ رہے ہیں۔ میں آپ کی اس بات پر جتنی بھی شرمندگی کا اظہار کروں وہ کم ہی ہوگا۔'' وہ رکا اور پھر بولا۔ ''آپ عرفان کی شادی

کرنا چاہتے ہیں تو ضرور کریں۔ اس کے لیے آپ کو میری یا کسی کی بھی اجازت کی ضرورت نہیں ہے اور اگر آپ کو یہ لگتا ہے کہ عرفان کی بیوی افشاں سے اچھی بہو ثابت ہوگی تو یقین کیجیے ابو! میں خود یہی سمجھتا ہوں دنیا میں شاید ہی کوئی عورت ایسی ہو جو افشاں جتنی نا سمجھ ہو۔" پہلی بار عزیز صاحب نے بیٹے کو اس اپنی بیوی کے بارے میں اس طرح سے بات کرتے ہوئے سنا تھا ورنہ وہ تو یہی سمجھتے تھے کہ یہ جورو کا غلام بیوی سے ڈرتا ہے اور اس کے بارے میں ایک لفظ بولنے کی جرأت نہیں رکھتا۔

"آپ عرفان کی شادی کریں اور اس کی پروا بھی نہ کریں کہ افشاں اس گھر کی بڑی بہو ہے تو اس کی شادی میں شرکت لازمی ہے۔ ہرگز نہیں، اگر افشاں کو اپنی حیثیت کا احساس نہیں ہے تو آپ بھی اس کی پروا مت کیجیے۔ اسے ٹھیک لگے گا تو وہ آئے گی اور نہیں صحیح لگے تو نہیں آئے گی پر کسی کے ہونے اور نہ ہونے سے کوئی بھی کام رکتا نہیں ہے۔ میں ہر حال میں اور ہر قیمت پر آپ کے ساتھ ہوں" یہ سب سن کر عزیز صاحب کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور انھوں نے بڑھ کر بیٹے کو گلے لگا لیا۔ دیر تک دونوں باپ بیٹے ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے اس کھوئے ہوئے لمس کا مزا لیتے رہے جو برسوں پہلے جانے کب اور کیسے گم ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

افشاں اپنے بھائی کی شادی میں مصروف تھی جب اسے یہ پتا چلا کہ اس کے دیور عرفان کی شادی چٹ منگنی پٹ بیاہ کی طرح ہو رہی ہے تو افشاں کے تن بدن میں جیسے آگ بھڑک اٹھی اور وہ غصے سے بولی۔

"سمجھتے کیا ہیں یہ اپنے آپ کو۔ مجھے ایسے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال دیا جیسے میری کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔"

"ایسا کیسے کر سکتے ہیں وہ۔ تم اُس گھر کی بڑی بہو ہو۔ تمہارے بغیر ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہارے دیور کی شادی ہو اور تم ہی اس میں شریک نہ ہو۔" افشاں کی ماں نے بھی اسی کی سوچ کو آگے بڑھایا۔

"میری جاتی ہے جوتی اگر مجھے اس طرح اجنبیوں کی طرح بلانے آئے بھی تو میں تو نہیں جاؤں گی ہاں۔ مجھے تو عمران پر حیرانی ہے اس نے ایسا ہونے کیسے دیا۔" افشاں کو اب بھی یہ گمان تھا کہ عمران تو اس کے بغیر ہل کے پانی نہیں پی سکتا تو یہ اتنی بڑی بات ہو کیسے سکتی ہے۔

"باجی اب آپ جو بھی کہو آپ کے سسرال والے ایسا کر رہے ہیں" افشاں کی بہن نائیلہ نے جیسے بجھتی آگ کو اور بھڑکایا۔

اب افشاں کے سامنے یہ سوال خم ٹھونک کے کھڑا ہو گیا کہ وہ اپنے دیور کی شادی کو اہمیت دے کر اس میں پوری طرح سے شریک ہو یا اپنے بھائی کی شادی کو پہلے دن سے آخری دن تک انجوائے کرے۔

☆......☆......☆

سہیل کی شادی سے تین دن پہلے عرفان کی شادی تھی عمران نے شادی کا کارڈ ایسے بھجوایا جیسے غیروں کو یا غیر اہم رشتے داروں کو بھجواتے ہیں۔

شادی والے دن افشاں کی بے چینی عروج پر تھی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ مجبور ہو کر اس نے اپنی انا کو پسِ پشت ڈال کر عمران کو فون کیا مگر کئی بار فون کرنے پر بھی عمران نے اس کا فون ریسیو نہیں کیا اور یوں وہ اور بھی زخمی ناگن کی طرح اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگی۔

"اس شخص کو ہوا کیا ہے۔ یہ کیسے اس طرح اچانک بدل گیا جیسے کعبے سے کافر پھر جاتے ہیں"

افشاں نے سوچا اور ہاتھوں کی انگلیوں کو مروڑنے توڑنے لگی۔ افشاں کی ماں اسے اس حالت میں بہت دیر سے دیکھ رہی تھیں انھوں نے اس کے پاس آ کر کہا۔

"بیٹا میری ایک بات مانو گی؟"

"جی امی۔"

"تم اس شادی میں چلی جاؤ بلکہ ہم سب چلتے ہیں۔ اس طرح شادی میں نہ جانے سے مجھے ڈر ہے کہ تمہارا گھر خراب ہوسکتا ہے اور یہ کسی بھی طرح عقل مندی نہیں ہوگی۔ ذرا سوچو اب تم دو بچوں کی ماں ہو اور یہ عمران کے بچے ہیں۔ اگر خدانخواستہ کچھ ہوا تو وہ اپنے بچوں کو بھی تمہارے پاس رہنے نہیں دے گا اور پھر تم اپنے بچوں کے بغیر کیسے زندگی گزارو گی۔"

افشاں کو ماں کی بات سمجھ آ گئی اور اس نے شادی میں جانے کا فیصلہ کرلیا لیکن وہ شادی میں اپنی ماں، بہنوں اور بھائی کے ساتھ شریک ہوئی۔ اس کا دل چاہتا رہا کہ وہ اپنے غصے کو اس طرح نکالے کی عرفان کی شادی ایک تماشا بن جائے پر وہ ایسا نہیں کرسکی کیونکہ اس کی ماں نے اسے یہ بات بھی اچھی طرح سمجھا دی تھی کہ اگر تم نے کچھ بھی ایسا ویسا کیا تو سمجھ لو چند دن بعد تمہارے اپنے بھائی کی شادی ہے اور وہ اس شادی میں ایسا کچھ کرسکتے ہیں جو شاید اس سے بہت زیادہ برا ہوگا جو تم وہاں کرو گی۔ اس لیے مصلحت اسی میں ہے کہ شادی میں اس طرح شریک ہونا جیسے کوئی بات ہی نہیں ہے۔ دیکھنے والے دیکھیں تو انھیں بھی یہی معلوم ہو جیسے سب کچھ ٹھیک ہے۔"

افشاں نے دل پہ پتھر رکھ کر اپنے دل میں اگنے والے کانٹوں اور سلگتے انگاروں کو اپنے ہی دل میں بھسم کرلیا اور وہ شادی میں اپنی ماں کے بتائے ہوئے طریقے پر شریک ہوئی۔ عمران کے گھر والوں نے بھی اس کا ایسا سواگت کیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ سب ایسے ملے جیسے انھیں افشاں کی اور اس کے گھر والوں کی شرکت پر بے انتہا خوشی ہوئی ہو۔ بچے عمران سے ایسے بھاگ کر چمٹے کہ جیسے برسوں سے بچھڑے ہوئے ہوں اور عمران بھی اُس سے اِس طرح پیش آنے لگا جیسے دونوں کے درمیان کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ مجبوراً وہ بھی اسی طرح کی اداکاری کرنے لگی۔ اور یہ ناٹک رات گئے ختم ہوگیا۔ اسے رہ رہ کر ملال ہوتا رہا کہ عمران نے ایک بار بھی اس سے گھر چلنے کو نہیں کہا اور وہ دل مسوس کر اپنی ماں کے گھر واپس آ گئی۔

☆......☆......☆

کچھ دن بعد اس کے بھائی کی شادی بھی خوش اسلوبی سے انجام پا گئی اور عمران کے گھر والوں نے سکھ کا سانس لیا کہ چلو اب تو افشاں بیگم اپنے گھر لوٹ آئیں گی۔ پر افشاں وہ تو مر سکتی تھی مگر عمران کے منائے اور ہاتھ پاؤں جوڑے بغیر اس گھر میں جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ افشاں کی دیکھا دیکھی اس کی چھوٹی بہن نائیلہ بھی میکے میں پڑی رہتی لیکن اس کا شوہر کافی سخت مزاج واقع ہوا تھا اس لیے نائیلہ چاہتے ہوئے بھی افشاں کی برابری نہیں کرسکتی تھی۔ بھائی کی شادی کو جواز بنا کر وہ بھی کئی دنوں سے افشاں کی طرح میکے ہی میں تھی۔ افشاں کے بھائی سہیل کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اس لیے اس کی بیوی نے کچھ دن تو کوئی خاص نوٹس نہیں لیا لیکن جب شادی ذرا پرانی ہوئی تو اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی دونوں نندیں شادی شدہ ہونے کے باوجود اپنے سسرال کے بجائے یہاں میکے میں اپنی ماں کے گھر میں رہ رہی ہیں۔

ایک دن اُس نے ہمت کر کے اپنے شوہر سہیل

سے اس بات کا تذکرہ کیا۔ سہیل نے اس سے پہلے یہ بات کبھی نوٹ ہی نہیں کی تھی کہ اُس کی بہنیں کتنا آتی جاتی ہیں یا کتنے دنوں تک یہیں اس کے گھر میں رہتی ہیں۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتا تھا اور ویسے بھی مرد حضرات ان چکروں میں ذرا کم ہی پڑتے ہیں۔ پر آج جب اُس کی بیوی نے اُسے اس بات کا احساس دلایا تو اُسے لگا جیسے وہ ٹھیک کہہ رہی ہے لیکن پھر بھی اُس نے بیوی کی بات کا زیادہ نوٹس نہیں لیا اور اُلٹا اُس سے کہنے لگا کہ ''تمہیں کیا پرابلم ہے اس بات سے۔ وہ دونوں شروع سے ہی امی کے پاس آتی ہیں۔ اُن کا بھی گھر ہے وہ آئیں گی۔''

''آپ شاید مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ میرے کہنے کا یہ مقصد نہیں اصل میں ان دونوں کو اپنے سسرال پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ لڑکی کا اصل گھر تو اُس کا سسرال ہوتا ہے۔ خدانخواستہ کبھی ان کے شوہروں کو اس بات پر غصہ آگیا تو ان کا گھر خراب بھی ہوسکتا ہے۔ مرد کا کیا بھروسہ اگر کسی وقت طیش میں آجائے تو'' سیما نے بات کو زیادہ بنا کے کہا تو سہیل سوچ میں پڑ گیا پر وہ اپنی بیوی سیما کی بات کا کوئی جواب نہیں دے سکا۔ البتہ سوچوں نے سہیل کو جکڑ لیا سیما کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہی تھی۔ وزن ہے اس کی باتوں میں۔ پر میں آپی کو کیسے منع کرسکتا ہوں کہ وہ میکے نہ آیا کریں یا کم سے کم آئیں۔ پھر سہیل کو اس دن کی بات یاد آگئی جب وہ شادی سے پہلے کسی کام سے افشاں آپی کے سسرال گیا تھا اور اُس نے عزیز صاحب سے افشاں آپی کا پوچھا تو اُنھوں نے بڑے تلخ لہجے میں کہا تھا کہ افشاں گھر میں ہوتی کب ہے جو آپ اُس کا پوچھنے آئے ہو۔'' اُس وقت یہ بات اُس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی پر اب وہ اس بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ چکا تھا اور اب اُسے اس بات کا بخوبی احساس ہو رہا تھا کہ افشاں آپی کے سسرال والے اُن سے زیادہ خوش نہیں اور یہ بات افشاں آپی بھی یقیناً جانتی ہوں گی، اس کے باوجود وہ اطمینان سے یہاں رہتی ہیں۔ وہ چھوٹا تھا اور فی الحال اس مسئلے کا کوئی حل بھی اُسے نظر نہیں آرہا تھا۔ اُس نے سب وقت اور حالات پہ چھوڑ دیا اور چپ رہنے میں ہی بہتری سمجھی۔ لیکن اس وقت اسے اس مسئلے کو سنجیدگی سے لینا ہی پڑا جب اس نے محسوس کیا کہ سیما بھی اب ہر دوسرے دن اپنے میکے جانے کا کہتی ہے اور کئی کئی دن وہاں سے آنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ وہ ضد کرتا ہے تو بہانے بنا کر مزید کچھ دن رک جاتی ہے اور اگر اُسے منع کرو تو ناراض ہوجاتی ہے۔ ایک دن تو سہیل نے چڑ کر اُس سے کہہ دیا۔

''اگر تمہیں اپنے گھر جانے کا اتنا ہی شوق ہے تو پھر شادی کیوں کی تھی وہیں رہتیں آرام سے۔'' سیما نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا اور بولی۔

''آپ کو میرا بار بار میکے جانا کتنا برا لگتا ہے۔ آپ کی امی اور بہنوں کو بھی میرا میکے جانا پسند نہیں۔ اگر یہی بات میں آپ کی بہنوں کے لیے کہوں تو نہ آپ کو اچھی لگے گی نہ امی جان کو۔'' وہ ٹھہر کر بولی۔

''آپ ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچیے کہ بالکل ایسا ہی کیا افشاں آپی کے سسرال والے نہیں سوچتے ہوں گے اُن کے شوہر اور اُن کے سسرال والے بھی ایسا ہی ری ایکٹ کرتے ہوں گے جو اس وقت آپ کر رہے ہیں۔ میں آپ کو صرف اس بات کا احساس دلانا چاہ رہی ہوں کہ جو بات ہم اپنوں کے لیے ٹھیک سمجھتے ہیں وہ بات دوسروں کے لیے ٹھیک کیوں نہیں؟'' سہیل سیما کی باتیں سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ آئے دن اس کی بہنیں میکے میں پڑی رہتی ہیں اگر سیما بھی ایسا کر رہی ہے تو یہ کیسے غلط ہوسکتا ہے۔ اگر یہ غلط ہے تو پھر افشاں اور آپی اور نائیلہ بھی غلط ہیں۔''

"تو کیا تم ان کی طرح اپنے شوہر کو ناراض کرو گی؟"، سہیل نے کہا
"میں ہرگز آپ کو ناراض نہیں کر رہی۔ پر آپ اس گھر کے مرد ہیں گھر میں کیا ہو رہا ہے یہ آپ کو خبر ہونا چاہیے۔ اگر ان کا گھر خراب ہوا خدانخواستہ، تب اس مسئلے سے آپ نظریں نہیں چرا سکیں گے۔ بہتر ہوگا پانی سر سے اونچا ہونے سے پہلے ہی آپ توجہ دے دیں ورنہ کوئی بھی خوش نہیں رہ سکے گا۔ جن عورتوں کا گھر بگڑ جاتا ہے، میں نے دیکھا ہے وہ دوسرے کا گھر بستے ہوئے دیکھ کر خوش نہیں ہوتیں۔"
سیما نے اپنی رائے دی۔ سہیل اس کی بات کی تہہ کو سمجھ اور سن کر بظاہر غصے سے وہاں سے چلا آیا لیکن راستے بھر وہ سیما کی باتوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ جب کئی دن سیما کو اپنے میکے گئے ہوئے ہو گئے تو آخر ایک دن سہیل کی ماں کی برداشت جواب دے گئی۔
"کیوں میاں یہ کیا چکر چل رہا ہے۔ میں سب دیکھ کر بھی خاموش ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمہارا اور بہو کا جو دل چاہے گا وہ ہی کرو گے۔"
"میں کچھ سمجھا نہیں امی آپ کس بارے میں بات کر رہی ہیں؟"
"اچھا تو اب یہ بھی بتانا پڑے گا۔ کتنے دن ہو گئے بہو کو میکے گئے۔ وہ آخر آتی کیوں نہیں۔ کیا ساری زندگی ماں کے گھر ہی پڑی رہے گی"
"اوہ تو یہ بات ہے" وہ اپنے بیڈ سے اٹھا اور دروازے میں کھڑی اپنی ماں کو کاندھوں سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے بولا۔
"میں تو سمجھ رہا تھا سب لڑکیاں شادی کے بعد اسی طرح اپنے میکے میں زیادہ رہتی ہیں جیسے ہماری افشاں آپی اور نائیلہ رہتی ہیں پر آپ تو سیما کے میکے میں رہنے سے ناراض ہو رہی ہیں؟"

"یہ تم سے کس نے کہا کہ شادی کے بعد بھی لڑکیاں میکے میں رہتی ہیں۔ ارے کیا شادی اس لیے کرتے ہیں کہ لڑکی میکے میں پڑی رہے" ماں کی آواز اونچی ہوئی تو افشاں اور نائیلہ بھی وہاں آ گئیں...
"اچھا امی اگر یہ بات غلط ہے۔ ٹھیک نہیں ہے تو میں آج ہی جا کر سیما کو لے آؤں گا۔" سہیل نے کہا تو دونوں بہنوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور وہاں سے خاموشی سے چلی آئیں، جیسے ان کے پاس کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ افشاں کی امی وہاں سے اٹھیں اور اپنے کمرے میں آ گئیں، حسب معمول کچھ ہی دیر بعد افشاں اور نائیلہ بھی وہیں آ گئیں۔ ماں کو اس طرح بیٹھا دیکھ کر وہ پریشان ہو گئیں اور ماں سے اس پریشانی کی وجہ پوچھنے لگیں۔ جواب میں اُنھوں نے اپنی اور سہیل کی ہونے والی گفتگو ان دونوں بہنوں کو سنا دی جس کا علم دونوں کو تھا اور ان دونوں کی شہ پر ہی اُنھوں نے آج سہیل سے بات کی تھی کیوں کہ دونوں بہنیں جانتی تھیں کہ ہم دونوں شادی شدہ ہیں اور اگر ہم نے ڈائریکٹ سہیل سے بات کی تو یہ ہمارے حق میں اچھا ثابت نہیں ہوگا۔ وہ کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔ اس لیے ان دونوں نے ماں کو اُکسایا کہ وہ اس بارے میں سہیل سے بات کریں کہ سیما نے یہ کیا تماشا لگایا ہوا ہے۔ ان کا خیال تھا اپنی ماں کی بات سن کر سہیل سیما کو کھری کھری سنا کر گھر لے آئے گا۔ پر جو کچھ سہیل نے اور جس انداز سے کہا تھا اسے سن کر تو ان کی ماں ہی سوچ میں پڑ چکی تھیں۔ افشاں کو ایک دم طیش آ گیا اور کہنے لگی۔
"آنے دیں آج سہیل کو میں بات کرتی ہوں۔ اس قسم کی بات اس نے کر کیسے دی۔ کیا یہ ہمارا گھر نہیں ہے۔ ہم اپنی ماں کے پاس آئے ہیں تو

اسے کیا شکایت ہے؟''
شام کو جب سہیل آیا تو پہلے تو اس کی امی یہ دیکھ کر ہی حیران ہو گئیں کہ اس کے ساتھ سیما نہیں تھی حالانکہ آج وہ توقع کر رہی تھیں کہ سہیل ان کی بات سننے کے بعد سیما کو ضرور ساتھ لائے گا۔
''سہیل مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے، اگر تم بزی نہ ہو تو'' افشاں نے کہا سہیل جو ٹی وی دیکھنے میں مگن تھا چونکتے ہوئے بولا۔
''آپ نے مجھ سے کچھ کہا آپی؟''
''ہاں تم سے ہی کہہ رہی ہوں اور کون ہے یہاں۔''
''اچھا بولیں کیا بات ہے۔ سب خیر تو ہے''
''ہاں سب خیریت ہے۔ میں اس گھر کی بات کر رہی ہوں۔'' افشاں نے اپنے اصل مطلب کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ''سہیل ہم نے تمھاری شادی اس لیے نہیں کی تھی کہ سیما روز روز سسرال کو چھوڑ کر اپنے میکے جا کر بیٹھ جائے اُسے کسی کا نہیں پر کم از کم امی کا تو خیال کرنا ہی چاہیے'' اتنا کہہ کر وہ جواب طلب نظروں سے سہیل کی طرف دیکھنے لگیں۔
''او... اچھا تو یہ بات تھی۔ حیرت ہے کچھ اس طرح کی باتیں صبح امی نے بھی کی تھیں مجھ سے۔'' سہیل نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''ویسے آپی اگر یہی بات میں آپ سے کہوں تو؟''
''کیا...... کیا مطلب ہے تمہارا۔ میں کچھ سمجھی نہیں؟'' افشاں انجان بن رہی تھی۔
''مطلب یہ آپی کہ مجھے تو اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی اگر سیما اپنے میکے جا کے رہتی ہے۔ اُس کی ماں کا گھر ہے ایک عمر گزاری ہے اُس نے وہاں۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن تو ہوئے ہیں ہماری شادی کو۔ اب اتنی جلدی تو وہ اپنے گھر والوں کو نہیں بھول سکتی۔ کچھ ٹائم تو لگتا ہے سسرال میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرنے میں'' وہ رکا اور اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کے کھڑا ہو گیا اور بولا۔
''آپ کی شادی کو تو چھ سال ہو چکے ہیں۔ آپ اب تک بھی اپنے سسرال میں ایڈجسٹ نہیں کر سکیں تو سیما تو پھر ابھی۔'' اس نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔ اتنا کہہ کر سہیل خاموش ہو گیا۔ افشاں بت بنی اُسے دیکھتی رہی۔ آج شاید پہلی بار اُسے کسی نے آئینہ دکھایا تھا اور وہ بھی اتنا صاف وشفاف جس میں اُسے اپنا ظاہر و باطن نظر آ گیا تھا۔ کافی دیر تک وہ یوں ہی گم سم سی بیٹھی رہی ''ارے افشاں کیا ہوا۔ اس طرح کیوں بیٹھی ہو۔ کچھ بتاؤ تو سہی۔ سہیل سے کر لی تم نے بات۔ کیا کہا اُس نے۔'' افشاں کی ماں نے اُسے ہلاتے ہوئے پوچھا۔ افشاں نے ایک دم چونک کر اپنی ماں کی طرف دیکھا اور اُن کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بولی۔
''امی میں تو غلط تھی پر آپ نے بھی کبھی مجھے سیدھا راستہ دکھانے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے روکا کیوں نہیں، امی اگر میرے سسرال والے خراب ہوتے تو میرا گھر کب کا خراب ہو چکا ہوتا۔ میں جان گئی ہوں، سب انسان اور سارے خاندان ایک جیسے نہیں ہوتے۔ جو کچھ مہوش کے ساتھ ہوا وہ ان لوگوں نے کیا جو بہت برے تھے۔ ان کا بدلہ میں سب لوگوں سے کیسے لے سکتی ہوں۔ عمران کے گھر والے تو بہت اچھے ہیں۔ میں نے جو کیا غلط کیا۔ آج مجھے سہیل نے آئینہ دکھایا ہے! میری دیکھا دیکھی نائیلہ بھی اپنا گھر چھوڑ کے یہاں میکے میں آئی رہتی ہے۔ یہ ٹھیک نہیں ہے امی۔ سارے ماں باپ یہی چاہتے ہیں کہ بیٹیاں شادی کے بعد اپنے گھر میں خوش رہیں اور میں۔ میں تو اپنی خوشیوں کو خود ہی آگ

لگا رہی تھی۔ میں غلط تھی امی بالکل غلط۔'' افشاں ایک دم چھلک کے رو پڑی اور ساتھ ہی اس کی امی اور بہن نائیلہ بھی اپنے آنسو نہیں روک سکیں۔ اسے آج اس بات کا شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے اپنے سسرال والوں کو کبھی اپنا سمجھا ہی نہیں۔ یہ تو عمران اور اُس کے گھر والوں کا بڑاپن ہے جو اُنھوں نے میری کوتاہیوں کو نظر انداز کیا اور کبھی کوئی تکلیف نہیں دی۔ پر میں کتنی ناسمجھ تھی کہ اُن کی محبتوں کے بدلے میں اُنھیں اذیت دیتی رہی، اس نے سوچا اور کہا۔

''آپ نے بھی کبھی روکا نہ ٹوکا مجھے۔ کیسی ماں ہیں آپ؟'' روتے ہوئے افشاں نے کہا تو اس کی امی بولیں ''ٹھیک کہتی ہو بیٹا! جب تک آگ اپنے دامن کو نہیں لگتی تو اس کی تپش کا پتا نہیں چلتا۔ دوسرے کے گھر میں لگی ہوئی آگ تو تماشا ہوتی ہے۔''

''میں تمہارا ٹائم مزید خراب نہیں کروں گی، بس اتنا کہوں گی کہ جو بات مجھے اتنے عرصے میں کوئی نہیں سمجھا سکا وہ ایک پل میں تم نے مجھے سمجھا دی۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔ اور ہاں ایک بات اور...... وہ یہ کہ تم جا کر سیما کو لے آؤ۔ میں بھی جا رہی ہوں اپنے گھر۔'' افشاں نے سہیل سے کہا تو وہ خوشی سے اپنی بہن کو گلے سے لگاتے ہوئے بولا۔

''سچ آپی مجھے بہت پہلے اپنے گھر کی طرف توجہ دینا چاہیے تھی مگر ابھی بھی دیر نہیں ہوئی ہے۔'' ایک پل میں افشاں کو لگا جیسے وہ اس کا بڑا بھائی بن گیا ہو۔

☆......☆......☆

افشاں واپس آئی تو کسی کو حیرانی نہیں ہوئی سب جانتے تھے دو چار دن میں پھر بیگ پیک کریں گی اور یہ جا اور وہ جا... مگر ایک ہفتہ پورا گزر گیا اور افشاں نے میکے جانے کا نام بھی نہیں لیا، ساتھ ہی عزیز صاحب اور عمران یہ معجزہ دیکھ کر بھی حیران تھے کہ گھر کے سب انتظامات کو افشاں ایسی چابک دستی سے سنبھال رہی تھی کہ انھیں لگتا تھا وہ کوئی خواب دیکھ رہے ہیں۔

ایک دن عمران اپنے آفس سے گھر آیا تو اپنا بیگ ایک طرف رکھتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال تھا آج تو تم ضرور اپنے گھر چلی گئی ہو گی!''

''اپنا گھر! کس گھر کی بات کر رہے ہیں۔ میرا اپنا گھر تو یہی ہے اور میں یہاں سے کیوں جانے لگی بھلا!''

''کیا واقعی ایسا ہے؟''

''کیوں آپ کو کوئی شک ہے؟''

''نہیں تو، بس میں کچھ گھبراتا رہتا ہوں۔ پتا نہیں کب تمہارا موڈ خراب ہو اور تم....'' عمران نے ڈرتے ڈرتے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اب میرا موڈ کبھی خراب نہیں ہو گا''

''سچ''

''مچ''

''اچھا تو میں یہ خوشخبری ابا جی کو سنا دوں۔''

''میں انھیں پہلے ہی سنا چکی ہوں۔''

''تو کیا کہا انھوں نے؟'' عمران حیرت سے بولا۔

''بس یہی کہ صبح کا بھولا گھر لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔''

عمران نے مارے خوشی کے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹا تو اسے ایسا لگا جیسے دنیا میں کسی بھی عورت کا گھر اس کے شوہر کی بانہوں کے درمیان ہی ہوتا ہے اور کہیں نہیں...... کہیں بھی تو نہیں......!

☆☆......☆☆

ناولٹ

ابنِ آس محمد

کلائمیکس

"صرف اپنی ماں کا خیال ہے تمہیں۔ یہ جو روز اتنی ماؤں کی گودیں اجڑ جاتی ہیں، ان کا کیا؟ یہ جو روز اتنی عورتیں بیوہ کردی جاتی ہیں اور یہ جو روز اتنے بچے یتیم کردیے جاتے ہیں...... ان کا احساس نہیں ہے تمہیں!" طارق صرف رو رہا تھا۔ "مم...... مگر...... ہمیں......

آج کی تصویر، آج کا آئینہ، ایک سنسنی خیز ناولٹ

سمندر کی لہریں حسب عادت منہ زور اور پرشور تھیں۔ طارق کے دل میں اٹھا طوفان بھی کچھ کم نہیں تھا۔

وہ گڈانی کے ساحل کی سب سے بلند ماربل

کے پتھر کی چوٹی پر پچھلے دو گھنٹے سے اچھلنے والے پانی کی بوندوں کی نمکین اوس میں بھیگ رہا تھا اور اس وقت کو کوس رہا تھا جب وہ اکیلا یہاں آ گیا تھا۔

ایک گھنٹہ پہلے تانیہ نے اس سے فون پر کہا تھا کہ بس پانچ منٹ بعد وہ آفس سے نکل جائے گی اور ایک سے ڈیڑھ گھنٹے میں اس کے پاس ہوگی۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ مگر وہ نہیں پہنچی۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد اس نے بے تابی سے اس کے نمبر پر رنگ کرنا شروع کر دیا۔ آخری تیسری کال ریسیو ہوگئی۔

''یار...... دو گھنٹے ہو گئے مجھے یہاں آئے ہوئے...... یہ کوئی طریقہ ہے؟ کہاں ہو تم......؟'' وہ کسی قدر جھنجلا گیا تھا۔

''سوری یار...... دیر ہوگئی، بس پہنچ رہی ہوں۔ گاڑی پنکچر ہوگئی تھی۔'' تانیہ نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''میں نے کہا بھی تھا میرے ساتھ چلو مگر...... تم نے بات نہیں مانی۔ تمہاری ضد نے خوار کر دیا ہے مجھے۔ سچ بتاؤں، تم سے دل لگا کر میں نے اپنا بیڑہ غرق کر لیا ہے......'' دوسری طرف سے حسب سابق تانیہ کا کھنکتا ہوا قہقہہ سنائی دیا۔

''کس نے کہا تھا دل لگانے کو؟ تم نے آسان سمجھ لیا ہے دل لگانا۔''

وہ پتھروں کے درمیان چلتے ہوئے ایک طرف موجود ٹوٹی ہوئی بنچ پر بیٹھ گیا۔

''اچھا سب باتیں چھوڑو، یہ بتاؤ کتنی دیر لگے گی اب اور کتنا انتظار کرنا پڑے گا؟''

''صرف ایک گھنٹہ اور یہ زیادہ ٹائم نہیں ہے۔''

''کیا!! ایک گھنٹہ......!!'' طارق پریشان ہو کر کھڑا ہو گیا۔

''نہ کرو یار...... اب ایک گھنٹہ میں کیا کروں گا یہاں؟'' اس کی بے زاری اور غصہ اپنے عروج پر تھا۔

''اف......!!'' اس نے دوسری طرف کی بات سن کر ایک طویل سانس لیا۔

''ٹھیک ہے۔ اگر یہ بات ہے تو ایک گھنٹہ تو کیا دو گھنٹے اور صبر کر سکتا ہوں۔''

اس نے فون بند کر دیا اور کسی حد تک بے زاری سے سمندر کی اچھلتی، جھاگ اڑاتی لہروں کو دیکھنے لگا۔

دو گھنٹے پہلے یہ لہریں، پانی، پانی کا اچھال اور بوندوں کی پھوار سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بہت حسین اور رومینٹک منظر معلوم ہو رہا تھا۔ مگر اب سب کچھ زہر لگ رہا تھا۔ اگر تانیہ یہ نہ کہہ دیتی کہ وہ اب پورے دن کے لیے فری ہو کر آ رہی ہے تو شاید اسے اپنی زندگی بھی زہر لگنے لگتی۔

وہ پہاڑ کی منڈیر پر بیٹھ کر چھوٹے چھوٹے کنکر اٹھا کر پانی میں پھینکنے لگا۔

اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو سگریٹ نکال کر دھواں اگلتا رہا۔ مگر دھواں کچھ زیادہ ہی کڑوا ہو چلا تھا۔ اندر تک کڑواہٹ پھیل گئی تھی۔ حلق کی تلخی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

وہ بے زاری سے کھڑا ہو گیا۔ اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو سناٹے کے ماحول میں اِکا دُکا جوڑوں کے علاوہ کوئی اور نظر نہ آیا۔ اور بلندی پر ایک گندا سا، ویران جھونپڑا ہوٹل نظر آیا۔ ہوٹل کیا تھا کھنڈر ہی تھا۔

وہ تانیہ کو برا بھلا کہتے ہوئے اس ہوٹل کی طرف بڑھ گیا۔

☆......☆......☆

اس وقت جب ہماری کہانی کا مرکزی کردار (جسے آپ ہیرو کہہ سکتے ہیں) تانیہ کے انتظار میں شدید ترین بے زاری میں مبتلا ہو کر چائے کے ہوٹل

کی طرف جا رہا تھا۔ عین اسی وقت کراچی سے کوئٹہ جانے والی اس سڑک پر...... جہاں سے گڈانی کے ساحل کو راستا جاتا ہے۔ کوئٹہ سے کراچی کی سمت ایک لڑکا ویران سڑک پر پیدل چلا آ رہا تھا۔

یہ لڑکا اس کہانی کا مرکزی کردار نہیں ہے...... مگر اہم کردار ضرور ہے۔

اس لڑکے کی عمر یہی کوئی سولہ سترہ برس تھی۔ اکہرا بدن، بلیو جینز، شرٹ اور چمڑے کی جیکٹ پہنے اس خوش رو اور زندگی سے بھرپور نوجوان کا نام فرہاد تھا۔

گلابی رنگت، کلین شیو اور آنکھوں پر مہنگی سی تاریک شیشوں کی عینک، پیروں میں جوگرز اور جینز کی پچھلی جیب میں اڑسا ہوا ماؤتھ آرگن، یہ اس کا حلیہ تھا۔

وہ کافی دور سے پیدل چلا آ رہا تھا شاید...... اس کے جوگرز مٹی دھول میں اٹ چکے تھے۔ کسی حد تک تھکن نے بھی چہرے پر ڈیرے ڈال لیے تھے۔

کوئٹہ سے کراچی آنے والی اکا دکا کاروں کو اس نے لفٹ کے لیے اشارے بھی دیے مگر ویران سڑک پر آج کل کون کسی اجنبی کو لفٹ دیتا ہے۔ سو کسی نے گاڑی روکنے کی زحمت گوارا نہ کی مگر فرہاد کے چہرے پر کوئی مایوسی نہیں تھی۔ وہ تو پیدل چلنے کا قصد کر چکا تھا۔ لفٹ مل جاتی تو شاید اسے آسانی ہو جاتی۔ اسی لیے وہ جوں ہی پیچھے سے آتی ہوئی کسی کار کی آواز کو محسوس کرتا تو وہیں ٹھہر جاتا اور انگوٹھے کے اشارے سے لفٹ طلب کرنا شروع کر دیتا۔

گاڑی قریب آتی اور ان کے ساتھ اس کے سامنے سے گزر جاتی اور پھر وہ چلنا شروع کر دیتا۔

شام ابھی ڈھلنا شروع نہیں ہوئی تھی۔ وہ گڈانی سے کافی آگے نکل آیا تھا۔

گڈانی کا موڑ اس سے کوئی تین کلومیٹر یا اس سے کچھ زیادہ پیچھے رہ گیا تھا۔ اس ویرانے میں اکیلے کسی نوجوان کا تن تنہا پیدل چلنا خود اس کی اپنی جان کے لیے بھی خطرے سے خالی نہیں تھا مگر کیا کرتا۔ مجبوری تھی۔

دفعتاً ایک سیاہ رنگ کی کار پیچھے سے دھول اڑاتی ہوئی نظر آئی۔

فرہاد حسب سابق سڑک پر کھڑے ہو کر کراچی کی طرف انگوٹھا لہرانے لگا۔

اتفاق سے کار کی رفتار قدرے دھیمی ہوئی مگر رکتے رکتے بھی اس سے بیس پچیس قدم آگے نکل گئی اور آگے جا کر رک گئی۔

فرہاد نے دیکھ لیا تھا کہ گاڑی میں تین چار لڑکیاں ہی ہیں صرف۔

وہ تیزی سے گاڑی کی طرف بھاگا اور جب گاڑی کے قریب پہنچا تو گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ ذرا آگے جا کر رک گئی۔

فرہاد ایک لمحے کو ٹھٹکا۔ پھر مسکرا کر گاڑی کی طرف بڑھا۔ مگر پھر وہی ہوا۔

وہ گاڑی کے قریب پہنچا تو گاڑی جھٹکا لگا کر مزید آگے چلی گئی۔ فرہاد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

لڑکیاں اس کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ اس سے لطف لے رہی تھیں۔

وہ مسکرا کر پھر گاڑی کی طرف بڑھا۔ مگر پھر وہی ہوا اور تین چار بار ایسا ہوا...... اور آخر کار گاڑی دھول اڑاتی ہوئی زوں کر کے آگے نکل گئی۔ دھول کے ساتھ لڑکیوں کا بلند آہنگ مشترکہ قہقہہ بھی اس کے چہرے تک پہنچا تھا۔

ظاہر ہے...... ہماری کہانی کے اس ثانوی یا یوں کہہ لیں کہ غیر اہم کردار کے پاس سوائے مسکرا کر یا پیچ و تاب کھا کر دوبارہ پیدل آگے بڑھنے کے سوا کوئی

اور چارہ نہیں تھا۔ سو اس نے دوبارہ اپنے تھکے ہوئے قدموں کو زحمت دی اور پیدل چل پڑا۔ ہاں اس مرتبہ اس نے غصہ بھگانے کے لیے جیب سے ماؤتھ آرگن نکال کر بجانا بھی شروع کر دیا تھا۔

ماؤتھ آرگن کی دھن نے اس کا غصہ شاید کچھ کم کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

چائے کا ذائقہ سگریٹ سے بھی زیادہ تلخ تھا۔

طارق نے ایک گھونٹ حلق میں اتارنے کے بعد بدمزہ ہو کر پیالی پتھروں پر ہی انڈیل دی تھی اور گرم 'کولڈ ڈرنک' منگوا کر جیسے تیسے حلق سے اتاری تھی۔ اس کے بعد وہ ایک گھنٹہ مزید انتظار کرتا رہا۔

اگر تانیہ لڑکی نہ ہوتی اور آج پورا دن اس کے ساتھ گزارنے کا نہ کہہ چکی ہوتی تو شاید وہ دس منٹ بھی مزید انتظار نہ کرتا۔

لڑکی کا انتظار کرنے میں مزہ اور لڑکے کا انتظار کرنے میں غصہ آجاتا ہے۔

اور جب ایک گھنٹہ بعد اس نے تانیہ کو فون کیا اور دوسری طرف سے بار بار موبائل بند ہونے کی ریکارڈنگ سنائی دیتی رہی تو اسے غصہ آ گیا۔

وہ وہیں بیٹھا اُسے دل ہی دل میں گالیوں سے نوازتا رہا۔ اندر ہی اندر کھولتا رہا۔

اب اس امید پر بیٹھا تھا کہ شاید وہ قریب ہی کہیں پہنچ چکی ہے اور فون بند کر کے شرارت کر رہی ہے۔ اس سے کھیل رہی ہے۔

جب مزید آدھا گھنٹہ گزر گیا اور فون کرنے پر دوسری طرف سے فون بند ہونے کی ریکارڈنگ سنائی دی تو وہ تلملا کر کھڑا ہو گیا۔ غصے میں اپنا فون پانی کی طرف پھینکنے لگا۔ مگر ہاتھ ہوا میں ہی رک گیا۔

''اس میں فون کا کیا قصور ہے۔'' وہ اپنے آپ سے بولا۔

''یہ سالی عین وقت پر دھوکا دیتی ہے۔''

وہ کچھ دیر یوں ہی کھڑا رہا۔ سمندر کو گھورتا رہا۔ جیسے سارا قصور اسی کا ہو۔ پتھروں کو گھورتا رہا۔ شاید ان کی بھی کچھ غلطی تھی۔ پھر مایوس ہو گیا تو پہاڑی سے اتر کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا جو نیچے ایک طرف ریت میں کھڑی تھی۔

گاڑی میں بیٹھ کر بھی امید تھی کہ شاید وہ اب فون اٹھا لے گی۔

گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے ایک بار...... دو بار...... تین چار بار اس نے تانیہ کا نمبر ملایا مگر ہر بار یہی جواب آیا کہ آپ کا مطلوبہ نمبر فی الحال بند ہے۔

اب تو حد ہو گئی تھی۔

اس نے اگنیشن میں چابی لگا کر گھمائی تو کار کا انجن بھی یوں غرایا جیسے تانیہ کے نہ آنے پر جھنجلا رہا ہو۔ کار اسٹارٹ کر کے ریورس کرتے ہوئے اس نے ایک کیسٹ کارٹیپ میں لگا دی۔ مگر ریکارڈنگ شروع نہیں ہوئی۔

ذرا فاصلے پر جا کر اسے اندازہ ہوا کہ کارٹیپ آن نہیں ہوا۔

اس نے کیسٹ نکالنے کی کوشش کی تو جھنجلا کر رہ گیا۔ کیسٹ الٹی لگا دی تھی اس نے بے دھیانی میں اور اب وہ پھنس گئی تھی۔

اس نے گاڑی روک دی۔ کیسٹ نکالنے کی بہت کوشش کی مگر بے سود۔

جھنجلا کر کار آگے بڑھاتے ہوئے ایف ایم کا بٹن پش کر دیا۔ مگر آج شاید نحوست پورے عروج پر تھی۔ ریڈیو میں سے گھوں گھوں کی آواز کے سوا کوئی آواز نہ نکلی۔ ایف ایم کے کسی چینل کے سگنل نہیں آرہے تھے۔

اس نے تانیہ کے ساتھ ساتھ کارٹیپ اور ریڈیو کو

بھی ایک گالی دے کر ریڈیو بھی بند کر دیا۔
اتنی دیر میں وہ گڈانی کی ذیلی سڑک سے، کوئٹہ تا کراچی کی مرکزی سڑک پر آ گیا تھا۔
کچھ دیر میں اس کی کار ویران سڑک پر اس کے غصے سے بھی زیادہ تیز رفتار سے دوڑی چلی جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

ہماری کہانی کا ثانوی کردار فرہاد۔ جو کافی دیر سے پیدل چل رہا تھا اب چلتے چلتے تھک گیا تھا۔
اس کے جوگرز سے زیادہ دھول اس کے چہرے پر جم چکی تھی۔
شدید بھوک سے مجبور ہو کر اس نے ویرانے میں کھڑے ایک بھٹے والے سے بھٹا خرید کر کھانا شروع کر دیا تھا اور سڑک کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ کر ماؤتھ آرگن بجا رہا تھا۔
اسے کسی نے لفٹ نہیں دی تھی۔
جوں ہی کوئی کار دکھائی دیتی، وہ ایک دم سے کھڑا ہو جاتا اور لفٹ کے لیے پوری شدت سے ہاتھ ہلانا شروع کر دیتا اور جب گاڑی گزر جاتی تو مایوس ہو کر بیٹھ جاتا۔
کچھ دیر ستانے کے بعد اس نے ایک بار پھر دھیرے دھیرے چلنا شروع کر دیا۔
اب تو سورج بھی تھک گیا تھا اور آہستہ آہستہ سمندر کی سمت میں کہیں ٹھہرنے کو مچل رہا تھا۔
ایسے میں ہماری کہانی کے ہیرو...... طارق کی کار آتی نظر آئی۔
فرہاد نے بے دلی سے کار کو لفٹ کا اشارہ دیا۔
مگر کار رکی نہیں۔
ایسا نہیں تھا کہ طارق نے اسے دیکھا نہیں تھا۔
وہ اس وقت اتنی شدید ذہنی کوفت میں تھا کہ آگے نکلتا چلا گیا مگر آگے چل کر اس کے ذہن میں ایک بات آ گئی۔
''بٹھا لے یار...... راستا ہی کٹ جائے گا باتیں کرتے ہوئے۔'' اس نے کار روک دی۔
کار فرہاد سے بہت آگے جا کر رکی تھی۔ فرہاد کو تسلی امید نہیں تھی کہ کار اس کے لیے رکی ہے۔ یا ممکن ہے اس نے سوچا ہو کہ یہ کار والا بھی ان لڑکیوں کی طرح اس سے تفریح لے رہا ہے۔ سو وہ کار کی طرف دوڑا نہیں۔ دھیرے دھیرے چلتا رہا۔
پھر طارق ہی کار کو ریورس میں لے کر اس کے قریب آ گیا۔
بٹن پش کر کے اس نے کار کا شیشہ نیچے کیا۔
اتنی دیر میں فرہاد شیشے کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔
''کہاں جاؤ گے؟'' سوال مختصر تھا۔
''ادھر......'' فرہاد نے کراچی کی طرف اشارہ کر دیا۔ ''اس طرف!''
''اس طرف کدھر؟''
''جس طرف آپ جا رہے ہو!''
''میں کدھر جا رہا ہوں؟'' طارق نے مسکرا کر پوچھا۔
''ادھر...... اس طرف...... کراچی......!'' فرہاد کی سانس اب اعتدال پر آ چکی تھی۔
''یہاں ویران سڑک پر کیا کر رہے ہو؟'' طارق نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا تو وہ گاڑی کی طرف اور جھک گیا۔
''بہت دور سے پیدل آ رہا ہوں بٹھا لو، سب بتا دوں گا راستے میں بہت لمبی کہانی ہے۔'' طارق نے ایک لمحہ سوچا۔
''کراچی میں رہتے ہو......؟''
فرہاد نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔
''نام کیا ہے تمہارا؟''
''فرہاد...... فرہاد محی الدین......!'' اس نے مختصر

جواب دیا۔

''اچھا ٹھیک ہے......بیٹھو''

یوں ہماری کہانی کا یہ ثانوی کردار، ہماری کہانی کے مرکزی کردار یعنی ہیرو کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اسے لفٹ مل گئی تھی۔

''Thank you''! فرہاد نے بیٹھتے ہی مہذب لہجے میں شکریہ ادا کرنا مناسب سمجھا۔

''Well Come'' ہمارا ہیرو بھی کم مہذب نہیں تھا۔ تانیہ کو تو وہ غصے میں گالیاں دے رہا تھا۔ اور پھر اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ گاڑی کا رخ ظاہر ہے کراچی ہی کی طرف تھا۔ کوئٹہ یا بلوچستان کی طرف سے کراچی کی سمت جانے والی دوسری بہت سی گاڑیوں کی طرح۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کار میں ایک ہماری کہانی کا ہیرو تھا اور دوسرا ثانوی کردار......

اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ عام طور پر کہانیوں میں ثانوی کرداروں کی اپنی کہانی بیان نہیں کی جاتی ہے۔

☆......☆......☆

لگ بھگ پانچ سات منٹ کی خاموشی کے بعد طارق کو خاموشی کھلنے لگی۔

''تم نے بتایا نہیں۔ یہاں کیا کر رہے تھے ویران سڑک پر؟''

''آؤٹنگ پر آیا تھا...... چل آؤٹ کرنے۔'' فرہاد نے بے زاری سے کہا۔ ''اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ''

''پھر؟؟''

''پھر کچھ نہیں۔'' فرہاد کے لہجے میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔

بس ہٹ گئی اُس کی۔ ناراض ہو گئی۔ گاڑی اس کی تھی۔۔ مجھے وہیں چھوڑ کر چلی گئی۔''

طارق کی ہنسی نکل گئی۔ فرہاد پہلے تو جھینپ گیا۔ پھر وہ بھی ہنس پڑا۔

کچھ دیر تک دونوں ہنستے رہے۔

''آپ یہاں، کہاں سے آرہے تھے؟ فرہاد نے کچھ دیر بعد جب ہنسی تھمی تو پوچھا۔'' کوئٹہ سے؟

''نہیں یار۔'' طارق نے جواب دیا۔

''میری کہانی تم سے مختلف نہیں ہے، بس تھوڑا سا فرق ہے۔ تم تو اُس سے مل لیے، مجھے ملنے کا موقع بھی نہیں ملا۔''

فرہاد نے اس کی طرف حیرانی سے دیکھا۔

''مطلب!!

''کس کا مطلب!!

''میں سمجھا نہیں۔'' فرہاد نے کہا۔

''یار بس کیا بتاؤں۔'' طارق نے ایک طویل سانس لی۔

''تانیہ نام ہے اُس کا ایک ٹی وی چینل پر کام کرتی ہے۔ آج ملنے کا پروگرام تھا۔ مگر آئی نہیں...... خوار کرا دیا۔'' اب فرہاد نے مزید حیرانی سے کہا۔

''عجیب بات ہے۔ ملنے کا پروگرام تھا تو ساتھ آنا چاہیے تھا نا!''

''میں نے تو یہی کہا تھا...... یہی پروگرام تھا۔ مگر کہنے لگی تم اپنی گاڑی میں جاؤ۔ میں اپنی گاڑی میں آؤں گی۔ تین گھنٹے انتظار کرایا۔''

''پھر!!''

''پھر کیا۔ فون بند کر دیا۔ آئی نہیں۔'' اس مرتبہ فرہاد ہنسا۔ طارق نے محض مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''بڑی ہوشیار اور تیز ہو گئی ہیں آج کل کی لڑکیاں۔'' فرہاد نے کہا۔

اب کی بار طارق ہنسا۔ اور فرہاد تو ہنس ہی رہا تھا۔

''چائے پیو گے؟'' طارق نے اچانک پوچھا۔

"ہے کیا گاڑی میں؟"

"نہیں۔ وہ، جھونپڑا ہوٹل ہے نا!" فرہاد نے ونڈ اسکرین کے دوسری طرف دیکھا۔

سڑک کے کنارے آگے ایک جھونپڑا ہوٹل قریب آ رہا تھا اور اب اندھیرا کسی حد تک پھیل چکا تھا۔

گاڑی جب ہوٹل کے قریب رکی تو اس وقت تک اندھیرا پھیل ہی چکا تھا۔

"اترو!"

"گاڑی میں ہی پی لیتے ہیں۔" فرہاد نے سستی اور کاہلی سے کہا۔

"باہر بیٹھتے ہیں ذرا کھلی ہوا میں۔" طارق نے گاڑی لاک کرتے ہوئے کہا۔ "واش روم بھی جانا ہے مجھے۔"

یوں ہماری کہانی کا مرکزی اور غیر مرکزی کردار اس جھونپڑا ہوٹل میں چائے پینے کو اتر گئے۔

☆......☆......☆

جتنی دیر میں طارق واش روم سے فارغ ہو کر آیا۔ اتنی دیر میں چائے آ چکی تھی۔

فرہاد چار پائی پر اکیلا بیٹھا تھا۔ طارق اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا اور چائے کی چسکی لے کر بولا۔

"جھونپڑا ہوٹلوں کی چائے بڑی مزے دار ہوتی ہے۔"

"ہاں...... کھانا بھی بہت مزے کا ہوتا ہے۔" فرہاد نے جواب دیا۔

"کرتے کیا ہو ویسے تم!" دو چار گھونٹ معدے میں اترے تو طارق نے پوچھا۔

"پڑھتا ہوں۔" فرہاد نے مختصر کہا۔ پھر جیسے خیال آیا۔ "اور...... لکھتا بھی ہوں۔"

"اچھا...... لکھتے بھی ہو......؟ طارق نے دلچسپی ظاہر کی۔ "کیا لکھتے ہو......؟"

"مضامین لکھتا ہوں......، اخباروں میں......!"

"انٹرسٹنگ......! کیا لکھتے ہو، اپنے مضامین میں؟"

"کچھ خاص نہیں۔ آج کل تو...... ملکی حالات پہ لکھتا ہوں اور......"

"سیاست پر۔" طارق نے بات کاٹ کر پوچھا۔

"نہیں نہیں......!" فرہاد نے تیزی سے کہا۔ "سیاست نہیں۔ شریف انسانوں کا کام تھوڑی ہے سیاست۔" طارق کی ہنسی چھوٹ گئی۔ اس کے بے ساختہ پن پر چائے کا پھندا لگتے لگتے رہ گیا۔ فرہاد بھی مسکرا اٹھا۔

"اصل میں ملک کے جو حالات ہیں نا۔" فرہاد نے کہنا شروع کیا۔ "فرقہ واریت ہے، ہنگامے، اور بم دھماکے، ان کے خلاف لکھتا ہوں۔ یہ جو نام نہاد جہاد ہے، فساد فی سبیل اللہ، جس نے برباد کر کے رکھ دیا ہے ہمارے پورے ملک کو۔ بدنام کر دیا ہے پوری دنیا میں اسلام کو، ہمارے ملک کو، اس کے خلاف اپنے قلم سے جہاد کرتا ہوں۔"

طارق کی چائے ختم ہو گئی تھی۔ معدے کو سکون مل گیا تھا۔ مگر فرہاد کی باتوں پر آگ ہی تو لگ گئی اس کے تن بدن میں۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" اس کے لہجے میں طنز تھا۔

"مگر ملک اور اسلام کو، مجاہدین نے برباد اور بدنام نہیں کیا ہے۔ یہ تو سب سیاست دانوں کا کیا دھرا ہے۔ اپنا الو سیدھا کرنے میں لگے ہیں سب۔ یہ لوگ بدنام کر رہے ہیں ملک کو، جمہوریت...... جمہوریت...... جمہوریت...... بیڑہ غرق کر کے رکھ دیا ہے قوم کا۔ اب لوگوں کے پاس کوئی راستا ہی نہیں ہے، ہاں خودکشی کر لیں یا خودکش بن جائیں...... اور

کیا کریں......؟"

فرہاد نے اس کی باتیں سن کر چند لمحوں کی خاموشی اختیار کرلی۔

وہ کہانی کا ہیرو نہیں تھا۔ ثانوی کردار تھا۔

"کیوں! کیا کہتے ہو؟" طارق نے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"یہ آپ کا خیال ہے میرا نہیں۔" فرہاد کا لہجہ خشک ہوگیا۔

"میں کسی اور طرح سوچتا ہوں اور اس موضوع پر مزید بات بھی نہیں کرنا چاہتا۔"

"کیوں......؟

"بحث کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا، سامنے والا برا مان جاتا ہے۔" فرہاد نے سنجیدگی سے کہا۔ "ممکن ہے میرے خیالات سن کر آپ مجھے یہیں چھوڑ جاؤ، غصے میں آجاؤ۔" طارق کی ہنسی چھوٹ گئی۔ فرہاد نے جلدی سے اپنی چائے کے آخری گھونٹ معدے میں اتار لیے۔

☆......☆......☆

گاڑی دھیمی رفتار سے چل رہی تھی۔

فرہاد نے ہوٹل سے روانہ ہونے کے بعد سے چپ سادھ لی تھی۔ مگر طارق بحث کے موڈ میں تھا۔ بات کرنا چاہ رہا تھا۔

"تم کچھ بھی کہو دوست، کچھ بھی خیالات ہوں تمہارے، میں تو اتنی بات جانتا ہوں کہ کوئی بھی انسان اپنی جان کی بازی خوامخواہ نہیں لگا دیتا۔ تم دے سکتے ہو کیا اپنی جان، اپنے نظریات کے لیے!"

فرہاد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ طارق کی مسکراتی ہوئی نظریں اس کے تاثرات دیکھ رہی تھیں۔

"میں حرام موت مرنا پسند نہیں کرتا۔" فرہاد نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔

طارق کو ایک دم غصہ آگیا۔

"تم جہاد کو حرام موت کہہ رہے ہو۔"

"ہاں! یہ جو جہاد کے نام پر اس ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے، یہ حرام موت ہے۔"

"بکواس مت کرو۔" طارق کو سچ مچ غصہ آگیا تھا۔ "یہ جو مجاہدین ہیں، یہ جو خدا کی راہ میں اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں، یہ حرام موت مر رہے ہیں کیا؟"

"میں نے کہا نا، میں بحث نہیں کرنا چاہتا۔"

فرہاد کا لہجہ بےزاری ظاہر کر رہا تھا۔ "میں قائل نہیں کرسکتا آپ کو۔ بحث کروں گا تو آپ گاڑی سے اتار دو گے۔" طارق کی پھر ہنسی نکل گئی۔ کچھ دیر تک ہنستا ہی رہا وہ۔ فرہاد اس مرتبہ مسکرایا نہیں تھا۔

"نہیں اتاروں گا یار۔ بات تو کرو کم از کم۔ تم تو بالکل چپ ہوگئے!"

"میں اس موضوع پر بات ہی نہیں کرنا چاہتا۔"

فرہاد نے شدید بےزاری ظاہر کی۔

"یار! میں نے تمہیں اپنی گاڑی میں بٹھایا ہی اس لیے ہے کہ اتنا لمبا راستا باتیں کرتے ہوئے گزر جائے گا۔"

"میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ نے میری مدد کی ہے۔"

"ایک ہی بات ہے۔" طارق نے جواب دیا۔

"ہم دوسروں کی مدد اپنی خوشی کے لیے کرتے ہیں، اگر ہمیں خوشی نہ ملے تو ہم مدد بھی نہیں کرتے۔"

اس بات پر فرہاد بالکل خاموش ہوگیا۔

طارق نے گاڑی کی رفتار ذرا اور تیز کردی۔

کھڑکیوں کے شیشے کھلے ہوئے تھے اور تیز ٹھنڈی ہوا انہیں اپنے چہروں سے ٹکراتی محسوس ہو رہی تھی۔

اس کے بعد کافی دیر تک گاڑی میں خاموشی

رہی۔
طارق اس خاموشی سے اکتا گیا۔
ایک سگریٹ پھونکنے کے بعد ایک بار پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔
''تو تم لکھتے ہو پھر بھی اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی!''
فرہاد نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا۔
''کون سی بات......!''
''یہی کہ ہماری ساری بربادی کے پیچھے امریکا ہے۔''
فرہاد نے شاید خاموش رہنے میں عافیت جانی۔
مگر طارق چپ ہونے والا نہیں تھا۔
''اب دیکھونا، نہ امریکا عراق اور پھر افغانستان میں گھستا، نہ عراق پر قبضہ کرتا۔ نہ افغانستان میں یہ حالات ہوتے۔ اور اگر وہ پاکستان میں ڈرون حملے شروع نہ کرتا تو۔''
اس نے بات ادھوری چھوڑ کر فرہاد کی طرف دیکھا۔
''تو......تو کیا؟''
''تو یہی کہ سب کچھ امریکی پالیسیوں کا ردعمل ہے۔'' طارق نے کاندھے اچکا کر کہا۔
''امریکا اصل میں عراق، افغانستان یا پاکستان کو نہیں...... صرف اور صرف مسلمانوں کو کچلنا چاہتا ہے...... نیست و نابود کردینا چاہتا ہے مسلمانوں کو...... پوری دنیا میں چن چن کر مسلمانوں کو مارا جارہا ہے۔''
فرہاد نے مکمل خاموشی اختیار کرلی تھی۔ طارق کا بیان جاری تھا۔
''اب دیکھونا...... مسلمان اتنے طاقت ور تو ہیں نہیں کہ امریکی طیاروں سے لڑسکیں، اس کے میزائلوں کا سامنا کرسکیں۔''

''تو پھر...... کیا مطلب ہے اس کا......'' فرہاد نے ایک دم تلخ لہجے میں کہا۔ ''اپنے ہی ملک میں بم پھاڑنا شروع کرادیں۔ خودکش حملے کر کے لوگوں کے چیتھڑے اڑادیں۔ یہ کون سا اسلام ہے؟ یہ کیسا اسلام ہے؟ کیسا جہاد ہے؟''

''ہوتا ہے، ایسا ہی ہوتا ہے۔'' طارق نے پر جوش لہجے میں کہنا شروع کیا۔

''جب ہم حالتِ جنگ میں ہوتے ہیں تو کبھی کبھی دشمن کو نقصان پہنچانے کے لیے ایسی کارروائیاں بھی کرنی پڑتی ہیں مگر تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گے۔''

''ہاں! بالکل نہیں سمجھوں گا۔'' فرہاد کا لہجہ زہریلا ہوگیا۔ ''کیوں کہ میں ایسی کارروائیوں کو حرام سمجھتا ہوں۔ یہ سب لوگ جو جہاد کے نام پر خودکش دھماکے کرتے ہیں۔ یہ سب دراصل خودکشی کرتے ہیں۔ خودکشی حرام ہے۔ یہ سب حرام موت مرتے ہیں اور جہنم کا ایندھن بنتے ہیں۔'' طارق کو ایک بار پھر غصہ آگیا۔ اس نے گھور کر فرہاد کو دیکھا۔

''شرم آنی چاہیے تمہیں فرہاد! ایک شخص پوری قوم کے لیے، اسلام کے لیے، اللہ کے لیے اپنی جان دے دیتا ہے اور تم اسے حرام موت کہہ رہے ہو۔ شرم آنی چاہیے تمہیں!''

''میں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔'' فرہاد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اور حرام موت مرنے والے ان کافروں کو......

طارق نے پوری قوت سے کار کو بریک لگا دیے۔ کار ایک جھٹکے سے رک گئی۔

فرہاد کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

''کک...... کک...... کیا ہوا......؟ فرہاد نے گھبرا کر پوچھا۔

''اترو نیچے......'' طارق کا پارہ چڑھ چکا تھا۔

''میں کہتا ہوں اترو نیچے...... ابھی اور اسی وقت......!''

''پپ...... پپ...... پر ہوا کیا ہے......؟''

فرہاد کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

''ہوا کیا ہے......!!'' طارق نے غرا کر کہا۔

''تم جیسے غداروں کی وجہ سے ہم سب...... پوری قوم آج تک امریکا کی غلام ہے۔ خود تو کچھ کر نہیں سکتے اور جو اپنی جانوں کا نذرانہ دے رہے ہیں، اپنی زندگیاں قربان کررہے ہیں، انہیں کافر کہتے ہو، اترو نیچے!'' فرہاد خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''میں کہتا ہوں اترو نیچے!'' طارق چلایا۔

''Sorry'' فرہاد نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ بحث نہ کریں اس موضوع پر۔ آپ سے برداشت نہیں ہوگا اور آپ مجھے اتار دو گے۔''

طارق اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس کے لہجے میں ایسی معصومیت تھی کہ بے اختیار ہنسنے لگا۔

''سوری یار!'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ذرا جذباتی ہوگیا تھا۔ جذباتی قوم ہیں نا ہم، اس لیے۔'' کہتے ہوئے اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کچھ دیر تک گاڑی میں خاموشی رہی۔

پھر فرہاد نے خاموشی کا قفل توڑا۔

''لگتا نہیں ہے ویسے کہ آپ آپ اندر سے اتنے پکے مسلمان ہوگے!''

''کیوں؟ لگتا کیوں نہیں ہے۔'' طارق نے اب خود پر قابو پالیا تھا۔ لہجہ نارمل ہوگیا تھا۔

''جو شخص...... کسی اجنبی لڑکی سے ڈیٹ مارنے کے لیے اتنی دور گیا ہو......، یہ اسٹائل ...... یہ زندگی......'' طارق نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ارے یار...... یہ سب تو دنیاوی معاملات

ہیں۔ دنیاوی دھندے ہیں۔ اصل میں تو اندر سے مسلمان ہونا ضروری ہے۔ ٹھیک ہے۔ نماز نہیں پڑھتے، روزے نہیں رکھتے، جہاد نہیں کرتے لیکن اندر سے تو پکے مسلمان ہیں نا۔''

فرہاد نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جیسے بات سمجھ میں آ گئی ہو۔

''ہوں...... اندر سے ہی مسلمان ہونا چاہیے!''

اس کے بعد پھر کچھ لمحوں کے لیے گاڑی میں خاموشی چھا گئی۔ دونوں ہی خاموش ہو گئے تھے۔

''کوئی کیسٹ نہیں ہے گانوں کی۔'' اچانک فرہاد نے پوچھا۔

''کیسٹ!!'' طارق نے چونک کر دیکھا۔

''ہیں تو یار...... بس، الٹی کیسٹ لگا دی ہے پلیئر میں، پھنس گئی ہے......!''

''تو ایف ایم لگا دو۔'' فرہاد نے کہا۔ ''ایف ایم پہ بھی بہت اچھے گانے آتے ہیں۔''

''ریڈیو بھی نہیں چل رہا۔ شاید کوئی گڑ بڑ ہو گئی ہے۔''

ایک بار پھر کچھ لمحوں کے لیے خاموشی ہو گئی۔

''میں گانا سناؤں۔'' فرہاد نے ایک دم کہا۔

وہ کوئی بھی بات ایک دم کرتا تھا۔ خاص طور پر خاموشی کے لمحے جب طویل ہو جاتے تھے تب۔

''نہیں...... '' طارق نے فوراً کہا۔ ''تم نہیں بلکہ میں گاتا ہوں......''

''آپ......!!'' فرہاد نے حیرت سے کہا۔

''آواز تو اچھی ہے نا......؟'' طارق ہنس پڑا۔

''ہاں! آواز اچھی ہے۔'' اس نے جگجیت کی ایک غزل گانا شروع کر دی۔ آواز تو اتنی اچھی نہیں تھی۔ مگر غزل اچھی تھی۔

فرہاد خاموشی سے سن رہا تھا۔ اور طارق پُر جوش انداز میں گا رہا تھا۔

گاڑی کی خاموشی میں سر چھڑ گئے تھے۔

دور سڑک کے کنارے بائیں ہاتھ پر ایک سی این جی پمپ نظر آ رہا تھا۔

طارق نے قریب پہنچ کر گاڑی سی این جی پمپ کے احاطے میں داخل کر دی۔

''کیا ہوا؟'' فرہاد نے پوچھا۔

''سی این جی ختم ہو گئی۔'' طارق نے مختصر جواب دیا۔

''پیٹرول بھی نہیں ہے۔؟''

''پٹرول تو ہے۔'' طارق نے جواب دیا۔ ''پٹرول کی ٹنکی ہمیشہ فل رکھتا ہوں۔ ایمرجنسی میں پرابلم نہیں ہوتی۔'' پھر فلنگ اسٹیشن پر کھڑے ملازم سے کہا۔ ''فل کر دو۔''

سی این جی کا پائپ ٹینک میں گیس بھرنے لگا۔ جتنی دیر گیس بھرتی رہی۔ گاڑی میں خاموشی ہی رہی۔

طارق اس دوران کیسٹ پلیئر میں پھنسی کیسٹ نکالنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر بے سود۔ ایسی ہی پچھلی کوشش کی وجہ سے شاید ریڈیو میں بھی کچھ گڑ بڑ ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

سڑک پر آنے کے بعد ایک بار پھر طارق کوئی غزل گانے لگا۔

''آواز تو واقعی بہت اچھی ہے آپ کی۔'' فرہاد نے اس مرتبہ جھوٹی تعریف کر دی۔

''مذاق تو نہیں کر رہے؟'' طارق کو یقین نہیں آیا۔

''نہیں...... نہیں...... سچ کہہ رہا ہوں''

''یہ کیا ہے...... ماؤتھ آرگن ......؟'' طارق کو اس کے ہاتھ میں موجود ماؤتھ آرگن اب نظر آیا تھا۔

فرہاد نے جواب دینے کی بجائے اثبات میں

سر ہلایا۔

''بجاؤ...... آتا ہے......؟''

ایک بار پھر اثبات میں سر ہلانے کے بعد فرہاد نے ماؤتھ آرگن منہ سے لگا لیا اور نہایت عمدہ دھن بجانے لگا۔

طارق کو مزہ آ گیا۔ دھن بہت عمدہ تھی۔

''اس کا مطلب ہے گاتے بھی ہو گے!''

''ہاں!'' فرہاد نے مختصراً جواب دیا۔

''تو گاؤ نا کچھ......'' طارق نے اصرار کیا۔

اور فرہاد نے کمار سانو کا ایک مشہور گیت گانا شروع کر دیا۔

طارق کو واقعی مزہ آ گیا۔ فرہاد کی آواز میں سروں کا رچاؤ پوری طرح موجود تھا۔

اب اسے اندر سے شرم آ رہی تھی کہ وہ اتنی دیر سے اپنی بھونڈی آواز میں اس سریلے نوجوان کو غزلیں سنا رہا تھا۔

''تمہاری آواز تو واقعی بہت اچھی ہے۔ سنگر بھی ہو کیا؟''

''نہیں، سنگر نہیں ہوں۔ اصل میں بچپن میں نعتیں پڑھتا تھا اسکول میں، آواز اچھی ہو گئی۔''

''گڈ!'' طارق نے ستائشی انداز میں کہا۔

''یہ لکھنا وکھنا چھوڑ دیار اور گانا شروع کر دو۔ میں دعوے سے کہتا ہوں اس ملک کے نامور گلوکار بن جاؤ گے تم۔''

''نہیں طارق صاحب۔'' فرہاد نے انکار میں سر ہلا دیا۔ ''سنگر نہیں بننا چاہتا ہے۔''

''کیوں؟''

''بس، جو کرنا ہے، جو کرتا ہوں، وہی اچھا لگتا ہے۔'' طارق نے کاندھے اچکا دیے۔

''تمہاری مرضی۔ میں نے تو ایک اچھا مشورہ دیا تھا۔ لو بھئی شیر شاہ آ گیا۔ کہاں اترو گے تم؟''

''آپ کہاں جائیں گے؟'' فرہاد نے الٹا پوچھ لیا۔

''میری چھوڑو، میں آگے جاؤں گا، اپنی بتاؤ، کہاں جاؤ گے تم۔ کہاں اتاروں؟''

''کہیں نہیں۔'' فرہاد نے مختصراً جواب دیا۔

طارق نے چونک کر حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

''کہیں نہیں......!! مطلب......؟؟''

''کہیں نہیں کا مطلب...... کہیں نہیں۔'' فرہاد نے آہستگی سے کہا۔

''یار کہیں تو اترنا ہو گا نا تمہیں۔ گھر کہاں ہے تمہارا؟''

''گھر!'' فرہاد نے ایک طویل سانس لی۔ ''دنیا میں کوئی گھر نہیں ہے میرا۔''

طارق کی حیرت دو چند ہو گئی۔ حیرانی سے گاڑی روکنے کے لیے بریک پر دباؤ ڈالا۔

''نہ...... نہ...... گاڑی مت روکنا۔'' فرہاد نے ایک دم بلند آواز میں کہا۔

''کیوں؟''

''بم پھٹ جائے گا۔'' فرہاد نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ طارق کی آنکھیں پھیل گئیں۔

گھبرا کر فرہاد کی طرف دیکھا۔ فرہاد مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ سے طارق کی آنکھوں میں ایک دم خوف لہرانے لگا۔

فرہاد نے اپنی جیکٹ کی زپ نیچے کی اور طارق کی گاڑی لہرا گئی۔

فرہاد نے جیکٹ کے اندر خودکش جیکٹ پہن رکھی تھی۔

ایک بم اس کے سینے پر دھڑک رہا تھا۔

طارق کا دل گویا دھڑکنا بھول گیا۔

☆......☆......☆

اجلے حروف

''اسلامی نظام حیات ایک جامع اور حکیمانہ نظام ہے۔ قرآن کریم ہی اس بات کا انکشاف کررہا ہے کہ آج مسلمانوں کیوں رسوا اور ذلیل ہیں؟ اس کا سبب اللہ کی نافرمانی اور ظلم ہے۔ جو ہمیں انتہائی سخت سزا کا حق دار ٹھہراتی ہے۔ اسلام ہمارا مذہب ہے جو انتہائی متوازن مذہب ہے۔ اسلامی معاشرے میں عدل و انصاف کا نظام، انسان اور انسانیت کی قدر، ظالم کی سزا اور مظلوم کی دادرسی، بچوں سے شفقت اور بزرگوں کی عزت، عورتوں کا مقام، قانون کی بالادستی اور سب سے بڑھ کر اپنے پیدا کرنے والے کے وجود کا یقین۔ اللہ کو مالک کائنات ماننا لازمی جزو ہے۔ اس میں کسی شے کی کمی نہیں، کسی سے زیادتی نہیں کی گئی۔ اسلامی قانون کے مطابق نکاح، طلاق، خلع، وراثت میں حق یہ وہ معاملات ہیں، جنہیں بار بار ڈراموں میں دکھایا گیا جو لوگ نہیں جانتے تھے انہیں بھی بہت ساری باتیں سمجھ آئیں۔''

منزہ سہام کے کالمز پر مشتمل کتاب اجلے حروف سے شاہانہ خان۔ کراچی کا اقتباس۔

اب گاڑی مٹی جیٹی کے پل کے اوپر موجود مائی کولاچی کے پل کے اوپر تھی۔

طارق کے دائیں ہاتھ گودی پر موجود بڑی بڑی کرینوں کی روشنیاں اندھیرے کو نگلنے کی کوشش کررہی تھیں۔

پہلے ہمیشہ ادھر سے گزرتے وقت طارق ان روشنیوں کو دیکھتا تھا۔ یہ روشنیاں اسے بہت اچھی لگتی تھیں۔ مگر اس وقت اس کا ذہن تاریکی میں ڈوب رہا تھا اور اس تاریکی میں فرہاد کی آواز گونج رہی تھی۔

''تم بہت خوش قسمت ہو طارق صاحب...... خدا نے اس نیک کام کے لیے تمہارا انتخاب کیا ہے۔''

طارق کو اس کا ایک ایک لفظ بم کی ٹک ٹک کی طرح سنائی دے رہا تھا۔

''تمہیں پتا ہے، میں ایک گھنٹے سے اس سڑک پر پیدل چل رہا تھا۔ کسی نے مجھے گاڑی میں نہیں بٹھایا کیوں کہ ان میں سے کسی بھی گاڑی میں ایسا مسلمان نہیں تھا جو اندر سے مسلمان ہو۔ کسی نے میری مدد کے لیے گاڑی نہیں روکی۔ پتا ہے کیوں؟''

جواب میں خاموشی۔ طارق کی زبان بند ہوگئی تھی۔

اندر کا مسلمان اندر ہی اندر کانپ رہا تھا۔

گاڑی پل سے اتر کر ڈیفنس جانے والی سڑک پر آگئی تھی۔

ہماری یہ کہانی اس وقت کی ہے جب اس موڑ پر امریکن ایمبیسی منتقل نہیں ہوئی تھی۔

جب خاموشی کا وقفہ طویل ہوگیا تو فرہاد نے ایک بار پھر کہنا شروع کیا اور کہتا چلا گیا۔

''طارق صاحب! تم شاید دل میں سوچ رہے ہوگے...... کہ ان لوگوں نے گاڑی اس لیے نہیں روکی کہ ابھی ان کی موت نہیں آئی ہوگی، واقعی ایسا ہی تھا۔ ان کی موت کا وقت نہیں آیا تھا ابھی۔ جانتے ہو

کیوں؟ صرف اس لیے کہ قدرت اس اہم کام کے لیے ایک ایسے انسان کا انتخاب کر چکی تھی جو اندر سے مسلمان تھا۔ اس مقدس کام کے لیے تمہارا انتخاب ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ تم واقعی اللہ کو بہت محبوب ہو۔ جنت، حسین جنت...... جہاں زندگی ہمیشہ کے لیے ہے۔ تم جیسے مسلمانوں کا حق ہے اور آج ہم دونوں خوش قسمت انسان ایک ساتھ جنت میں جائیں گے۔ ایک ساتھ قدم سے قدم ملا کر جنت کے باغوں میں قدم رکھیں گے اور وہ انعام...... جس کا اللہ نے ہم مسلمانوں سے وعدہ کیا ہے، آج وہ انعام ہمارے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔"

طارق خاموش تھا۔

"تم بہت خوش قسمت انسان ہو طارق بھائی۔ میں نے تو اس وقت کے لیے چار سال...... پورے چار سال محنت کی ہے۔ جنت کی جستجو میں چار سال محنت کی ہے اور تم...... تم تو ایک لمحے میں منتخب ہو گئے۔ ہاں ہاں...... سیدھے چلو، ہمیں اپنا ٹارگٹ تلاش کرنا ہے۔" گاڑی بوٹ بیسن کو عبور کر چکی تھی۔

بغیر اِدھر اُدھر مڑے سیدھی جا رہی تھی البتہ فرہاد باتیں کرتے ہوئے تیز نظروں سے اِدھر اُدھر کچھ تلاش کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

رات اپنے پر پھیلا چکی تھی، خلافِ توقع شہر میں سناٹا تھا۔ سڑکیں بالکل ویران تھیں، شاید شہر میں کچھ ہوا تھا دن میں۔

طارق کے ماتھے پر پسینہ تھا اور ہاتھوں میں لرزش پیدا ہو چکی تھی۔ اسٹیئرنگ پر اس کی انگلیاں کپکپا رہی تھیں۔ گاڑی شون چورنگی سے آگے نکل چکی تھی۔

"تم...... تم اتنے چپ کیوں ہو گئے ہو؟" فرہاد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تت...... تت...... تم کرنا کیا چاہتے ہو......؟" بڑی مشکل سے طارق کے منہ سے نکلا۔

"اپنا ٹارگٹ تلاش کرنا ہے ہمیں۔" فرہاد کا لہجہ پرسکون تھا۔

"ٹ...... ٹ...... ٹارگٹ......! ہمیں...... ہمیں نہیں...... تت...... تت...... تمہیں۔"

"ہمیں......!!" فرہاد نے لفظ 'ہمیں' پر زور دیا۔

"ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ ایک ہی راہ کے مسافر ہیں اور ہماری منزل بھی ایک ہے۔"

طارق کی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ وہ فرہاد کی طرف دیکھ سکتا۔

"ہم دونوں...... ہنستے...... مسکراتے...... ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے جنت میں داخل ہوں گے اور حوریں...... حسین حوریں بانہیں پھیلا کر ہمارا استقبال کریں گی۔ تم سیٹ بیلٹ باندھ لو۔" طارق کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

بیلٹ باندھتے وقت اس کے پورے بدن میں کپکپاہٹ پیدا ہو رہی تھی۔

"بس...... ٹارگٹ نظر آ جائے اور پھر......" فرہاد نے شاید قصداً فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"پپ...... پپ...... پھر......!!" طارق کے الفاظ کانٹوں کی طرح اس کے حلق میں پھنس رہے تھے۔

"بس...... گاڑی ٹکرانا ہے ہمیں۔ تم گاڑی ٹکرانا، میں یہ بٹن دبا دوں گا اور پھر ایک جھٹکے سے ہماری ساری مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ یہ...... تمہیں اتنا پسینہ کیوں آ رہا ہے طارق بھائی!"

طارق نے گھبراہٹ میں آستین سے ماتھے کا پسینہ صاف کیا۔

''گھبراؤ مت طارق بھائی......'' فرہاد نے تسلی دی۔

''بس تھوڑی دیر کی بات ہے۔ ٹارگٹ نظر آتے ہی۔''

''کک ......کک...... کیسا ٹارگٹ ...... !'' طارق ہکلایا۔

''کوئی رینجرز کی گاڑی...... یا ملٹری کی گاڑی۔''

طارق کے دل کی رفتار اور گاڑی کے انجن کی آواز باہم ملنے لگی تھیں۔

''مم......مم...... میں مرنا نہیں چاہتا۔'' طارق نے روہانسا ہو کر کہا تو فرہاد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

یوں جیسے اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا ہو اور پھر اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ گاڑی میں اس کی ہنسی گونجنے لگی۔

☆......☆......☆

ہماری کہانی کا ثانوی کردار اب مرکزی کردار بن چکا تھا۔ اور پوری کہانی اس کے گرد گھومنے لگی تھی۔

کار بہت دیر تک مختلف سڑکوں پر گھومتی رہی۔ مگر کوئی ٹارگٹ نظر نہیں آیا۔

یہ بات صرف ٹارگٹ کی تلاش میں نکلنے والے لوگ جانتے ہیں کہ کراچی جیسے بڑے شہر میں ٹارگٹ تلاش کرنا کتنا مشکل کام ہے۔

یہاں روز ٹارگٹ کلنگ ہوتی ہے۔ بہ ظاہر آسان لگتا ہے کہ کسی کو ٹارگٹ بنایا اور اڑا دیا۔ لیکن یہ اتنا آسان نہیں۔ ٹارگٹ کا تعین، اس کی تلاش اور پھر کارروائی، یہ بہت مشکل کام ہے، کئی کئی دن لگ جاتے ہیں بسا اوقات...... اور ٹارگٹ سامنے نہیں آتا۔

انہیں بھی اپنا ٹارگٹ نہیں مل رہا تھا۔

کئی گھنٹے مختلف سڑکوں پر گھومنے کے بعد آخر گاڑی ہچکولے کھانے لگی۔

''گاڑی کو کیا ہوا؟''

''شاید سی این جی ختم ہو گئی ہے۔'' طارق نے بہ مشکل کہا۔

''تو پٹرول پر کرلو۔ ٹنکی تو فل رہتی ہے نا تمہاری!''

طارق نے گاڑی پیٹرول پر کرلی۔ پٹرول پر ہوتے ہی گاڑی کی رفتار تیز ہوگئی۔

'' شہر میں ضرور کچھ ہوا ہے۔'' فرہاد نے کہا۔''ساری سڑکیں ویران ہیں۔ پٹرول پمپ بند ہیں......''

''اور...... کسی نے روکا بھی نہیں ہے ہمیں ابھی تک۔'' طارق ایک دم بولا۔ فرہاد نے اس کی طرف دیکھا اور ہنس پڑا۔

''یہ جو پولیس اور رینجرز والے ہوتے ہیں نا...... یہ صرف بے ضرر لوگوں کو قابو کرنے کے لیے اپنی دہشت قائم کرتے ہیں۔ جس کسی پر شک ہوجائے اسے پریشان نہیں کرتے۔''

اس بے فکری سے ماؤتھ آرگن نکال لیا اور منہ سے لگایا ہی تھا کہ طارق کھکھیا اٹھا۔

''مم ...۔مم مجھے...... معاف کردو بھائی...... مم......مم...... مجھے جانے دو......''

فرہاد نے گھور کر دیکھا۔

''خاموشی سے چلو......!''

چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی۔

گاڑی میں کئی مرتبہ پہلے بھی خاموشی چھاتی رہی تھی۔ مگر اِس خاموشی اور اُس خاموشی میں بہت فرق تھا۔

''مم......مم...... میں اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہوں۔'' طارق اب باقاعدہ رونے پر اتر آیا۔

''مم......مم...... میرے سوا کوئی نہیں ہے اس کا......مم......مم...... مجھے کچھ ہوگیا تو وہ۔''

بات ادھوری چھوڑ کر وہ سچ مچ رونے لگا۔ فرہاد کو اس کے رونے پر شدید حیرت ہونے لگی۔

''صرف اپنی ماں کا خیال ہے تمہیں۔ یہ جو روز اتنی ماؤں کی گودیں اجڑ جاتی ہیں، ان کا کیا؟ یہ جو روز اتنی عورتیں بیوہ کردی جاتی ہیں اور یہ جو روز اتنے بچے یتیم کردیے جاتے ہیں...... ان کا احساس نہیں ہے تمہیں!'' طارق صرف رو رہا تھا۔

''مم......مگر...... ہمیں کیا ملے گا اس سے!'' وہ ہچکیوں کے ساتھ بولا۔

''تمہیں نہیں معلوم ہمیں کیا ملے گا......؟'' فرہاد نے بے یقینی سے پوچھا۔

''کمال ہے اُس وقت تو بڑی بحث کررہے تھے۔ مجھے قائل کررہے تھے کہ جہاد کتنا ضروری ہے۔ خودکش مجاہدین کتنا بڑا کام کررہے ہیں...... اور اب جب اللہ نے تمہیں اس بڑے کام کے لیے چن لیا ہے تو تمہاری جان نکل رہی ہے۔ اماں یاد آرہی ہے۔''

''مگر بھائی، ہمیں اس سے کیا ملے گا!!'' اس کے رونے میں اب جھنجلاہٹ بھی شامل ہوگئی تھی۔

''ہمیں جنت ملے گی۔ ویسے بھی میری جو حیثیت ہے، بس وہی کرنا ہے۔ مجھے اپنا کام کرنا ہے۔ اس کا نتیجہ کیا نکلنا ہے، یہ ہمارے کمانڈروں کے سوچنے کا کام ہے۔'' طارق کے پاس رونے اور سسکیاں لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆......☆......☆

بہت دیر تک گاڑی مختلف سڑکوں پر گھومتی رہی۔ ٹارگٹ تھا کہ ملنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

وہ سڑک کے اس طرف ہوتے تو سڑک کے دوسری طرف رینجرز کی گاڑیاں کھڑی نظر آتیں اور جب وہ بہت آگے جاکر گھوم کر واپس آتے تو گاڑی وہاں سے جاچکی ہوتی۔

کبھی طارق روڈ، کبھی پی سی ایچ ایس سوسائٹی اور کبھی واپس شاہراہ فیصل......

آخر جب اللہ والی چورنگی سے گھوم کر وہ شاہراہِ

سگنل پر پہنچے تو نرسری سے ذرا آگے جا کر طارق کے اعصاب جواب دے گئے۔
اس نے گاڑی ایک طرف روک دی۔
"اب کیا ہو گیا؟ گاڑی کیوں روک دی؟" فرہاد نے غصے سے آنکھیں نکالیں۔ طارق نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔
"دیکھو فرہاد بھائی! تمہیں خدا کا واسطہ! اللہ رسول کا واسطہ! تم مجھے، تم مجھے چھوڑ دو۔" فرہاد نے غرا کر کہا۔
"کیا چاہتا ہے تُو...... یہیں پھٹ جاؤں؟؟ حرام موت مر جاؤں؟ جس مقصد کے لیے نکلا ہوں، ادھورا چھوڑ دوں اسے!" طارق بھوں بھوں کر کے بچوں کی طرح رونے لگا۔
"دیکھو...... دیکھو پورا شہر گھوم لیا ہے ہم نے۔ کوئی گاڑی نہیں ملی رینجرز کی، نہ فوجیوں کی، خدا بھی شاید نہیں چاہتا کہ ہم یہ...... ہم یہ۔" فرہاد نے غصے میں اس کی گدی پر ایک زوردار ہاتھ جما دیا۔
"اچھا!! تُو خدا کے بارے میں زیادہ جانتا ہے۔"
"نن...... نن...... نہیں، میں زیادہ نہیں جانتا۔ ہاں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ تم جو کچھ کر رہے ہو، وہ ٹھیک نہیں ہے اور"
فرہاد خوں خوار نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ "یہ سڑک سیدھی کہاں جا رہی ہے؟"
"مم...... ملیر کی طرف!"
"ملیر کی طرف......!" فرہاد ایک لمحے کو سوچ میں پڑ گیا۔ "ملیر چھاؤنی......!" طارق کی آنکھیں یک بارگی خوف سے پھیل گئیں۔
"وہاں تو فوجی بیرکس ہیں نا......؟" آنکھوں میں پھیلا ہوا خوف مزید پھیل گیا۔
"چلو سیدھے چلو!"
"بھائی! فرہاد بھائی خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ دیکھو میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ میری ماں میرا انتظار کر رہی ہو گی۔" فرہاد سے اب اس کا رونا برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ گرج کر بولا۔
"رونا بند کرو۔ ورنہ یہیں مر جاؤ گے اور وہ بھی حرام موت۔"
ان باتوں سے طارق کا رونا کم نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اب باقاعدہ ہچکیوں سے رو رہا تھا۔
"بے مقصد موت مرنے سے بہتر ہے کہ کسی مقصد کے لیے جان دے کر شہید کا رتبہ حاصل کرو...... چلو۔"
طارق مسلسل رو رہا تھا۔ فرہاد نے گدی پر دو چار ہاتھ جمائے تو کانپتے ہاتھوں اور لرزتے پیروں سے ایک مرتبہ پھر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔
اب گاڑی کا رخ ملیر چھاؤنی کی طرف تھا۔

☆......☆......☆

اب ان کی کار ایئرپورٹ کا پل عبور کر رہی تھی۔ طارق کی ہچکیاں گاڑی میں گونج رہی تھیں۔
"ترس آتا ہے تم جیسے لوگوں پر......" فرہاد نفرت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔
"کیڑے مکوڑوں جیسی زندگی جیتے ہو، پھر بھی جینے کی ہوس ختم نہیں ہوتی۔ کیا کرو گے جی کر!!"
طارق کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا، سارے سوال جواب اس کے ذہن سے نکل گئے تھے۔ صرف آنکھوں میں آنسو تھے، جو بار بار پھسل کر رخساروں تک آ رہے تھے۔
"جتنا زیادہ روؤ گے، سمجھو اتنے ہی دریا تمہارے اور جنت کے درمیان میں آ جائیں گے!"
طارق نے بھیگی پلکوں کے ساتھ بے چارگی سے اس کی طرف دیکھا تو فرہاد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ایک ایسی مسکراہٹ جو صرف کہانی کے کسی

مرکزی کردار کے ہونٹوں پر ہوتی ہے۔

''اب آنسو صاف کرو۔'' فرہاد نے کہا۔

''کلمہ پڑھو اور خدا کی راہ میں اپنی زندگی قربان کرنے کو تیار ہو جاؤ۔'' طارق دل ہی دل میں وہ ساری دعائیں پڑھ رہا تھا جو نو عمری میں نے اس نے نماز کی پڑھنے کی عادت کے دوران یاد کی تھیں۔ مگر اب تو عرصہ ہوا نماز کی عادت بھی چھوٹ گئی تھی۔ اور دعائیں بھی کچی پکی یاد رہ گئی تھیں۔

''ٹارگٹ پر دھیان دو۔ ٹارگٹ......'' فرہاد اب کہانی کے مرکزی کردار کی طرح حکم دے رہا تھا۔

''ہمیں اپنی گاڑی ملٹری بیرکس سے ٹکرانی ہے۔''

''مم...... مم...... چیک پوسٹ ہے وہاں تو اور......'' طارق نے منمنا کر کہنے کی کوشش کی۔

''پروا نہیں...... کتنی ہی گولیاں چلیں گاڑی مت روکنا۔ یقین کرو، یہ گاڑی ہمیں سیدھی جنت میں لے کر جائے گی۔ چلو، کلمہ پڑھو۔'' طارق بلند آواز سے کلمہ پڑھنے لگا۔

موت اسے اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آ رہی تھی۔

☆......☆......☆

اور پھر اچانک گاڑی جھٹکے کھا کر ایک ویران جگہ رک گئی۔

''اب کیا ہو گیا!'' فرہاد کی غراہٹ گاڑی کے اندر گونج کر رہ گئی۔ طارق کا پیشاب خطا ہو گیا۔

''پپ...... پپ...... پیٹرول ختم ہو گیا......!''

''کیا......! اتنی جلدی......!'' اس کا غصہ عروج پر پہنچ گیا تھا۔

''اتنی دیر سے گاڑی چلا رہے ہیں۔ آدھی رات ہو گئی ہے...... خ...... خ...... ختم تو ہونا ہی تھا۔''

''لاحول ولاقوۃ۔'' فرہاد تلملا کر رہ گیا اور نفرت انگیز نظروں سے طارق کو گھورتا رہا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ طارق کی گردن پکڑ کر مروڑ دیتا۔

کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ فرہاد اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

طارق کی جان اتنی دیر تک سولی پہ اٹکی رہی۔

آخر فرہاد ایک دم سے دروازہ کھول کر اتر گیا۔ دو قدم آگے گیا۔ پھر واپس آیا۔ طارق کی کھڑکی کی طرف، اور شدید غصے کی حالت میں دو چار ہاتھ جڑ دیے۔

''لعنت ہو تمہاری شکل پر۔ بدنصیب انسان!''

''مم...... میرا قصور کیا ہے؟'' بڑی ہمت کر کے طارق کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔

اور فرہاد جو غصے میں آگے جانے لگا تھا۔ ایک دم پلٹ کر آیا اور چلا کر بولا۔

''قصور پوچھتا ہے۔ بدبخت انسان، سب کچھ برباد ہو گیا تیری وجہ سے۔ بدنصیب، منحوس!'' طارق خوف زدہ نظروں کے ساتھ روہانسی صورت لیے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ فرہاد آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

''تیرے نصیب میں شہادت ہے ہی نہیں۔ ہو بھی کیسے سکتی ہے۔ تجھ جیسے منافق اور بدذات کو شہادت کی موت نصیب ہی نہیں ہو سکتی۔ تو دیکھنا، تو کتے کی موت مرے گا۔ بے مقصد، بلاضرورت، شہید کی موت نہیں۔''

اس نے غصے میں دو چار ہاتھ اور جڑ دیے اور پھر سڑک کراس کر کے ریلوے لائن کی طرف چلا گیا۔

طارق نے چند لمحوں بعد نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ ریلوے لائن کے قریب جاتا نظر آیا۔

طارق نے اسٹیرنگ پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

ہماری کہانی کا مرکزی کردار...... جو کہانی کا ہیرو بھی تھا، کہانی کے اختتام پر ثانوی اور غیر ضروری کردار کی طرح آنسو بہا رہا تھا۔

☆☆......☆☆

افسانہ

عائشہ شفقت

کمپرومائز

''پتا نہیں بیٹا، شاید فطرت شیئرنگ برداشت نہیں کرسکتی۔ چاہے وہ شوہر کی ہو، باپ کی ہو یا بھائی بیٹے کی۔ اگر وہ بیٹی ہے تو وہ بھی نہیں چاہے گی کہ اس کا باپ کسی اور کی اولاد کو پیار کرے۔ اسی طرح جب بھابیاں آتی ہیں تو تب بھی وہ بھائی کی وہی توجہ چاہتی ہیں، جو وہ......

زندگی میں کمپرومائز کی اہمیت اُجاگر کرتا ایک افسانہ

''افیشن بتاؤ تو سہی آخر مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ؟''

''مسئلہ!'' افیشن نے جیسے حیرانگی سے پوچھا۔

''تم مجھ سے مسئلہ پوچھ رہے ہو؟ یہاں مسئلہ نہیں مسائل ہیں۔ ایک انبار ہے مسائل کا اگر حل کرسکتے ہو تو بات کرو۔'' افیشن نے چڑ کر کہا۔

''پھر بھی بتاؤ تو۔'' احمر پریشان سا ہوگیا۔

''سب سے بڑا مسئلہ تو آپ کی والدہ صاحبہ ہیں جو کہ کبھی میری خالہ تھیں اور اب میری ساس کے عہدے پر فائز ہیں۔ بلکہ سارے مسئلے شروع ہی خالہ جان سے ہوتے ہیں۔'' افیشن نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ مجھے بتاسکتی ہیں کہ کس قسم کے مسئلے؟'' اپنی ماں کی برائی سُن کر احمر کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ افیشن کا اصل مسئلہ جاننا چاہ رہا تھا۔

''جی بالکل!'' افیشن نے ایک لمحہ توقف کیا۔

اس کا لہجہ بدستور طنزیہ تھا۔

''آپ بخوبی آگاہ ہوسکتے ہیں۔ خالہ جان کو میری ہر بات پر اعتراض ہوتا ہے۔'' بالآخر اس نے شکایتوں کا دفتر کھولنا شروع کیا۔ ''یہ نہ کرو، وہ نہ کرو، یہ چیز یہاں سے لی ہے تو وہاں سے کیوں نہیں لی۔ اُف...... میری خالہ تو وہ لگتی ہی نہیں ہیں کسی اینگل سے۔ لگتا ہے پیدائشی ساس ہیں۔''

''افیشن تم زیادتی کررہی ہو۔ وہ بڑی ہیں تمہاری، اپنی خالہ سمجھ کر نہ سہی مگر میری ماں سمجھ کر ہی خاموش ہوجایا کرو۔'' فضول سی شکایتوں پر احمر چڑ گیا۔

''کہاں تک خاموشی اختیار کروں۔ انسان ہوں، کوئی روبوٹ نہیں کہ ان کی ہر زیادتی پر خاموش رہوں۔ آخر برداشت تو جواب دے ہی جاتی ہے۔'' افیشن نے تنگ کر کہا۔

''تم تھوڑا کمپرومائز کرلیا کرو اور یہ بھی تو دیکھو کہ امی نے کبھی تمہاری شکایت نہیں کی۔'' احمر

نے ماں کی سائیڈ لیتے ہوئے کہا۔

"مگر احمر......" افیشن نے کچھ کہنا چاہا مگر احمر نے بات کاٹ دی۔

"بس کرو افیشن! ہر روز یہی شکایتیں اور وہ بھی جن کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا۔ تمہیں تو یہ خیال نہیں ہے کہ صبح کا ناشتہ کیا ہوا ہے، اب رات کو ہی کچھ سکون سے کھانے دو مگر نہیں، تمہیں فضول سی شکایتیں لگانے کے علاوہ کچھ آتا ہی نہیں ہے۔"

اور افیشن کے پاس خاموش رہنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ احمر کو کھانے کی میز سے بھوکا اٹھتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

☆......☆......☆

افیشن اور احمر خالہ زاد اور چچا زاد تھے۔ دونوں کے گھر قریب قریب ہی تھے۔ بچپن کا

ساتھ تھا۔ افشن دو بھائیوں کے بعد آنے والی تیسری اولاد اور پہلی بیٹی تھی۔ احمر سب سے بڑا تھا۔ اس کے بعد دو بھائی اور تھے۔ اس طرح افشن دونوں گھروں میں اکلوتی لڑکی تھی۔ بھائیوں کے ساتھ ساتھ چچا زاد بھائیوں کی بھی لاڈلی تھی۔ ماں باپ نے تو پیار کیا ہی وہ خالہ اور چچا کی بھی بہت لاڈو تھی۔ اسی طرح بچپن میں ہنستے کھیلتے، لڑتے جھگڑتے بڑے ہوگئے اور پتا بھی نہ چلا کہ کب افشن اور احمر کے دل ایک دوسرے کے لیے دھڑکنے لگے۔ دونوں بہنوں کا تو پہلے ہی ارادہ نیک تھا، اب بچوں کے رجحان کو دیکھتے ہوئے انہوں نے دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھنے میں ذرا دیر نہ لگائی اور جیسے ہی احمر کو نوکری ملی اور افشن کی تعلیم مکمل ہوئی۔ دونوں کی شادی ہوگئی۔

☆......☆......☆

''احمر آج خالہ جان نے مجھے......'' حسب عادت افشن نے احمر کے آتے ہی شکایتوں کے دفتر کھولنے چاہیے۔

''افشن مجھے ایک بات بتاؤ مگر صحیح بتانا۔'' احمر نے اس کے تیور بھانپتے ہوئے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''جی پوچھیں!'' افشن نے کچھ جز بزسی ہو کر کہا۔

''میری ماں تمہاری خالہ اور ساس سے ہماری شادی سے پہلے تو تمہیں کوئی مسئلہ نہیں تھا بلکہ تم تو ان سے باتیں کرتے ہوئے، اُن کی خاطر کرتے ہوئے نہ تھکتی تھیں۔ پھر اب کیا ہوگیا؟''

''اب شادی جو ہوگئی ہے۔'' افشن نے ترخ کر جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' احمر نے نا سمجھی سے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ اب وہ صرف خالہ نہیں بلکہ ساس ہیں اور ساس کیا ہوتی ہے وہ کسی بہو سے جا کر پوچھیں۔'' افشن نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''ہر کوئی تو ساس کو ایسا نہیں کہتا۔'' احمر نے کہا۔

''جی! اور ہر کسی کی ساس ایسی بھی نہیں ہوتی۔'' افشن نے ترنت جواب دیا۔

''یہ...... آج تم کچھ زیادہ ہی پہیلیاں نہیں بجھوا رہی ہو۔'' احمر کے ماتھے پر کچھ بل آگئے تھے۔ جنہیں دیکھ کر اور محسوس کر کے افشن کچھ محتاط ہوگئی۔ ظاہر ہے اپنی ماں کے متعلق کوئی کتنی باتیں سُن سکتا ہے۔

''کچھ نہیں، آپ بتائیں کیا کھائیں گے چائے کے ساتھ۔'' افشن نے بات پلٹنے کے ساتھ ساتھ اپنے موڈ کو بھی پلٹ دیا۔

''کل پکوڑوں کی فرمائش کر رہے تھے نا آپ، میں نے بیسن گھولا ہوا ہے۔''

''ہاں بنالو اور ساتھ میں فرائز بھی بنالینا۔'' احمر نے بھی اپنا موڈ خوشگوار کیا۔

☆......☆......☆

''خیریت! تم آج کل نظر ہی نہیں آرہیں، بھول گئی ہو یا مصروف ہوگئیں۔'' افشن کی بچپن کی دوست نازش نے سات ماہ بعد افشن کو ایک مال میں دیکھا تو بے اختیار پوچھا۔

''نہیں یار میں تمہیں بھول جاؤں؟ یہ تمہیں کس نے نیا سبق پڑھا دیا۔ سسرال کی مصروفیتوں کا تو تمہیں پتا ہے نا۔ گھر کے ہزار کام ہوتے ہیں۔''

''اور تمہارے سسرال والوں سے تعلقات کیسے ہیں؟''

''بس ٹھیک ہی ہیں۔'' افیشن نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''کیوں کیا ہوا؟'' نازش نے استفسار کیا۔

''بس یار میری خالہ، ساس کیا بنیں انہوں نے میرے خلاف محاذ ہی کھول دیا۔ کبھی اِس بات پر اعتراض تو کبھی اُس بات پر اعتراض اور میں تو خالہ جان کی شکایتیں دور کرنے کی کوشش میں بے حال ہوتی رہتی ہوں۔ مگر مجال ہے جو ماتھے کے بل سیدھے ہو جائیں۔''

''اور احمر بھائی...... وہ کیا کہتے ہیں؟''

''انہوں نے کیا کہنا ہے، بس یہی کہ تم ایک ٹپیکل بہو ہو، امی اگر ٹپیکل ساس ہوتیں تو وہ بھی تمہارے خلاف شکایتوں کے محاذ کھول دیتیں۔'' افیشن کے لہجے میں احمر کے خلاف شکایتیں ہی شکایتیں تھیں کہ وہ ماں کے مقابلے میں بیوی کو کوئی اہمیت نہیں دے رہا۔ حالانکہ اگر افیشن غور کرتی تو سمجھ لیتی کہ بیوی اور ماں کے درمیان کوئی مقابلہ نہیں۔

''تو پھر؟''

''پھر کیا۔ اب ان کے مطابق بننے کی کوشش کرتی رہتی ہوں اور کرتی رہوں گی اور کیا کر سکتی ہوں۔''

''جو بھی ہے افشی تم انہیں اسی طرح تسلیم کر لو۔ اب اس عمر میں وہ تو بدلنے سے رہیں۔ تم ہی برداشت کرو۔'' نازش نے مخلصانہ مشورہ دیا۔

''ہاں یار نازو، کوشش تو ہے۔ آگے دعا کرو۔'' افیشن نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اچھا اب چلتی ہوں۔ انشاءاللہ پھر ملاقات کروں گی۔''

''انشاءاللہ۔''

☆......☆......☆

''اس مرتبہ بہت دنوں بعد شکل دکھائی تو نے افشی۔ ایک شہر میں رہتے ہوئے تجھے دیکھنے کو ترستی ہوں۔''

''بس امی جان گھر کے کام ہی نہیں نکلنے دیتے۔ پھر جب سے یہ ننھی پری آئی ہے کام کچھ بڑھ ہی گیا ہے۔'' افیشن نے ننھی عرشیہ کو پیار کرتے ہوئے اسے امی کی طرف بڑھایا۔

''ہاں اس کے لیے تو ہم سب بھی اُداس ہو جاتے ہیں۔ تو جلدی جلدی چکر لگایا کرو۔'' امی نے افیشن کے ہاتھوں سے لے کر اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا امی کوشش کروں گی۔''

''اور بتا صفیہ کا کیا حال ہے اور احمر......؟''

''سب ٹھیک ٹھاک ہیں اور آپ نے یہ کیا حالت بنائی ہوئی ہے۔ ٹھیک سے کھانا کھایا کریں نا۔'' افیشن نے فکرمندی سے کہا۔

''بس بیٹا۔''

''امی آپ بھائی کی شادی کر دیں۔ اب منگنی کو بھی سال ہونے لگا ہے۔'' افیشن نے مشورہ دیا۔

''ہاں میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔ یمنیٰ کی امی بھی جلد شادی کرنا چاہ رہی ہیں۔''

''امی وہ......'' افیشن نے پُرسوچ انداز میں ماں کو مخاطب کیا۔

''ہاں افشی بولو۔'' امی نے ننھی عرشیہ کو تھپکتے ہوئے کہا۔ کچھ لمحے افیشن سوچتی رہی۔ وہ اس کشمکش میں تھی کہ ماں سے بات کرے یا نہ کرے۔ شادی کے ڈیڑھ سالوں میں ابھی تک ماں سے اپنی ساس کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی کبھی کوئی شکایت کی تھی۔

''بولو بیٹا کیا بات ہے۔'' اسے خاموش دیکھ کر ماں نے دوبارہ پوچھا۔

''کچھ نہیں امی۔'' بالآخر اس نے ماں کو کچھ
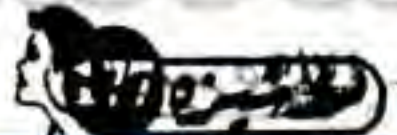
نہ بتانے کا فیصلہ کیا اور بات پلٹ دی۔
''وہ میں ...... بھائی کی شادی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کہ کہاں سے تیاریاں شروع کروں۔''

☆......☆......☆

اس دن پھر ساس بہو کے درمیان زبردست معرکہ ہوا۔ نہایت معمولی سی بات تھی جو افیشن سے برداشت نہ ہوئی اور اس نے اپنی خالہ کو دو بدو جواب دیے۔ پھر کچن سے چھٹی لے کر سر منہ لپیٹ کر کمرہ بند ہوگئی۔
''احمر آج آئیں تو سہی ان کی ماں کی حرکتیں ذرا اُن کے آگے گوش گزار کروں۔'' افیشن نے کڑھتے ہوئے سوچا۔
''سوئے اتفاق اسی دن زبیدہ بیگم کو بہن کے ساتھ ساتھ بیٹی اور نواسی کی یاد ستانے لگی تو وہ صفیہ بیگم کے گھر پہنچ گئیں۔
''تمہیں تو اب میری یاد ہی نہیں آتی۔'' زبیدہ بیگم نے سلام دعا کے بعد شکوہ کرتے ہوئے کہا۔
''یا پھر پوتی نے آکر بہن کو بھلا دیا۔'' انہوں نے عرشیہ کو پیار کرتے ہوئے کہا۔
''یہ تو ہے۔ عرشیہ کو دیکھ کر تو میں سب کچھ بھول جاتی ہوں۔ وہ تو جان ہے میری۔ اللہ نے پوتی کی شکل میں میری برسوں کی آرزو پوری کردی۔'' صفیہ نے عرشیہ کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔
زبیدہ بیگم ہنس پڑیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ صفیہ کو بیٹی کی کتنی خواہش تھی۔
''افیشن نظر نہیں آرہی۔ کچن میں ہے کیا۔'' انہوں نے اِدھر اُدھر افیشن کو کھوجتے ہوئے کہا۔
''پتا نہیں شاید کمرے میں ہو۔ کہہ رہی تھی کہ سر میں درد ہے۔ شاید دوا لے کر سوگئی۔'' صفیہ بیگم نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔
''ارے غضب خدا کا احمر کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ اور اسے کوئی ہوش ہی نہیں کہ کھانا بھی بنانا ہے۔''
''کوئی بات نہیں آپا بنالے گی۔ بلکہ کل کا بچا ہوا سالن پڑا ہوگا وہی چل جائے گا۔ شام میں طبیعت فریش ہوجائے گی تو بنالے گی۔''
''صفیہ! کوئی بات تو نہیں ہوئی ہے تم دونوں کے درمیان؟'' زبیدہ بیگم نے مشکوک نظروں سے بہن کو دیکھتے ہوئے اٹکتے ہوئے کہا۔
''ارے نہیں آپا، کوئی بات نہیں ہوئی۔ آپ خواہ مخواہ میرے اور افیشن کے تعلقات بگاڑنے کی کوشش نہ کریں۔'' صفیہ نے ہنس کر بات ٹالی لیکن زبیدہ بیگم کو شاید یقین نہ آیا تھا۔ کہنے لگیں۔
''اچھا میں ذرا افشی سے مل لوں۔''
''ہاں ضرور۔''
افیشن کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ انہوں نے ہولے سے دستک دے کر آواز بھی دی۔
''افیشن بیٹا دروازہ کھولو۔'' ماں کی آواز سُن کر تو وہ گویا اڑتی ہوئی دروازہ کھولنے آئی اور ماں کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔
''افشی ...... افشی ...... کیا ہوا ہے بیٹا۔'' زبیدہ بیگم اس اچانک افتاد سے گھبرا گئیں اور اسے ساتھ لگائے لگائے کمرے میں آکر اسے بیڈ پر بیٹھاتے ہوئے بولیں۔
''طبیعت تو ٹھیک ہے نا بیٹا۔'' مگر افیشن نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ روئے جارہی تھی۔ موقع کو دیکھتے ہوئے زبیدہ بیگم نے افیشن کو رونے دیا۔ آخر دس پندرہ منٹ بعد اس کا جی ہلکا ہوا تو ماں کے آگے شکایتوں کے دفتر کھول کے بیٹھ گئی۔
''یہ کوئی ایسی بڑی بات تو نہیں ہے۔ اگنور تو

تم بھی کر سکتی تھیں۔'' ماں نے اسے سمجھانے کا آغاز کیا۔

''امی آپ بھی۔'' افیشن نے شکوہ کناں لہجے میں ماں سے کہا۔

''جی ہاں بہن ہیں آپ کی، آپ تو ان ہی کی طرف داری کریں گی نا۔''

''نہیں بیٹا! تم بیٹی ہو میری...... اکلوتی بیٹی۔ میں تمہارا گھر اجڑا ہوا نہیں، بسا ہوا دیکھنا چاہتی ہوں۔ اور ایک اچھے گھر کے لیے کمپرومائز سب کو کرنا پڑتا ہے۔ میں نے بھی کیا، تمہاری خالہ نے بھی کیا اور تقریباً 95 فیصد عورتیں کرتی ہیں۔''

''امی آپ اور خالہ تو غیروں میں بیاہی تھیں اس لیے آپ لوگوں کا سمجھوتا تو سمجھ میں آتا ہے جبکہ خالہ تو میری سگی ہیں۔ شادی سے پہلے تو واری صدقے ہوتی تھیں مگر اب......؟'' افیشن نے افسردہ ہوتے ہوئے کہا۔

''بیٹا بھلے سے خالہ، مامی، چاچی، پھوپی یا کوئی بھی رشتہ ہو۔ شادی کے بعد سب ختم ہو جاتا ہے۔ صرف ایک ہی رشتہ رہ جاتا ہے۔''

''مگر کیوں امی؟'' افیشن نے اُلجھتے ہوئے سوال کیا۔

''پتا نہیں بیٹا، شاید فطرت شیئرنگ برداشت نہیں کر سکتی۔ چاہے وہ شوہر کی ہو، باپ کی ہو یا بھائی بیٹے کی۔ اگر وہ بیٹی ہے تو وہ کبھی نہیں چاہے گی کہ اس کا باپ کسی اور کی اولاد کو پیار کرے۔ اسی طرح جب بھابیاں آتی ہیں تو تب بھی وہ بھائی کی وہی توجہ چاہتی ہیں، جو وہ اپنی شادی سے پہلے بہن کو دیتا تھا۔ یہی حال ماں کا ہے۔ جب بیٹا بیوی کو اہمیت دیتا ہے تو ماں کو یہی لگتا ہے کہ اب بیٹا کبھی اس کی نہیں مانے گا بلکہ ماں کے مقابلے میں بیوی کو ہی اہمیت دے گا اور شوہر کی شیئرنگ کا تو سب کو پتا ہی ہے۔ بس بیٹا یہ جو اللہ نے رشتے بنائے ہیں نا......'' زبیدہ بیگم نے ٹھنڈی سانس بھر کے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''تو کیا امی بھائی کی شادی ہو جائے گی تو میں اور آپ بھی......''

''شاید؟ تمہارا اس لیے نہیں کہوں گی کہ تم اب شادی شدہ ہو، اپنے گھر آباد ہو، اس لیے تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مگر اپنے بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ خیر چھوڑو بیٹا، تمہیں پتا ہے صفیہ نے کبھی مجھ سے یا احمر سے تمہاری شکایتیں نہیں لگائیں۔ حالانکہ وہ ایسا کر سکتی تھی۔ مگر اس سے گھر کا ماحول مزید خراب ہوتا اور احمر الگ تم سے بدگمان ہوتا اور ایک بہو کے طور پر شیئرنگ تو تم بھی برداشت نہیں کر رہی ہو۔ اور تم سے بھی تو یہ برداشت نہیں ہو رہا کہ احمر تمہارے مقابلے میں ماں کو اہمیت دے۔ بیٹا صفیہ بہت اچھی خالہ تھی اور ساس بھی ہے۔ اسے تم سے اب بھی بہت محبت ہے۔ جبھی تو وہ تمہاری ہر زیادتی کو نظر انداز کیے جا رہی ہے۔ تم بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر کڑھنا چھوڑو اور برداشت اور تحمل کی عادت ڈالو۔ صفیہ کی عزت کیا کرو اور احمر کو کبھی ماں سے بدگمان کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ دیکھ لینا تمہاری زندگی کتنی آسان ہو جائے گی اور......'' انہوں نے چند لمحے توقف کیا جیسے کچھ سوچ رہی ہوں۔

'' تمہارے اچھے کام شاید میرے لیے آسانیاں پیدا کر دیں کہ میں بھی اب ساس کے عہدے پر فائز ہونے جا رہی ہوں۔''

افیشن اب ایک نئی زندگی گزارنے کے لیے پرعزم تھی۔ وہ بہرحال ماں کے راستے میں کانٹے نہیں بچھانا چاہتی تھی۔

☆☆......☆☆

''آپ نے اپنا نام تو بتایا نہیں۔؟'' ماریہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔''اوہ...... مینا ہے میرا نام۔'' مینا نے کڑھی میں چمچ ہلاتے ہوئے جواب دیا تھا۔'' اچھا نام ہے۔ کافی Unique سا ہے۔'' ماریہ نے مینا کے نام کے بارے میں رائے بھی پاس کردی۔اور......

زندگی کی کٹھنائیوں کو عیاں کرتے، ایک خوبصورت ناولٹ کا تیسرا حصہ

شادی ختم ہوئی تو زندگی بھی روٹین پر آ گئی۔ طٰہٰ نے بھی فیکٹری جانا شروع کر دیا طٰہٰ مینا کو ٹوٹ کر چاہتا تھا۔ اس بات کا اندازہ مینا کو بہت جلد ہو گیا تھا۔اس کا بس چلتا تو وہ مینا کو ہر وقت اپنے سامنے بٹھائے رکھتا۔

مینا، مینا، اور مینا...... شادی کے بعد کا ایک ہفتہ تو بس ایسے ہی گزر گیا۔ دوسرے ہفتے سے طٰہٰ نے فیکٹری جانا بھی شروع کر دیا۔ کافی محنت پسند تھا طٰہٰ، اس بات کا اندازہ مینا کو ایک ہفتے میں ہی ہو گیا تھا، لیکن وہ مینا سے بھی بہت پیار کرتا تھا، بلکہ جان چھڑکتا تھا اس پر۔ کسی زمانے میں پیار کا بیج اس کے دل کی زمین پر بویا گیا تھا۔اب وہ تناور درخت بن چکا تھا۔ مینا تو بس ششدر رہ جاتی تھی اس کی محبت کو دیکھ کر......

رطابہ اور نینا کے برعکس اسے لڑکپن سے ہی ڈائجسٹ سے خصوصی لگاؤ تھا۔ اور وہ خواتین کے ایک دو معیاری ڈائجسٹ باقاعدگی سے پڑھا بھی کرتی تھی۔ اور ان میں موجود معیاری مواد کی وجہ سے اس کی شخصیت میں کافی نکھار تھا۔ وہ ایک ذمے دار طبیعت کی مالک تھی اور دوسروں کا احساس بھی تھا اسے، ویسے بھی سلطانہ اور شاہین نے اس کی کافی اچھی تربیت کی تھی۔ اپنے ماں باپ کے تکون کی مثالی محبت سے وہ نہ صرف آگاہ تھی، بلکہ سلطانہ کی سیف سے بے لوث محبت سے بے حد متاثر بھی تھی۔ اسے وہ دن بھی یاد تھے جب سیف شاہین کو لائے تھے۔ تو سلطانہ نے اپنے شوہر کی محبت کی بھی لاج رکھی تھی۔ اس کے علاوہ مینا، رطابہ اور نینا کے درمیان بھی مثالی محبت تھی، جو دیکھتا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا، مزید ان تینوں کو اپنے گڈے ٹائپ بھائی سے بھی بہت محبت تھی۔ جب وہ چھوٹا تھا تو سلطانہ ساربان کے بارے میں بے حد حساس تھی۔ انہیں ساربان کے ساتھ کھیلنے یا اسے اٹھانے نہیں دیتی تھی، لیکن جب وہ کچھ بڑا ہوا تو بس انہی کا ہو کے رہ گیا تھا، پھر ماں باپ بھی تو کتنا محبت کرتے تھے تینوں لڑکیوں سے۔ مینا کو یاد تھا کہ دو تین سال پہلے جب وہ

سیڑھیوں سے پھسلی تھی تو اسے کافی چوٹ لگی تھی، تب
سلطانہ کی حالت تو خود اس طرح ہوگئی تھی جیسے خود
اسے چوٹ لگی ہو۔ شاہین الگ بے قرار تھی......

سیف بھی کافی تشویش میں مبتلا ہوگئے تھے کہ کہیں
ان کی بیٹی کو کسی کی نظر تو نہیں لگ گئی، چنانچہ انہوں
نے مینا کو ایک نظر کا تعویذ بھی لاکر دیا تھا۔ اس کے

علاوہ گھر میں بھی قرآن مجید کا ایک ختم کروایا تھا۔
اور اب محبت کرنے والا شوہر...... طٰہٰ واقعی اس پر جاں نثار کرتا تھا۔
شادی کے بعد کا پہلا ہفتہ تو کافی خوشگوار گزرا تھا۔ طٰہٰ کی رفاقت واقعی اسے انمول لگنے لگی تھی۔ فرزانہ آپا بھی بہت اچھی فطرت کی تھیں۔ دو دن تو انہوں نے ہی کھانا بھیجا۔ اس کے علاوہ ایک شاندار سی ضیافت کا بھی اہتمام کیا تھا۔ مینا کو اندازہ ہو گیا تھا کہ فرزانہ آپا طٰہٰ سے بہت پیار کرتی ہیں۔ بالکل بھائیوں کی طرح رکھتی تھیں اسے اور اسی وجہ سے انہیں مینا بھی کافی عزیز تھی۔ کبھی کبھار شام کو طٰہٰ اسے میکے کا چکر بھی لگوا آتا۔ لڑکی کے رخصت ہونے سے اس کے باپ کا گھر اس کا میکہ کہلانے لگتا ہے۔ لڑکیوں کو اپنا میکہ بہت عزیز ہوتا ہے، بلاشبہ میکہ بھی لڑکی کا گھر ہوتا ہے، لیکن صرف فرق یہی ہوتا ہے کہ وہ وہاں مہمان ہوتی ہے۔
ماں باپ اور رطابہ سے ملنا اسے بہت اچھا لگتا...... اور پھر طٰہٰ نے باقاعدگی سے فیکٹری جانا شروع کر دیا۔ صبح کو جاتا اور پھر شام کو لوٹتا تھا۔ اپنی فیکٹری تھی۔ اس کی دیکھ بھال، کسٹمرز سے ڈیل کرنا، فیکٹری سے متعلقہ بہت کام تھے، جنہیں کرتے کرتے شام ہو جاتی اور اِدھر مینا گھر میں اکیلی بس یہی سوچتی رہتی کہ کیا کروں۔ فرزانہ آپا کے پاس بھی چلی جاتی، لیکن وہ بھی ہر وقت بچوں میں مصروف رہتی تھیں۔
دو دن میں ہی وہ بہت اُکتا گئی۔ رسالوں میں اسے بلاشبہ بہت دلچسپی تھی، لیکن پھر بھی سارا دن پڑھنے سے رہی...... رضیہ خالہ کے علاوہ ایک چوکیدار بھی تھا اور ایک جز وقتی ملازمہ بھی آتی تھی۔ گھر کے افراد سے زیادہ تو ملازمین کی تعداد تھی۔ اس لیے مینا کے پاس تو گھر کا کوئی کام بھی کرنے کے لیے نہ ہوتا تھا۔
میکے میں تو ہر کام ہنستے مسکراتے اور نان اسٹاپ بولتے ہوئے کر لیے جاتے تھے۔ اور احساس بھی نہ ہوتا تھا وقت گزرنے کا۔ اور پھر اسکول میں بھی ایک اچھی مصروفیت تھی، لیکن اب یہاں کیا کرے؟
اور پھر مینا نے پانچویں دن ہی طٰہٰ کے سامنے اپنا شکوہ نما مسئلہ بیان کیا تو...... طٰہٰ کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔
''ابھی تو تم اپنی فراغت کا رونا رو رہی ہو۔ اور اگر خدا نے کچھ مہربانی کر دی تو پھر ہر وقت مصروفیت کا رونا روؤ گی۔'' طٰہٰ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔
''کیا مطلب؟'' مینا کو بات فوراً سمجھ نہ آئی۔
''مطلب بتاؤں اب۔'' طٰہٰ کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔
''اگر بچہ......''
''آپ بھی نا......'' مینا کچھ جھینپ سی گئی۔ ''جب ہو گا پھر دیکھیں گے، ابھی میں کیا کروں؟''
''کب ہو گا آخر......؟'' طٰہٰ نے فقرے کا دوسرا حصہ نظرانداز کر دیا۔
''طٰہٰ......'' مینا نے مصنوعی تنبیہی انداز میں کہا اور طٰہٰ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔
''مینا مصروف رہنے کے بھی کئی طریقے ہیں تم کھانا پکا لیا کرو، صفائی وغیرہ میں سلمیٰ اور رضیہ خالہ کی مدد کر دیا کرو۔'' طٰہٰ نے مینا کو مصروف رہنے کے لیے کچھ کام بتائے۔
''آپ کے خیال میں میرے ذہن میں یہ کام نہیں آئے ہوں گے۔ یہ کام تو میں کرتی ہوں، لگتی ہی کتنی دیر ہے اس میں...... اس کے علاوہ دو دو ملازمہ ہونے کی وجہ سے کام بھی کم ہو جاتا ہے، طٰہٰ نے مینا کی بات غور سے سنی واقعی مینا صحیح کہہ رہی تھی۔ مینا کے گھریلو ماحول کا اسے قدرے اندازہ تھا۔

''ٹی وی کیوں نہیں دیکھتیں تم؟'' کافی غور و خوض کے بعد طٰہٰ نے کہا تھا۔

''دیکھتی تو ہوں۔''

''وہ رات کو آٹھ بجے والا پی ٹی وی کا ڈرامہ......'' طٰہٰ کے لہجے میں قدرے طنز اور تنقید تھی، جسے مینا نے بھی محسوس کیا۔

''اور باقی یہ جو سو کے لگ بھگ ٹی وی چینل ہیں وہ کس لیے ہیں؟''

''مجھے نہیں اچھے لگتے۔'' مینا کا موڈ آف ہو گیا تھا، شاید اُسے طٰہٰ کا لہجہ پسند نہیں آیا تھا۔

''تمہیں اس لیے اچھے نہیں لگتے کیونکہ تم انہیں دیکھتی نہیں ہو، دیکھو گی تو بس انہی کی ہو جاؤ گی۔'' اب کی بار مینا کو طٰہٰ کے الفاظ بھی پسند نہیں آئے۔

''کافی Exposing ہوتے ہیں۔'' مینا کے منہ سے بس چند الفاظ ہی نکلے تھے۔

''لو بھئی چند ایک کے علاوہ باقی سارے چینل اچھے ہی ہیں۔'' مینا بس چپ کر گئی۔ وہ اس موضوع پر گفتگو ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

میکے میں تو وہ اب تک اینٹینا لگائے پی ٹی وی ہی دیکھتے تھے۔ یہاں تک کہ پی ٹی وی کو بھی اسٹیبلش کر کے پی ٹی وی ہوم کا درجہ دے دیا گیا تھا، لیکن ان کے گھر آج بھی آٹھ بجے آنے والے ڈرامے کے علاوہ ٹی وی بمشکل ہی دیکھا جاتا تھا۔

طٰہٰ شاید ابھی مختلف چینلز کی وکالت میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس نے مینا کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر رقم تحریر پڑھنے میں اسے دقت نہیں ہوئی۔

''اوہ...... تمہیں برا لگا۔'' وہ مینا کے قریب ہو گیا۔ ''سوری شاید تمہیں میری بات نے اِن ڈائریکٹلی ہرٹ کیا ہے۔'' طٰہٰ کافی معذرت لیے ہوئے تھا۔ مینا نے سر جھکا لیا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔'' طٰہٰ کو بے چینی سی ہونے لگی تھی۔ مینا نے اسے کئی بار اپنے گھر والوں اور اپنے مذہبی لگاؤ کے بارے میں بتایا تھا۔ اور یقیناً ان کے لیے ٹی وی دیکھنا ایک عیب ہی تھا۔

بے چینی بڑھنے لگی تھی۔ چند لمحوں میں اس نے اپنی محبوبہ کو ہرٹ کر دیا تھا۔ وہ بھی ایک گھٹیا سے موضوع پر...... 'کیا کروں؟' مینا کا جھکا ہوا سر اسے مزید شرمندہ کرتا جا رہا تھا اور دل بھی بے سکون ہوا جا رہا تھا۔

'کچھ غلط تو نہیں کہہ رہے تھے وہ، یونیورسٹی میں بھی تو کس قدر لڑکیاں ٹی وی چینلز، ٹی وی پروگراموں پر باتیں کرتی تھیں، اور اب اگر ہم لوگ صرف پی ٹی وی دیکھتے ہیں تو الگ بات ہے جبکہ طٰہٰ نے دیگر چینلز کے بارے میں تھوڑی سی بات کہہ دی تو میں بھی سر جھکا کر بیٹھ گئی ہوں۔ وہ بھی تشویش میں مبتلا ہو گئے ہوں گے۔' یہ سوچتے ہی مینا نے طٰہٰ کی طرف دیکھا۔ طٰہٰ کے ماتھے پر تشویش کی پرچھائیں واضح نظر آ رہی تھی، جسے دیکھ کر مینا اپنی جگہ قدرے شرمندہ سی ہو گئی تھی۔

مینا کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے طٰہٰ کو کچھ ڈھارس ہوئی۔ اس نے اپنے دونوں کان پکڑ لیے۔

''سوری۔'' اور مینا کو ہنسی آ گئی۔

''یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟'' مینا نے طٰہٰ کے ہاتھوں کو نیچے کیا۔ پھر اپنے ہاتھوں پر طٰہٰ کی گرفت دیکھ کر اس نے اپنے ہاتھ نہیں کھینچے۔

اب اس کے ہاتھ طٰہٰ کی گود میں پڑے تھے۔ مینا کے ہاتھوں پر طٰہٰ نے اپنے ہاتھ جمائے ہوئے تھے۔ طٰہٰ مینا کو دیکھ رہا تھا۔ انداز قدرے معذرت لیے ہوئے تھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں، مجھے ایسا لگا کہ آپ تمسخر اڑا رہے ہیں تو بس...... لیکن مجھے غلط محسوس ہوا تھا۔ آپ واقعی ٹھیک کہہ رہے تھے۔ بس اصل میں یہ ہوتا

ہے نا کہ بعض اوقات انسان کوئی بات سمجھ نہیں پاتا بس پھر اس لیے...... لیکن آپ نے کچھ غلط بھی نہیں کہا۔'' مینا نے کہا تھا۔
طٰہٰ مینا کو ہی دیکھ رہا تھا۔ طٰہٰ کی نگاہوں میں تپش تھی۔ مینا پہلے نروس ہوتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی، لیکن جب طٰہٰ اسے دیکھے گیا تو اس نے نظریں جھکا لیں۔
''تم میری باتوں سے ہرٹ ہوئیں۔'' طٰہٰ کے لہجے میں محبت تھی۔
مینا کو کچھ فخر محسوس ہوا کہ ایک نہایت معمولی سی بات پر طٰہٰ کتنا ایموشنل ہو رہا تھا۔
''نہیں۔'' مینا نے جھوٹ بولنے میں مضائقہ محسوس نہیں کیا تھا۔
حالانکہ اسے طٰہٰ کی بات بری لگی تھی، لیکن طٰہٰ کے معذرت لیے ہوئے بے قرار انداز اور بار بار سوری کرنے پر اس نے جھوٹ بول دیا۔
''معمولی بات ایشو بنتی جا رہی ہے۔'' مینا نے سوچا تھا۔
''آپ بھی بس خواہ مخواہ پریشان ہوئے جا رہے ہیں، کچھ نہیں ہوا۔'' مینا نادم ہونے لگی۔
''مینا تمہیں نہیں معلوم کہ تم میرے لیے کیا ہو، روز بروز تمہاری چاہت بڑھتی جا رہی ہے۔ جب ہماری شادی ہوئی تھی، مجھے تم سے محبت تھی، لیکن اب محبت نہیں کچھ اور چیز ہے۔ بس میں چاہتا ہوں تمہیں ہر وقت خوش رکھوں۔'' مینا کے ہاتھوں پر طٰہٰ کی گرفت بڑھ گئی تھی۔ مینا کو کافی خوشی محسوس ہوئی تھی۔ اسے بہت اچھا لگا تھا یہ سن کر۔
''اچھا تو اب خواہ مخواہ پریشان نہ ہوں۔ میں نے کہا نا کہ کوئی بات نہیں۔''
پھر کافی دیر اسی طرح بیٹھے گزر گئی۔ طٰہٰ مینا کے نقش دیکھتا رہا اور مینا بلش ہوتی رہی۔
''مینا تم واقعی بہت خوبصورت ہو۔'' طٰہٰ نے کہا تھا۔
''شکر ہے اتنی دیر دیکھنے کے بعد آپ کسی نتیجے پر تو پہنچ گئے۔'' مینا نے جھینپتے ہوئے کہا تھا۔ طٰہٰ کو ہنسی آ گئی۔ وہ ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مینا نے کہہ دیا۔
''چائے لاؤں آپ کے لیے۔''
''تمہیں نہ دیکھوں؟'' طٰہٰ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔
''نہیں کچھ دیر بعد پھر آپ کوئی ایسا ہی نتیجہ اخذ کر لیں گے۔''
''تو اچھا ہے نا۔''
''اور اگر اس بار آپ نے الٹ نتیجہ نکالا تو......''
''تو پھر وہ درست نتیجہ ہوگا اور تم اسے حرفِ آخر سمجھنا......'' مینا مسکرا دی۔
''اسی لیے تو چاہ رہی ہوں کہ یہاں سے ہٹ جاؤں۔'' یہ کہہ کر مینا نے اپنے ہاتھ چھڑا لیے۔ طٰہٰ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔
''ویسے تمہارے ساتھ بیٹھنے کا مجھے ایک نقصان ہے۔'' مینا دروازے کے پاس تھی، جب اس نے طٰہٰ کی آواز سنی۔
''کیا نقصان ہے؟'' مینا کو اندازہ تھا کہ اب کوئی اوٹ پٹانگ سا جواب ملے گا۔
''ہنس ہنس کر اور مسکرا مسکرا کر میرے تو جبڑے تھک جاتے ہیں۔''
''چلیں پھر آئندہ نہیں بیٹھوں گی آپ کے پاس۔'' مینا نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا تھا۔
''وعدہ تو کرتی جاؤ۔'' پیچھے سے مینا کو طٰہٰ کی آواز سنائی دی۔ مینا کے چہرے پر ایک بار پھر مسکراہٹ آ گئی تھی۔
کچن میں جا کر مینا نے باؤل میں پانی بھر کر اس میں پتی ڈالی اور چولہے پر رکھ دیا۔ اور طٰہٰ کے ساتھ

ہونے والی گفتگو اپنے ذہن میں دھرانے لگی۔
چائے بنانے کے دوران وہ یہی سوچتی رہی، یہاں تک کہ چائے اس نے کپ میں انڈیل لی اور طٰہٰ کے پاس لے آئی اور ایک کپ چائے طٰہٰ کو دینے کے بعد وہ بھی کپ لے کر طٰہٰ کے ساتھ بیٹھ گئی۔

''طٰہٰ! وہ میں چاہ رہی تھی کہ ہم دو تو بندے ہیں۔ رضیہ خالہ کافی ہیں ہمارے لیے۔ اس کے علاوہ مجھے گھر کا کام کرنا اچھا بھی لگتا ہے اس لیے، سلمٰی کو فارغ کر دیں۔'' کافی سوچ بچار کے بعد مینا نے طٰہٰ سے کہا تھا۔

طٰہٰ نے ایک نظر مینا کو دیکھا اور چپ چاپ چائے کی چسکی لی۔ اسے یہ سُن کر اچھا لگا۔

''اصل میں میں اپنے گھر کا کام خود کرنا چاہتی ہوں۔ ویسے بھی کام کرنے میں حرج کیا ہے؟'' طٰہٰ کے سپاٹ تاثرات سے مینا کو لگا وہ نہیں مانے گا۔

''لیکن اتنے سارے کام کیسے کرو گی، ڈسٹنگ وغیرہ......'' طٰہٰ نے ابھی بھی اپنے تاثرات سپاٹ رکھے تھے۔

''ڈسٹنگ، برتن دھونا یا جھاڑو دینا جیسے کام خالہ رضیہ کرلیں گی اور باقی کام میں کرلوں گی۔ ویسے یہ ڈسٹنگ وغیرہ کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں، میکے میں بھی تو کرتی تھی۔''

مینا سلمٰی کو فارغ کرنے کے بارے میں کافی سوچ چکی تھی اور حتمی سوچ کے بعد اس نے رات وہی فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ طٰہٰ سے بات کرے گی۔

''پھر تو اچھی بات ہے، سلمٰی کو کہہ دینا کہ اگلے مہینے سے وہ نہ آئے لیکن دیکھ لو اگر تم اسکول یا کوئی وومن کلب جوائن کرلو تو وہ بھی اچھا ہے۔'' چائے ختم ہوگئی تھی اور طٰہٰ نے کپ سامنے ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

''نہیں، نہیں مجھے ٹیچنگ یا کسی وومن کلب میں کوئی دلچسپی نہیں، بس گھر کے کام صحیح ہیں۔ ویسے فرزانہ آپا کے پاس آتی جاتی رہوں گی اور آپ بھی تو شام کو آجاتے ہیں۔''

''چلو جیسے تمہاری مرضی۔''

''ویسے مجھے یہ جان کر بہت اچھا لگا کہ تم گھر کے کام خود کرنا چاہتی ہو۔'' طٰہٰ نے مسکرا کر کہا تو مینا کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ کھل گئی۔

☆......☆......☆

بھرا پرا اسرال......

گھر بہت بڑا تھا لیکن لوگوں کی تعداد کے حساب سے چھوٹا تھا۔ گھر کے تین پورشن تھے۔ دائیں طرف والا پورشن اکرم صاحب کا تھا۔ جہاں نینا بیاہ کر آئی تھی۔ عاشر کے چار بہن بھائی تھے۔ سب سے بڑا عاشر تھا۔ پورشن کے چار کمرے تھے جن میں سے ایک تو نینا اور عاشر کے پاس آگیا۔ دوسرا کمرہ زاہدہ اور اکرم صاحب کے پاس، تیسرا کمرہ حاشر اور ہاشم کے پاس تھا۔

دونوں لڑکے کنوارے تھے۔ حاشر کی ابھی اسٹڈی ہی کمپلیٹ نہیں ہوئی تھی، جبکہ ہاشم جاب کرتا تھا اور یہی کمرہ بوقتِ ضرور ڈرائنگ روم یا گیسٹ روم کے لیے بھی استعمال ہو جاتا تھا۔ نینا کے آنے سے پہلے تو وہ عاشر کے ساتھ بھی مل کر کمرہ شیئر کر لیتے تھے۔ لیکن اب تو یہ ممکن نہیں تھا۔

چوتھا کمرہ ثمن کے پاس تھا۔ اس کمرے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ڈربہ نما تھا۔ یہ کمرہ کوریڈور کے کونے میں تھا جو کہ بیک وقت اسٹور بھی تھا۔ دائیں طرف بڑی بڑی پیٹی اور اس کے اوپر پڑا ایک بڑا سا بریف کیس اور پھر اس کے دائیں طرف دائیں دیوار کے پاس اوپر نیچے پڑے تین اور ٹرنک تھے۔ ان ٹرنک کے متضاد دیوار کے ساتھ ایک الماری تھی جو کہ ثمن کے زیر استعمال تھی۔ ایک طرف اس کے ہینگ کیے ہوئے کپڑے تو

دوسری اس کے استعمال کی دوسری چیزیں......اور پھر ایک کونے میں ایک سنگل بیڈ اور بیڈ کی پائنتی سے کچھ فاصلے پر پڑی دو کرسیاں، ثمن کا کمرہ کچھ عجیب لبوترا سا تھا اور کچھ اس کمرے کا سامان اسے عجیب بنا رہا تھا۔ بائیں طرف والا پورشن عاشر کے تایا ابو کا تھا۔ ان کے پانچ بچے تھے۔ اوپر تلے تین بیٹیاں پھر بیٹا اور پھر ایک بیٹی تھی۔

تایا ابو کا پورشن بھی بالکل ویسا ہی تھا جیسے اکرم صاحب کا تھا، لیکن انہیں تنگی شاید اس لیے نہیں ہوتی تھی کہ ایک تو دو بیٹیاں بیاہی ہوئی تھیں، باقی دو مریم اور سمیعہ ایک روم شیئر کر لیتی تھیں۔ ایک روم حارث کے پاس تھا۔ اوپر والا پورشن چھوٹی پھوپو کے پاس تھا۔ وہ جوانی کے آخری دہانے پر بیوہ ہو کر یہاں آئی تھیں، دو بیٹیوں اور ایک بیٹی کے ساتھ۔ جب تک ماں باپ زندہ تھے ان کے ساتھ رہیں اور پھر ان کی یکے بعد دیگرے وفات کے بعد وہ اوپر علیحدہ ہو گئی تھیں۔

اوپر دو کمرے تھے ایک پھوپو اور رائمہ کے استعمال میں اور دوسرا حسن اور یاسر استعمال کرتے تھے، اس لیے آنے والی تیسری نسل کے لیے یہ گھر ناکافی ترین تھا۔ کھانا پینا بلاشبہ سب کا الگ تھا، لیکن شام کی چائے سب اکٹھے ہی پیتے تھے، جو عموماً نیچے صحن میں پی جاتی تھی۔

عاشر کی شادی کے بعد نینا کا اس گھر میں اضافہ ہوا تھا، ویسے چند سالوں تک وہ فیصلہ کن گھڑی آ جانی تھی، جب کم از کم ایک فیملی نے یہاں سے چلے جانا تھا۔

اکرم صاحب اور کلیم صاحب نے تو سفید پوشی میں زندگی گزار دی۔ کبھی گھر کے اخراجات بڑھ جاتے تو کبھی بچوں کی پڑھائیوں کے اخراجات اور پھر بہن کی۔ "بوجھ نما ذمے داری۔"

زاہدہ اور نفیسہ کو شور شرابے کی نہ عادت تھی اور نہ ہی ضرورت۔ نفیسہ نے اگر رخسانہ کا استقبال کھلی بانہوں کے ساتھ کیا تھا تو زاہدہ کے ماتھے پر بھی بل نہیں آئے تھے۔ دونوں بھائیوں کے لیے بہن کے بچوں کی نسبت ان کی پہلی ترجیح اپنے بیوی بچے تھے، لیکن پھر بھی بہن کی ہتھیلی پر چند ہزار ضرور رکھتے تھے۔ بچے چھوٹے تھے تو اس وقت ہی رخسانہ نے سوچ لیا تھا کہ بچوں کو پڑھاؤں گی۔ اسی لیے اسی وقت سے کڑھائی کرنا شروع کر دی تھی۔ پھر کچھ پیسے حسن اور یاسر کے والد کی پنشن کے بھی آ جاتے تھے، اور آج حسن ڈاکٹر تھا تو یاسر کالج میں لیکچرار تھا۔

رخسانہ کے ساتھ پہلے بھائیوں کا رشتہ نارمل تھا تو اب کافی اچھا ہو گیا تھا۔ آخر دونوں بیٹی والے تھے۔ دوسری طرف (کلیم صاحب کا بیٹا) حارث ایک بینک منیجر تھا۔

گھر کا ماحول کافی اچھا تھا نہ بڑوں میں کوئی رنجش نہ چھوٹوں میں کوئی مسئلہ......بس مسئلہ تھا تو اگلی کالونی میں رہنے والی خدیجہ پھوپو اور ان کے بچوں کا تھا۔

بلاشبہ اس بھرے پرے گھر میں پہلے بھی معاشی حالات کوئی گئے گزرے نہ تھے۔ تینوں گھرانوں کے بچے پڑھ لکھ کر اچھا مقام حاصل کر چکے تھے اور اب وقت تھا کہ وہ کچھ کریں، سو سب اپنی اپنی جگہ کوششیں کر رہے تھے، لیکن خدیجہ پھوپو کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ بہت امیر تھیں۔ سسرال تو سارا بہت امیر تھا، بلکہ ان سے دو ہاتھ آگے تھا، اس لیے وہاں دال نہ گلتی تھی اور پھر اپنی شو باز فطرت سے مجبور ہو کر انہیں ایک ہی گھر ملتا تھا اور وہ تھا ان کے بھائیوں کا گھر جسے وہ میکہ گرداننا اپنی توہین سمجھتی تھیں، لیکن پھر بھی آتی جاتی رہتی تھیں۔

اور پھر ان کی بیٹیاں نیلوفر اور ریحانہ اپنی ماں

سے بھی بڑھ کر تھیں۔ ان کی فطرت آتش کی طرح تھی، بالکل جھلسا دینے والی...... ان کا بس چلتا تو ہر بندے کی زندگی میں زہر گھول دیتیں۔ بہت زیادہ اذیت پسند، شوباز اور اس کے ساتھ ایک خوبی بونس میں تھی اور وہ تھی چرب زبانی۔

اکرم صاحب اور کلیم صاحب تو کبھی اپنی بہن خدیجہ کو سمجھ نہ سکے کجا ان کی بیٹیوں کو سمجھتے...... لیکن رخسانہ اور زاہدہ کافی محتاط ہی رہی تھیں، البتہ گھر میں موجود لڑکیاں ثمن، رائمہ، سمیعہ اور مریم ان دو بہنوں کے سامنے ڈٹ کر مقابلہ کرتی تھیں۔ ریحانہ نے تو انٹر میں ہی جان چھڑائی تھی، البتہ چھوٹی نیلوفر نے گرتے پڑتے بمشکل گریجویشن کیا تھا، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ اس بات پر ناز اں نہیں ہوسکتی تھی، کیونکہ رائمہ نے ماسٹرز کیا ہوا تھا اور ثمن اور سمیعہ نے گریجویشن اور اس سے اچھے گریڈز کے ساتھ، البتہ مریم کافی چھوٹی تھی اور وہ ابھی میٹرک میں تھی، لیکن ان کے پاس شو مارنے کے لیے اور بھی بہت سی چیزیں تھیں، خصوصاً ان کا ہائی اسٹیٹس، ان کے ہائی کوالٹی امپورٹڈ کپڑے، جوتے اور نت نئے فیشن......

اگر کوئی ان کو نیچا دکھانے یا ان کا چہرہ دکھانے کی کوشش کرتا تو وہ مردانہ انداز میں اونچی آواز میں بولنے لگتیں۔ اس لیے سب بچ کر رہتے...... اور اسی طرح وہ خود ہی میاں مٹھو بھی بنتی رہتیں۔

نیلوفر عاشر پر 'دل سے مرتی' تھی، لیکن اس نے جب عاشر سے ڈائریکٹ بات کی تو عاشر نے دوٹوک انکار کردیا تھا اور جب عاشر کی نینا سے شادی ہونے لگی تو نیلوفر کو 'دل مار کر' چپ رہنا پڑا، لیکن اپنی طبیعت کی وجہ سے وہ زیادہ عرصہ چپ کر کے نہ بیٹھ سکی، اسی لیے اس نے پہلی رات ہی نینا کے سامنے معصوم بننے کی کوشش کی تھی، جس میں بری طرح ناکام رہی تھی۔

مگر اب بھی وہ بات بھولنے والی نہیں تھی۔ نینا نے اس کے 'حق' پر ڈاکہ مارا تھا اور اس نے اس کا بدلہ نینا سے لے کر رہنا تھا۔

☆......☆......☆

مکلاوے کے بعد ہی نینا نے کچن میں قدم رکھنے کی کوشش کی تھی، لیکن زاہدہ نے اسے منع کردیا تھا۔

''ایسے ہی اپنی پہلی بہو کو کام میں لگا دوں۔ میں تو باقاعدہ رسم کروں گی۔ پہلے خاندان بھر کو کھیر کھلائے گی میری بہو اور پھر ہی کچن کے کام کرے گی۔'' زاہدہ نے بڑے مان سے کہا تھا۔

بس پھر کیا تھا، تمام گھرانوں کو دعوت دے دی گئی تھی کہ پرسوں نینا کا کھیر میں ڈال ڈلوار ہے ہیں۔ ہاتھ تایا ابو اور ان کی فیملی، چھوٹی پھوپو اور ان کی فیملی کے علاوہ 'عزیز از جان' خدیجہ پھوپو اور ان کی بیٹیاں۔ پوری دعوت کا اہتمام تھا اور اس دعوت میں نینا کے ساتھ رائمہ، ثمن اور سمیعہ نے برابر کا ہاتھ بٹایا تھا۔

قورمہ، بیف پلاؤ، رس ملائی اور کھیر دعوت کا حصہ تھیں۔ رائمہ، ثمن اور سمیعہ نے قورمہ اور بیف پلاؤ تیار کرلیے، البتہ میٹھا مکمل طور پر نینا نے تیار کیا تھا، سب چیزیں زبردست تھیں سوائے کھیر کے۔

اس قدر میٹھا، اس قدر میٹھا کہ ایک چمچ سے زیادہ کسی سے نہ لیا جاسکا۔ زاہدہ نے شکوہ بھری نظروں سے نینا کو دیکھا تھا۔ پہلے تو نینا کو سمجھ نہ آیا، لیکن پھر کھیر کا ایک چمچ لینے کے بعد اسے پتا چل گیا، لیکن ساتھ ساتھ اس کا سر بھی چکرانے لگا تھا۔

اس قدر میٹھا...... اسے یقین ہی نہ آیا تھا۔ کھیر پکنے کے بعد میٹھا اس نے اور باقی لڑکیوں نے بھی چکھا تھا، بالکل مناسب تھا لیکن اب......

خدیجہ پھوپو کو نادر موقع مل گیا تھا، اسے ہاتھ

سے کیوں کر جانے دیتیں۔

"بھابی برا مت ماننا، تم تو پھوہڑ بھولے آئیں، تم خود سمجھ دار تھیں، کم از کم خاندان کے سامنے ہی اپنی لاج رکھ لیتیں۔ لازمی اسی سے کھیر پکوانا تھی، بیٹی سے پکوا کر اس کا نام کر دیتیں، ہم بھلا کون سا پوچھتے؟" خدیجہ نے بھاوج کو لتاڑنا شروع کر دیا تھا۔ آخر ایسے مواقع کم کم ہی آتے تھے نا اس لیے۔"

"ایسے عام سے کھانے تو ہم روز ہی کھاتے ہیں۔ میں تو بس اسی کھیر کے چکر میں آئی تھی۔ چلو بہو ہے ہماری سوچا تھا اس کے ہاتھ کے ذائقے سے بھی آشنا ہو جائیں گے۔ لیکن یہاں تو......" اب کی بار اکرم صاحب کو بھی برا لگا تھا اور انہیں سبکی کا احساس بھی ہوا تھا۔

چھوٹی پھوپو نے ہمیشہ کی طرح خدیجہ پھوپو کو تنبیہہ نما شکایتی نظروں سے دیکھا تھا اور جسے خدیجہ پھوپو ہمیشہ کی طرح نظر انداز کر گئی تھیں۔

"اور تمہیں ماں باپ نے کچھ نہیں سکھایا تھا کیا؟ ہاں سوتیلے ماں باپ ہیں نا، وہی ظلم کرتے رہے ہوں گے۔" انہوں نے نینا کو مخاطب کیا تھا۔ اس بار سب نے ناپسندیدہ نگاہوں سے خدیجہ پھوپو کو دیکھا تھا اور نینا جو پہلے ہی شرمندہ ہو رہی تھی، ایک دم ذلت کے احساس نے اسے سرخ کر ڈالا تھا۔

"آ...... آپ میرے والدین کو کچھ نہ کہیں۔" نینا نے ضبط سے کام لیتے ہوئے بمشکل کہا تھا۔ ساتھ بیٹھے عاشر نے نینا کو اتنا کہنے سے بھی باز رکھنے کی کوشش کی تھی، لیکن ناکام رہا تھا۔

خدیجہ پھوپو قورمے سے لقمہ لے رہی تھیں، ابھی منہ تک نہیں پہنچا تھا کہ انہیں نینا کا فقرہ سنائی دیا۔ نوالہ انہوں نے واپس قورمے کی پلیٹ میں پٹخ دیا۔

"چھٹانک بھر کی لڑکی، زبان درازی کرتی ہے مجھ سے۔ بھابی تمہاری بہو تو بدمزاج بھی ہے۔ ابھی اسے آئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں اور مجھ سے بدتمیزی کرتی ہے۔" خدیجہ پھوپو اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

نینا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور گھر کے تمام افراد بوکھلا گئے، لیکن ینگ جنریشن آرام سے کھانا کھانے میں مصروف رہی، سوائے عاشر کے......

"ارے آپا ٹھہریں! کہاں جا رہی ہیں آپ؟" اکرم صاحب نے بوکھلاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ اُٹھ کر بہن کے پاس آ گئے تھے۔

"مجھے اس گھر میں نہیں ٹھہرنا، جہاں مجھے بے عزت کیا جاتا ہو۔ جا رہی ہوں میں۔" خدیجہ پھوپو نے ٹھونک بجا کر کہا تھا اور ان کی آواز بھی اونچی تھی۔

نیلوفر نے رس ملائی کا ایک بڑا سا چمچ بھرا اور منہ میں ڈالتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"رس ملائی واقعی بہت اچھی بنی ہوئی ہے۔" کھڑے ہوتے ہوئے نیلوفر نے سوچا تھا۔ ریحانہ تو پہلے ہی ماں کے ساتھ کھڑی تھی۔

گھر کے تمام بڑے افراد خدیجہ پھوپو کے قریب 'جمع' ہو چکے تھے اور باری باری انہیں بیٹھنے کا کہہ رہے تھے، لیکن وہ اس قدر اونچی آواز میں بول رہی تھیں کہ باقی سب کی آواز تو بس دب رہی تھی۔

"بس بھابی بہت ہو گیا، عزت دار لوگ ہیں ہم۔ ایسے ہی بہو سے بے عزتی کروانی تھی تو بلوایا کیوں تھا......" خدیجہ نے زاہدہ سے کہا تھا۔

"آپا رہنے دیں۔ بچی ہے، سمجھ نہیں ہے اسے۔" اکرم صاحب نے ملتجی لہجے میں کہا تھا۔ نینا اور عاشر بھی بس کچھ ہی فاصلے پر کھڑے تھے۔ جب عاشر نے ملتجی لہجے میں نینا کو سوری کرنے کے لیے کہا تھا۔ نینا بھی صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور اسے بھی لفظی معذرت کرنا ہی بہتر لگا تھا۔ اسی لیے وہ آگے بڑھی تھی۔

"آپ کو بچی لگتی ہے، شادی ہو گئی ہے اس کی۔

بس یہ ماں کا اثر ہوگا۔ چلو باپ تو پھر بھی سوتیلا تھا۔''
نینا ایک دم سُن ہوگئی۔ ایک بار پھر وہ شدید غصے کی لپیٹ میں آگئی تھی۔
''یہ آپ ہر بات میں میرے ماں باپ کو کیوں گھسیٹ رہی ہیں۔ آپ کو کوئی حق نہیں ہے انہیں برا بھلا کہنے کا۔'' نینا کی آواز کپکپا رہی تھی۔
''لو دیکھو کیسے لڑنے کو آگے بڑھی ہے۔ ہاں بھئی ہم جانتے ہیں یہ تمہارا گھر ہے۔ اسی لیے جا رہی ہوں۔ آئندہ مر کر بھی یہاں نہیں آؤں گی۔ جسے ملنا ہو وہ خود آ کر مل لے گا مجھ سے، ویسے بھی میں اس لڑکی کا منہ نہ دیکھوں۔'' خدیجہ نے اونچی آواز میں کہا تھا، لیکن شاید ابھی انہوں نے مزید سنانا تھا، اس لیے اپنی جگہ سے نہیں ہٹی تھیں۔
''آپ......'' نینا کچھ کہہ نہ سکی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور وہ آنکھوں کو پونچھتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔
''دیکھو کیسی سینہ زور ہے۔ آگ لگا کر چلی گئی اپنے کمرے میں۔ اور تم سب گونگوں کی طرح کھڑے ہی رہ گئے تھے تم سب کی غلطی ہے اس میں۔'' خدیجہ کی بات سن کر کلیم صاحب سٹپٹا گئے۔ پاس کھڑی نفیسہ خدیجہ کے جانے کا انتظار کر رہی تھیں۔ اکرم صاحب اور زاہدہ بوکھلائے ہوئے تھے، جبکہ چھوٹی پھوپو کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح بہن کو ٹھنڈا کریں، البتہ ان کے چہرے پر تشویش کے آثار ضرور تھے۔ اور پاس کھڑا عاشر اس کشمکش و پیچ میں تھا کہ یہاں کھڑا رہے یا پھر نینا کے پاس چلا جائے اور اس کی یہ مشکل حارث نے حل کر دی۔
''پھوپو کی عادت کا تمہیں پتا تو ہے، خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا رہی ہیں۔ تم بھابی کے پاس جاؤ۔'' حارث نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔ عاشر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا، لیکن پھر جانے کیا سوچ آئی کہ کچھ کہے بغیر چپ چاپ اپنے کمرے کی طرف جانے کے لیے مڑ گیا۔
پیچھے اسے خدیجہ پھوپو کی آواز سنائی دی تھی جس میں وہ اسے ''جورو کا غلام'' کہتے ہوئے اس کے اس طرح جانے کو لتاڑ رہی تھیں۔
''مزہ آ گیا، ہنگامہ تو میری توقع سے بڑھ کر ہو گیا ہے، بے چاری نینا......'' پھوپو کے بغل میں کھڑی نیلوفر نے سوچا تھا۔
کچھ دیر خدیجہ پھوپو کھڑی بھڑاس نکالتی رہیں اور پھر سب کے روکنے کے باوجود نہ رکیں اور آگے پیچھے بیٹیوں کو لگائے بڑبڑاتے ہوئے چلی گئیں۔
اس وقت ثمن نے نیلوفر کے چہرے کو غور سے دیکھا تھا۔ ثمن کو اپنی طرف دیکھتے پا کر نیلوفر نے مصنوعی مسکراہٹ کے لیے اپنے ہونٹ پھیلا دیے اور اثبات میں سر بھی ہلا دیا تھا۔ ثمن کا اندازہ صحیح نکلا تھا۔

☆......☆......☆

عاشر جب کمرے میں داخل ہوا تھا تو اس وقت نینا بیڈ پر سر جھکائے بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ عاشر اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے اس نے نینا کو دیکھا تھا اور پھر اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گیا۔
''اپنے قیمتی آنسو ضائع مت کرو۔'' عاشر نے نینا کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا تھا۔
نینا نے سر اُٹھا کر عاشر کو دیکھا تھا۔ عاشر کی آنکھوں میں ملائمت بھرا پیار تھا۔
''میں نے کھیر میں میٹھا صحیح ڈالا تھا، ہم سب نے چکھا بھی تھا......''
''مجھے پتا ہے یہ سب نیلوفر کی کارستانی ہے۔'' عاشر نے نینا کی بات کاٹی تھی۔
''نیلوفر......'' نینا کو قدرے حیرت ہوئی تھی۔
''ہاں نیلوفر کی بس عادت ہے۔ چھوڑو تم۔''

عاشر یہ کہتے ہی اُٹھ گیا اور کمرے میں موجود واٹر ڈسپنسر سے پانی بھر کر لایا اور نینا کو تھما دیا۔ رونے کی وجہ سے اسے اب آہستہ آہستہ ہچکیاں آ رہی تھیں۔ نینا گلاس کو ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی۔

''پھوپو بھی امی اور ابو کو......'' نینا نے کہنے کی کوشش کی تھی لیکن ہچکیوں کی وجہ سے وہ بس اتنا ہی کہہ سکی تھی۔

''بس چھوڑو تم۔ پھوپو کی بھی ہر کسی کو برا بھلا کہنے کی عادت ہے، تم اسے دل پر مت لو۔ بزرگ ہیں ہماری وہ......بس کیا کہہ سکتے ہیں ہم۔ تم پانی تو پیو۔'' نینا نے تھوڑے وقفے سے پانی پینا شروع کر دیا۔

''اور امی ابو......وہ کیا کہیں گے۔''

''کچھ نہیں کہتے، امی کو تو کھیر میں اس قدر میٹھا ہونے کی وجہ خود بخود پتا چل جائے گی اور دیکھنا کل تک ابو بھی اس بات کو بھول چکے ہوں گے اور باقی چچی اور چھوٹی پھوپو کو بھی خدیجہ پھوپو کے مزاج کا پتا ہے۔ اس لیے تم بالکل ٹینشن نہ لو۔'' عاشر نے دھیمے لہجے میں اسے فکر نہ کرنے کی تاکید کی تھی۔

نینا کچھ لمحے ہونٹ کاٹتی رہی پھر اس نے پوچھا۔

''لیکن آپ کو کس طرح پتا چلا کہ نیلوفر نے......''

''مجھے......'' عاشر ہنس دیا۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے شہادت کی انگلی اور انگوٹھے سے نینا کی ناک دبائی تھی جو رونے کی وجہ سے ہلکی ہلکی سرخ ہو رہی تھی۔

''مجھے نیلوفر کے اطمینان سے پتا چل گیا تھا، ویسے بھی کھیر چکھنے سے یہ احساس ہوا کہ کثیر مقدار میں چینی بعد میں ڈالی گئی ہے۔ کتنی ساری تو حل ہی نہیں ہو سکی۔''

''تو پھر یہ بات خدیجہ پھوپو کو پتا نہیں چل رہی تھی کیا......'' نینا کے ذہن میں باہر ہونے والی گفتگو گھوم رہی تھی۔

''ان کی تو بس عادت ہے، تم چھوڑو اسے۔'' عاشر نے اسے ایک بار پھر سمجھایا تھا۔

نینا کچھ دیر یوں ہی خاموش رہی۔ عاشر نینا کی طرف دیکھ رہا تھا جبکہ نینا بیڈ شیٹ کے اس مخصوص حصے میں جانے کیا چیز تلاش کر رہی تھی، جسے وہ مسلسل تکے جا رہی تھی۔

''ویسے انہیں میرے والدین کے بارے میں ایسا......''

''نینا......'' عاشر نے تنبیہی انداز میں ٹوکا تو نینا چپ کر گئی۔ عاشر نینا کے قریب ہو گیا اور اس کا سر اپنے شانے سے ٹکا دیا۔

''خوامخواہ ٹینشن نہ لو۔ کہہ تو رہا ہوں۔ پھوپو کی بس عادت ہی کچھ ایسی ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ سال میں ایک دو بار تو پھوپو ضرور ایسے ہی بلاوجہ واویلا کر کے چپ ہو جاتی ہیں۔'' عاشر نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت رسید کرتے ہوئے اسے سمجھایا تھا۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی اور چند لمحوں بعد زاہدہ اندر داخل ہوئی تھیں۔ ساتھ میں چھوٹی پھوپو اور نفیسہ چچی بھی تھیں۔

''آئیں بیٹھیں آپ لوگ......'' عاشر کھڑا ہوا تھا، جبکہ نینا سر جھکائے بیٹھی رہی تھی۔ اسے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ بلاشبہ عاشر نے اسے کافی ڈھارس دی تھی لیکن پھر بھی......

تینوں خواتین صوفے پر بیٹھ گئیں۔ عاشر نے بھی اب بیڈ پر بیٹھنے کے بجائے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے پڑی چھوٹی ٹیبل پر بیٹھنے کو ترجیح دی تھی۔

زاہدہ کچھ پوچھنے ہی والی تھیں جب چھوٹی پھوپو نے انہیں اشارہ کیا کہ وہ پوچھتی ہیں۔

"بہو...... ابھی ابھی باہر جو ہنگامہ ہوا ہے...... تم برا مت ماننا...... کھیر میں اس قدر میٹھا کیسے ہو گیا کہ وہ بالکل شیرہ محسوس ہو رہی تھی۔" رخسانہ پھوپو نے سلیقے سے بات کی تھی۔

نینا کا دل دھڑک رہا تھا، لیکن اس نے ہمت کر کے جواب دیا۔

"مجھے نہیں پتا، میں نے بعد میں کھیر چکھی بھی تھی، بلکہ ثمن اور رائمہ نے بھی چکھی تھی۔ اس وقت تو میٹھا بالکل صحیح تھا۔"

سامنے بیٹھی خواتین کو ثمن نے باہر بتا دیا تھا کہ کھیر واقعی بالکل پرفیکٹ تھی۔ اور اس نے بلا جھجک خواتین کے سامنے نیلوفر کا نام بھی لے لیا کہ یہ اسی نے کیا ہوگا اور سامنے بیٹھی خواتین کو بھی اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔

"چلو یہ بات تو ٹھیک ہے، رس ملائی بھی کافی اچھی تھی۔ لیکن تمہیں خدیجہ آپا کے سامنے نہیں بولنا چاہیے تھا۔" رخسانہ پھوپو نے کہا تھا۔

جواب میں نینا نے یہ چاہتے ہوئے بھی نہیں پوچھا تھا کہ اسے بولنا کہتے ہیں ...... بلکہ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی تھی اور بہتر بھی یہی تھا۔

"ہاں! رخسانہ کی بات صحیح ہے، تمہیں آپا کے سامنے کچھ نہیں کہنا چاہیے تھا۔" نفیسہ نینا کو وہ بات سمجھا رہی تھی جسے سمجھنے میں انہیں خود بھی کافی عرصہ لگ گیا تھا۔ کچھ دیر وہ خواتین یوں ہی چپ چاپ بیٹھی رہیں۔ موقع ایسا نہیں تھا کہ کچھ کہا جا سکے۔ عاشر بھی چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اب وہ خواتین مزید کچھ نہیں کہیں گی۔

ویسے نینا کی پریشان صورت دیکھ کر نفیسہ کا دل چاہا کہ نینا کو کہیں کہ بس اب فکر کرنے کی ضرورت نہیں، آپا کی عادت ہے لیکن اس طرح کہنا، وہ بھی سب کے سامنے، انہیں مناسب نہیں لگا تھا۔ کچھ دیر یوں ہی بیٹھے رہنے کے بعد وہ خواتین اُٹھ کر جانے کے لیے کھڑی ہو گئیں۔

"ویسے تمہیں احتیاط کرنی چاہیے تھی کہ کسی نے تمہاری غیر موجودگی میں کھیر میں چینی ڈال دی۔" زاہدہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا تھا۔ جو کچھ تھا انہیں نینا سے تھوڑا بہت شکوہ تھا۔ اب ایک آدھ دن اکرم صاحب کا موڈ صحیح نہیں رہنا تھا، خصوصاً اپنی بیوی کے ساتھ......

نینا نے ساس کے الفاظ بھی چپ چاپ سنے تھے۔

پھر نفیسہ، رخسانہ اور زاہدہ آگے پیچھے کمرے سے باہر چلی گئی تھیں۔

☆......☆......☆

مینا نے اب گھر کے کام خود کرنا شروع کر دیے تھے۔ آدھے سے زیادہ کام وہ خود کرتی تھی، جبکہ باقی کام اس نے رضیہ خالہ کے سپرد کر دیے تھے۔ گھر کے بہت سے کام تھے، جنہیں کرتے کرتے وہ آدھی رہ جاتی۔ لیکن پھر بھی اسے بہت اچھا لگتا تھا۔

صبح اُٹھ کر ناشتہ تیار کرنا اور پھر طہٰ کے آفس جانے کے بعد ڈسٹنگ، جھاڑو اور باقی بہت سے کام...... اور پھر شام کو تیار ہو کر طہٰ کا انتظار کرنا۔ رضیہ خالہ برتن دھوتی تھیں، پوچا لگاتی تھیں، اس کے علاوہ روٹیاں بھی پکاتی تھیں۔

مصروف سے دن گزر رہے تھے، اور اسے یہ سب بہت اچھا لگتا تھا اور خصوصاً جب شام کو طہٰ آتا۔

ان دنوں اس نے ایک دو بار ٹی وی دیکھنے کی کوشش کی، لیکن اسے کسی فلم یا ڈرامے میں دلچسپی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

اسی طرح ایک عام سا ہی دن تھا۔ جب مینا دوپہر کے لیے سالن تیار کر رہی تھی۔ سالن وہ دوپہر کو ہی پکا کر رکھ لیتی تھی۔ خود دوپہر میں وہ تھوڑے

سے بسکٹ کھالیتی تھی اور پھر شام کو طٰہ کے آنے کے بعد وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔

وہ کڑھی بنارہی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ شام کو جب طٰہ آئے گا تو کباب بھی بنالے گی اور ابھی ظہر کی نماز کے بعد چائنیز رائس بھی۔ اسی وقت رضیہ خالہ کی قیادت میں اسی کی عمر کی ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

''بیگم صاحبہ یہ ساتھ والے بنگلے سے آئی ہیں۔'' رضیہ خالہ نے مینا سے کہا تھا اور پھر چلی گئیں۔

اس طرح مہمان کو کچن کے اندر لے آنا اسے کچھ معیوب سا لگا تھا۔

''السلام وعلیکم!'' اس لڑکی نے جھکتے ہوئے کہا تھا۔

''وعلیکم السلام!'' مینا نے مسکرا کر کہا تھا۔ ساتھ ساتھ اس نے آنے والی لڑکی کا جائزہ بھی لیا تھا۔ وہ ایک اسمارٹ سی لڑکی تھی۔ شکل و صورت بھی اچھی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ڈھانپا ہوا ٹرے تھا۔

اور اس ٹرے کو دیکھتے ہوئے مینا کو پتا چل گیا تھا کہ رضیہ خالہ کیوں اسے کچن میں لے آئی تھیں۔

''میرا نام ماریہ ہے اور میں ساتھ والے بنگلے سے آئی ہوں۔'' اس لڑکی نے ٹرے شیلف پر رکھ دی تھی۔

''یہ نرگسی کوفتے بنائے تھے میں نے، کافی اچھے بن گئے، لے آئی ہوں۔ اس کے علاوہ امی نے پلاؤ بھی ساتھ دیا ہے۔'' ماریہ کا لہجہ کافی خوشگوار تھا۔

جواباً مینا مسکرا دی۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کس طرح اسے ٹریٹ کرے، بالآخر اس نے چولہے کی آنچ دھیمی کی۔

''آئیں روم میں چلتے ہیں۔''

''نہیں، نہیں، تکلف مت کریں، آپ کھانا پکائیں، میں یہیں بیٹھ جاتی ہوں۔ ماریہ پاس پڑے اسٹول کو کھینچ کر بیٹھ گئی۔ مینا نے آنچ ایک بار پھر تیز کردی۔

''آپ نے اپنا نام تو بتایا نہیں۔؟'' ماریہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

''اوہ...... مینا ہے میرا نام۔'' مینا نے کڑھی میں چمچ ہلاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''اچھا نام ہے۔ کافی Unique سا ہے۔'' ماریہ نے مینا کے نام کے بارے میں رائے بھی پاس کردی۔ اور ماریہ کے اس طرح کہنے پر اسے برسوں پہلے کی وہ بات یاد آگئی جب مینا نے ماں سے اپنا نام اتنا چھوٹا اور رطابہ کا نام اتنا بڑا رکھنے کی وجہ پوچھی تھی۔ ایک مسکراہٹ مینا کے لبوں کو چھوگئی تھی۔

''ویسے کیا کرتی ہیں آپ؟'' اب کی بار مینا نے پوچھا تھا۔

''میں...... میں تو بس فارغ ہی ہوں۔ ویسے ایم اے کے پیپرز دیے ہیں، رزلٹ کا انتظار کررہی ہوں...... گھر کے تھوڑے بہت کام کرلیتی ہوں، ورنہ ٹی وی دیکھ لیا یا گانے سُن لیے یا پھر فیس بک یوز کرلی۔'' ماریہ نے اپنی مصروفیات بتادیں۔

''اور آپ...... آپ کیا کرتی رہتی ہیں؟'' ماریہ نے مینا کا پوچھا ہوا سوال اسی سے پوچھا تھا۔

''بس...... گھر کے کچھ کام کرلیے، کوکنگ خود کرتی ہوں اور اگر دل چاہے تو ڈائجسٹ وغیرہ بھی پڑھ لیتی ہوں۔'' مینا نے فائنل چمچ کڑھی میں پھیرا اور چولہا بند کردیا۔

اب اس میں صرف پکوڑے ڈالنے تھے۔ ساتھ والے برنر پر کڑاہی پڑی ہوئی تھی۔ مینا نے پکوڑے تلنے کے لیے کڑاہی میں تیل انڈیلا اور درمیانی آنچ کردی۔

''میں بھی کسی زمانے میں ڈائجسٹ بہت شوق سے پڑھتی تھی، لیکن اب تو بس ٹی وی دیکھنے کی

عادت ہوگئی ہے، ڈائجسٹ کا تو خیال ہی نہیں آتا۔ آج بھی بڑی اچھی مووی آ رہی ہے، 'بلیک' واقعی ایک شاہکار مووی ہے۔ بندہ تو دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے۔" ماریہ نے بڑے موڈ سے کہا تھا۔

مینا مسکرادی، اسے کسی مووی میں دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی وہ دلچسپی لینا چاہتی تھی۔

"تم بھی دیکھنا، آرٹ مووی ہے، سنجے لیلا نے کمال کر دیا ہے...... تمہیں بھی پسند آئے گی۔" ماریہ شاید اس مووی کے بارے میں کافی ایکسائیٹڈ تھی۔

مینا ہنوز مسکراتی رہی۔

تیل گرم ہو چکا تھا۔ پکوڑوں کے لیے وہ بیسن کا آمیزہ پہلے تیار کر چکی تھی۔ اب وہ آمیزہ چمچ کے ذریعے کڑاہی میں ڈالنے لگی تھی۔

"نہیں...... میں موویز نہیں دیکھتی۔" مینا نے ماریہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

نہیں دیکھتیں تو کیا ہوا......؟ اب دیکھ لو، واقعی بہت اچھی مووی ہے۔" ماریہ نے بھی خواہ مخواہ اصرار کیا۔ شاید یہ مووی اس کی پسندیدہ موویز میں سے تھی اور جو چیز انسان کو پسند ہوتی ہے اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ چیز سب پسند کریں۔ غالباً ماریہ بھی اسی لیے اصرار کر رہی تھی۔

"انڈین ہے؟" مینا نے بھی بس ویسے ہی پوچھ لیا۔ اس کے ذہن میں لگ بھگ دو ہفتے پہلے طٰہٰ سے ٹی وی اور فلموں کے بارے میں ہونے والی گفتگو آئی تھی۔

"ہاں انڈین ہی ہے۔ کیا بتاؤں بس کمال مووی ہے۔" ماریہ نے ساتھ ساتھ ایک بار پھر تعریف کر دی۔

پکوڑے ایک سائیڈ سے سرخ ہو چکے تھے۔ اس لیے مینا نے تمام پکوڑوں کو پلٹ دیا۔ اور ماریہ کی بات پر مسکرادی۔

تھوڑی دیر بعد ماریہ نے ایک بار پھر اس مووی کی تعریف کرتے ہوئے اس ٹی وی چینل کا نام بھی لے لیا، جس پر مووی آنی تھی۔

جب پکوڑے مکمل طور پر تل چکے تو مینا نے انہیں کڑاہی سے نکال لیا اور نصف ایک پلیٹ میں رکھ کر ماریہ کو دیے، جنہیں اس نے بلا تکلف لے لیا۔

"بھائی صاحب کب آتے ہیں؟" ماریہ نے ایک نسبتاً چھوٹا پکوڑا منہ میں ڈالتے ہوئے پوچھا تھا۔

"عصر اور مغرب کے درمیان آتے ہیں۔" مینا نے بیسن کا مزید آمیزہ تیل میں ڈالتے ہوئے کہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ یہ سوچ کر قدرے حیران تھی کہ ان دونوں کی پہلی ملاقات ہونے کے باوجود وہ نہ صرف ماریہ سے بے تکلفی سے گفتگو کر رہی تھی، بلکہ وہ ساتھ ساتھ کام بھی کر رہی تھی۔

"بہت اچھے ہیں تمہارے میاں، میری امی تو میرے بھائیوں کو تمہارے میاں کی ہی مثالیں دیتی ہیں۔" ماریہ نے طٰہٰ کی تعریف کی تھی اور مینا کو یہ سن کر اچھا بھی لگا تھا۔

ماریہ لگ بھگ پانچ دس منٹ مزید وہاں بیٹھی تھی اور مینا سے اس کے میکے کے بارے میں پوچھتی رہی تھی۔ جاتے ہوئے ماریہ نے برتن مانگے تھے، لیکن مینا کو خالی برتن بھیجنا اچھا نہیں لگا تھا، اس لیے اس نے کہا تھا کہ وہ بھجوا دے گی۔

ماریہ کے جانے کے بعد مینا نے ٹرے میں دیکھا تھا۔ نرگسی کوفتے اور پلاؤ اچھی خاصی مقدار میں تھے، اس لیے اس نے چائنیز رائس بنانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

پکوڑے تیار کرنے کے بعد اس نے کچن کے مزید کچھ کام کیے اور واپس کمرے میں آ گئی۔ کمرے میں آ کر اس نے ٹائم دیکھا تو دو بج رہے

تھے۔ اس نے نماز ادا کی۔ نماز ادا کرنے کے بعد وہ کچھ دیر لیٹی آرام کرتی رہی۔ ابھی طٰہٰ کے آنے میں دو ڈھائی گھنٹے رہتے تھے۔

اس نے دراز سے ڈائجسٹ نکالا ہی تھا کہ اس کے ذہن میں ماریہ کا اس موی کو دیکھنے کا اصرار یاد آ گیا۔

مینا مسکرا دی اور ڈائجسٹ کھولنے لگی، لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ لاؤنج میں آ گئی۔ ٹی وی لاؤنج میں ہی پڑا تھا۔

''آخر دیکھوں تو سہی کیا بات ہے کہ سب لوگ بڑے ذوق و شوق سے دیکھتے ہیں۔'' مینا نے یہ سوچتے ہوئے ٹی وی آن کیا۔ اتفاق سے ٹی وی پر وہی موی چینل لگا ہوا تھا۔ جس کا تذکرہ ماریہ کر گئی تھی۔ اور اس پر وہی موی دکھائی بھی جا رہی تھی۔

''ہوسکتا ہے موی Exposing ہو۔'' یہ خیال بھی ذہن میں آیا تھا۔

''بس دو تین منٹ دیکھ کر ٹی وی بند کر دوں گی۔'' مینا نے آخر میں یہی سوچا تھا اور ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

طٰہٰ کی گاڑی خراب ہو گئی تھی۔

''اوہ......اب......'' فیکٹری ٹائم تو کب کا ختم ہو چکا تھا۔

''سر میں آپ کو ڈراپ کرتا جاؤں گا، ویسے بھی آپ کا گھر میرے راستے میں پڑتا ہے۔'' منیجر نے کہا تھا۔

چنانچہ وہ منیجر کے ساتھ آیا تھا۔ منیجر اسے گھر کے گیٹ پر ہی ڈراپ کر گیا تھا۔

اسے بڑے زور کی بھوک لگی ہوئی تھی۔ کڑھی کا، کہا تھا اس نے اور اسے یقین تھا کہ مینا نے ضرور بنائی ہوگی۔ ''مینا میرے لیے قدرت کا ایک انمول تحفہ ہے۔ خدا کا بہت احسان ہے کہ اس نے مجھے مینا جیسی بیوی دی ہے۔'' بیڈروم تک پہنچتے پہنچتے وہ یہی سوچتا رہا تھا۔

آج وہ کافی لیٹ ہو گیا تھا۔ مینا نے بھی ابھی تک کچھ نہیں کھایا ہوگا۔ مینا بھوک کی کچی تھی۔ زیادہ دیر بھوکا رہنا اس سے محال تھا، لیکن وہ طٰہٰ کے انتظار میں کھانا نہیں کھاتی تھی۔ اور یہ بات طٰہٰ کو بہت اچھی لگتی تھی۔

وہ بیڈروم میں جب داخل ہوا تو اس وقت مینا بیڈ پر ٹکی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

''آ گئے آپ۔'' مینا کے لہجے میں کافی بشاشت تھی۔

''ہوں......آج تو کافی تھک گیا ہوں۔ کام ہی بہت تھا۔'' مینا کو دیکھتے ہی اسے یاد آ گیا کہ وہ تو کافی تھکا ہوا ہے۔ ورنہ گیٹ سے بیڈ روم تک آتے ہوئے تو وہ مینا سے ملنے کے لیے کافی پُرجوش تھا۔ روز جب وہ فیکٹری سے آتا تو کافی دیر مینا سے ملنے کی متوقع خوشگواریت اس پر حاوی ہوتی تھی۔ لاڈ اٹھوانے کے لیے مینا کو دیکھتے ہی اسے یاد آ جاتا کہ وہ تو بہت تھک گیا ہے۔ وہ بیڈ پر بیٹھنے کے بجائے نیم دراز انداز میں بیڈ پر لیٹ گیا۔ ٹانگیں بیڈ سے نیچے لٹکی ہوئی تھیں۔ مینا نے پہلے اُٹھ کر اس کا آفس بیگ مطلوبہ جگہ پر رکھا اور پھر اس کے پیروں کے قریب بیٹھ کر جوتے اُتارنے لگی اور یہ وہ وقت تھا جسے طٰہٰ اپنے دن کا بہترین وقت گردانتا تھا۔

شوز اور سوکس اُتارنے کے بعد مینا اس کے پیر سہلانے لگی تھی۔ ایک خوبصورت احساس نے دل کو گھیرے میں لیا تھا۔ طٰہٰ کا دل چاہا کہ وقت یہیں تھم جائے۔ کچھ دیر طٰہٰ کے پاؤں دبانے کے بعد وہ بیڈ پر اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ طٰہٰ کو اب پتا تھا کہ جب تک مینا ہاتھ نہیں دھوئے گی وہ کسی بھی چیز کو ہاتھ نہیں

لگائے گی۔ روزمرہ کے ایک دو سوال پوچھنے کے بعد وہ ہاتھ دھونے چلی گئی۔ ہاتھ دھو کر آنے کے بعد وہ بیڈ پر بالکل آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئی۔

''سر دبا دوں آپ کا......''

''نہیں۔'' یہ کہہ کر طٰہٰ نے اپنا سر مینا کی گود میں رکھ دیا۔ مینا اس کے بال سہلانے لگی۔

ایک خوشگوار احساس، خوشگوار وقت اور الوہی خوشی...... کتنی دیر مینا اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی اور طٰہٰ آنکھیں بند کیے محسوس کرتا رہا اور مینا بالوں میں انگلیاں پھیرنے کے ساتھ ساتھ طٰہٰ کے نقوش بھی دیکھ رہی تھی۔

بڑی بڑی آنکھیں، ستواں ناک اور قدرے پھیلے ہوئے ہونٹ...... طٰہٰ خوش شکل تھا۔ اس کے علاوہ مردانہ وجاہت بھی اُس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

مینا کو اندازہ تھا کہ طٰہٰ اس سے کتنا پیار کرتا ہے اور اسی لیے تو وہ طٰہٰ کا بہت خیال رکھتی تھی۔

کتنی دیر یوں ہی گزر گئی۔ طٰہٰ آنکھیں موندے لیٹا رہا اور مینا اس کے بال سہلاتی رہی۔ پھر مینا کو خیال آیا کہ پیٹ میں چوہے کشتی کر رہے ہیں۔ اگر اسی انداز میں رات بھی ہو جاتی تو بھی طٰہٰ کو احساس نہ ہوتا۔

''چلیں اٹھیں...... کھانا کھالیں۔'' مینا نے بالوں میں انگلیاں پھیرنا بند کر دیں۔

''تھوڑی دیر بعد کھالیں گے۔'' طٰہٰ نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔ ابھی اس کا اٹھنے کا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔

''نہیں پہلے کھانا کھا لیتے ہیں۔ میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ آپ کو بھی یقیناً بھوک لگی ہوگی۔''

بھوک تو واقعی لگی تھی۔ لیکن اٹھنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا پھر مینا کے خیال سے وہ اٹھ گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے تھے۔

''میں نے تو بس کڑھی بنائی ہے...... آپ کی فرمائش پر۔ یہ کوفتے اور پلاؤ ساتھ والے گھر سے آیا ہے۔''

''ساتھ والے گھر سے...... کون سا ساتھ والا گھر......؟'' طٰہٰ نے کڑھی کو اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے پوچھا تھا۔

مینا سوچ میں پڑ گئی۔ ساتھ تو پانچ چھ گھر تھے۔ اب جانے ماریہ کون سے گھر سے آئی تھی۔

''مجھے نہیں پتا، رضیہ خالہ سے پوچھ لیجیے گا۔'' مینا کے جواب پر طٰہٰ مسکرا دیا۔ طٰہٰ نے ایک چمچ کڑھی کا منہ میں ڈالا اور پھر ابھی دوسرا لینے ہی والا تھا کہ ایک سوچ اس کے ذہن میں آئی۔

''اور یہ تم ایک چیئر چھوڑ کر کیوں بیٹھی ہو؟''

چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل تھی جس کے ارد گرد چار کرسیاں پڑی تھیں اور مینا طٰہٰ سے ایک کرسی چھوڑ کر بیٹھی تھی۔ اس طرح وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

''تو کیا پھر آپ کی گود میں آ کر بیٹھوں؟'' مینا اپنے لہجے میں مصنوعی پن لے آئی تھی۔

''ہاں تو اس میں حرج کیا ہے؟'' طٰہٰ نے مینا کے انداز میں کہا تو مینا ٹپٹا گئی۔

''یہاں ساتھ والی چیئر پر آ کر بیٹھو۔'' طٰہٰ کے کہنے پر مینا ساتھ والی چیئر پر آ بیٹھی۔

''میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ مجھے کھانا کھلاؤ۔''

''لیکن مجھے بہت بھوک لگی ہوئی ہے اس لیے آپ مجھے کھانا کھلائیں۔'' مینا نے بھی اسی برجستگی سے کہا تھا۔

''شوہر بیویوں کی خدمت نہیں کرتے۔''

''بالکل...... بیویاں زبردستی خدمت کرواتی ہیں۔'' مینا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔ طٰہٰ بھی

مسکرا دیا اور پھر ایک نوالہ مینا کے منہ میں ڈالا، دوسرا نوالہ خود لیا اور تیسرا نوالا مینا کی طرف بڑھایا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''رضیہ خالہ آگئیں تو کیا سوچیں گی؟'' مینا نے جواز پیش کیا تھا۔

''یہی کہ دونوں میاں بیوی میں کس قدر محبت ہے۔''

''لیکن پھر بھی......''

''چپ کر کے منہ کھولو۔'' اب کی بار طٰہٰ نے ڈپٹ کر کہا تھا۔

مینا نے قدرے تیکھی نظروں سے طٰہٰ کو دیکھا تھا۔

''آپ بھی نا......''

پورا کھانا طٰہٰ نے خود مینا کو کھلایا تھا اور خود بھی کھایا تھا۔

'کتنے اچھے ہیں طٰہٰ۔' مینا نے سوچا تھا۔

'کتنے قیمتی لمحات ہیں...... خدا نے مینا کی صورت میں مجھے واقعی ایک نعمت دی ہے۔ بس اب کسی کی نظر نہ لگے۔' طٰہٰ نے سوچا تھا۔

کھانا کھانے کے دوران ہی مغرب کی اذان ہونے لگی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد مینا نے برتن سمیٹے۔ اتنی دیر میں طٰہٰ نے نماز ادا کر لی۔ مینا کے آنے سے پہلے وہ بس کبھی کبھار کسی کے کہنے پر نماز ادا کر لیتا تھا، لیکن اب کچھ مینا کے کہنے کی وجہ سے اور کچھ مینا کی دیکھا دیکھی وہ تمام نمازیں پڑھنے کی کوشش کرتا تھا، لیکن اکثر اوقات نماز گھر پر ہی پڑھتا تھا۔ مینا کے نماز سے فارغ ہونے کا انتظار کرنے کے لیے وہ واپس وہیں ڈائننگ ٹیبل پر ہی بیٹھا رہا۔

مینا بھی نماز پڑھ کے ڈائننگ ٹیبل پر آ بیٹھی۔

اب انہوں نے حسب معمول ڈھیر ساری باتیں کرنا تھیں۔ بار بار کی دہرائی ہوئی باتیں، وہ روزانہ ہی دلچسپی سے کرتے۔

''کافی دنوں سے امی کے ہاں نہیں گئے۔ اس سنڈے جائیں گے۔''

''رطابہ کے پیپرز ہو رہے ہیں۔ بہت محنتی ہے وہ......''

''سلمٰی کے جانے کے بعد اب میں مصروف رہتی ہوں۔ ویسے بھی مجھے گھر کے کام خود کرنا اچھا لگتا ہے۔''

''فرزانہ آپا کافی دنوں سے نہیں آئیں، میں صبح ہو آئی تھی بہت اچھی ہیں وہ۔''

''فرزانہ آپا نے چھوٹے ببلو کو بھی اسکول داخل کروا لیا ہے۔''

''فرزانہ آپا کہہ رہی تھیں طٰہٰ تو مجھے شادی کے بعد بھول ہی گیا ہے، اسے کہنا آ کر مجھ سے مل جائے۔''

''رضیہ خالہ کو ہمیں خالہ نہیں کہنا چاہیے، دس پندرہ سال ہی تو بڑی ہوں گی، ہم سے۔'' روز ان سے ملتی جلتی باتیں ہوتیں۔ جن میں زیادہ دیر مینا ہی بولتی رہتی اور طٰہٰ مسکراتا رہتا۔ اور یہ سوچتا رہتا کہ مینا کتنی خوبصورت ہے۔ درمیان میں وہ مینا کی باتوں کا بھی جواب دیتا رہتا۔ فیکٹری کی باتیں جان کر مینا کیا کرے گی۔ سو اس لیے وہ کبھی کبھار ہی فیکٹری کی کوئی بات بتاتا، البتہ آج اس نے گاڑی خراب ہونے کی بات مینا کو بتائی تھی اور مینا کے پاس بھی بتانے کے لیے ایک بالکل نئی بات تھی۔

''ساتھ والے گھر سے پلاؤ اور کوفتے دینے ایک لڑکی آئی تھی، کافی باتونی تھی۔ لیکن اچھی تھی، اس نے بڑا اصرار کیا کہ آج ٹی وی پر مووی آ رہی ہے، بڑی اچھی ہے تم دیکھنا۔ میں بھی فارغ بیٹھی تھی، سوچا کہ تھوڑی سی دیر دیکھ لیتی ہوں۔ لیکن جب میں نے دیکھنا شروع کی تو مجھے پسند آئی اس لیے میں نے

پوری مووی دیکھی۔ بہت اچھی مووی تھی۔ ایک اندھی اور بہری لڑکی کی کہانی تھی۔''

طٰہٰ کو حیرت ہوئی۔ مینا کی پرورش جس طرح کے ماحول میں ہوئی تھی، اس کے لیے یہ ایک مووی دیکھنا کافی معیوب بات تھی، لیکن طٰہٰ نے کچھ نہیں کہا۔

''کیا نام تھا مووی کا۔'' طٰہٰ نے سرسری سا پوچھا تھا۔

''بلیک'' تھا نام۔''

''اچھا 'بلیک' میں نے بھی دیکھی ہوئی ہے۔ واقعی زبردست مووی ہے۔'' طٰہٰ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''اچھا ویسے اس مووی میں جو لڑکی ہیروئن ہے کیا وہ حقیقت ہے، انہوں نے اسی طرح اندھی لی ہوگی۔'' مینا نے اشتیاق سے پوچھا تھا طٰہٰ مسکرا دیا۔

''نہیں، وہ بہت بڑی ایکٹریس ہے، بالکل صحیح سالم ہے اور بہت سے لوگوں کی فیورٹ ہے۔''

''اچھا آپ کو اس کا نام آتا ہے؟'' مینا کے سوال پر طٰہٰ ایک بار پھر مسکرایا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ مینا کی کالج اور یونیورسٹی کی کمپنی یقیناً اسی طرح میڈیا اور فلم انڈسٹری سے ناواقف ہوگی، اسی لیے تو اسے کچھ بھی پتا نہیں تھا۔ اور پھر اس کے میکے کا ماحول بھی اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

''ہاں! رانی...... رانی مکھرجی ہے اس کا نام۔''

''ویسے کہیں بھی احساس نہیں ہوتا کہ وہ لڑکی اندھی نہیں ہے۔''

''میں تو سنتی آئی ہوں انڈین اور انگلش فلمیں کافی Exposing ہوتی ہیں، لیکن ایسی تو کوئی بات نہیں تھی۔''

مینا کی بات سن کر طٰہٰ کے ذہن میں مووی کے ایک دو سین آئے تھے جو قابلِ تنقید تھے، لیکن اس نے انہیں جھٹلا دیا۔

''ویسے اتنی معمولی باتیں تو ڈائجسٹ میں لکھی ہوئی کہانیوں میں بھی ہوتی ہیں۔'' طٰہٰ نے سوچا تھا۔

اس کے بعد دو تین منٹ اور اس مووی کی تعریفیں کرتی رہی اور وہ بغور اسے سنتا رہا تھا۔

☆......☆......☆

''زہے نصیب...... آج کا دن یقیناً بہت اچھا گزرے گا۔'' فرزانہ آپا طٰہٰ کو دیکھتے ہی خوش ہو گئیں۔

''السلام وعلیکم آپا!'' طٰہٰ نے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام!'' فرزانہ آپا کی آواز سے بھی خوشی ٹپک رہی تھی۔ وہ واقعی صبح صبح طٰہٰ کو دیکھ کر خوش ہو گئی تھیں۔

''شادی کے بعد تم تو ہمیں بھول ہی گئے ہو، تقریباً ایک ہفتے بعد منہ دکھا رہے ہو۔'' فرزانہ آپا نے ہلکا سا شکوہ کیا تھا اور طٰہٰ تھوڑا شرمندہ سا ہو گیا تھا۔ واقعی اب اس نے یہاں آنا چھوڑ دیا تھا۔

''وہ اصل میں آپا بات یہ ہے......'' طٰہٰ ابھی کوئی تاویل گھڑ ہی رہا تھا کہ فرزانہ آپا نے اس کی بات کاٹ لی۔

''اچھا اب جھوٹ مت بولو، جیسے مجھے کچھ نہیں پتا۔'' فرزانہ آپا کے اس طرح کہنے پر وہ جھینپ گیا۔ وہ مینا کے لیے طٰہٰ کی بے قراریوں سے واقف تھیں۔

''اچھا تم اندر چل کر بیٹھو، میں ناشتا لے کر آتی ہوں۔'' فرزانہ آپا نے کہا تھا۔

''نہیں آپا میں ناشتا کر کے آیا ہوں، اصل میں آپ نے کل مینا کو کہا تھا کہ طٰہٰ کو بھیجنا، اسی لیے میں نے سوچا فیکٹری جانے سے پہلے ملتا جاؤں۔''

''ہاں! اب تو بس بلانے پر ہی آؤ گے اور اوپر سے ناشتا بھی کر کے آئے ہو۔''

''اچھا چلو، اندر تو چلو۔'' فرزانہ آپا نے کہا تو وہ اندر لاؤنج کی طرف آ گیا۔

"بچے اسکول چلے گئے۔" طٰہٰ نے بیٹھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ہاں! انہیں گئے تو چالیس پچاس منٹ ہو گئے ہیں۔"

"اور اسلم بھائی۔"

"وہ ابھی کچھ دیر پہلے نکلے ہیں۔"

"بیلو کو آپ نے اسکول داخل کروا دیا ہے۔" طٰہٰ نے فرزانہ آپا سے ان کے چھوٹے بیٹے کے بارے میں پوچھا تھا۔

"ہاں! پلے گروپ میں جا رہا ہے پرسوں سے تم سناؤ! فیکٹری کا کام صحیح چل رہا ہے۔"

"جی اللہ کا شکر ہے سب کچھ اچھا جا رہا ہے۔"

"اور مینا کیسی ہے؟ خیال رکھتی ہے تمہارا۔" فرزانہ آپا نے اشتیاق سے پوچھا تھا۔ انہیں طٰہٰ سے یہ جاننا تھا کہ وہ اپنی ازدواجی زندگی سے خوش ہے یا نہیں۔

بلاشبہ انہیں جواب کا پتا تھا، لیکن وہ اطمینان چاہتی تھیں۔

"جی بالکل! بہت اچھی ہے مینا، میں تو خدا کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ اللہ نے واقعی بہت بڑی نعمت عطا کی ہے مجھے۔ بہت خیال رکھتی ہے میرا۔" طٰہٰ نے بشاشت سے جواب دیا تھا اور فرزانہ آپا کے اطمینان میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ بالکل بھائیوں کی طرح طٰہٰ کا خیال رکھا تھا انہوں نے اور اب مینا جیسی بیوی ملی تھی اسے۔ فرزانہ آپا اس بات سے تو مطمئن تھیں کہ ان کا بھائی اپنے گھر خیر خیریت سے ہے اور خوش ہے۔

"اور ہاں...... سلمیٰ کو بھی تو اس نے ہفتے دو ہفتے سے منع کر دیا ہے آنے سے...... مینا نے بتایا تو تھا کہ اب گھر کے کام خود کرتی ہوں، لیکن پھر بھی کام تو کافی بڑھ گئے ہوں گے۔" فرزانہ آپا نے استفسار کیا تھا۔

"جی! اس کا کہنا ہے کہ مجھے گھر کے کام خود کرنے اچھے لگتے ہیں۔ فارغ بیٹھنا اچھا نہیں لگتا۔ اور گھر سے وہ نکلنا نہیں چاہتی بس پھر اس لیے۔" فرزانہ آپا اور طٰہٰ مزید کچھ منٹ بات کرتے رہے۔ اور پھر طٰہٰ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور اجازت طلب کی۔

"آتے جاتے رہا کرو۔ بغل میں ہی تو رہتی ہوں۔ آئندہ یہ بات یاد نہ دلوانی پڑے۔" فرزانہ آپا نے تنبیہ کرنے کے انداز میں شکایت کی تھی۔ فرزانہ آپا کی بات سُن کر طٰہٰ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔

☆......☆......☆

"غالب واقعی وہ لڑکی بہت اچھی ہے۔ تم ایک دفعہ اس سے مل کر تو دیکھو۔" عارفہ کا لہجہ منت بھرا تھا۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ وہی لڑکی ان کے بیٹے کی دلہن بن کر آئے۔

"لیکن امی ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ آپ نے اس سے کہا تھا کہ وہ مجھ سے مل لے اور اس نے تو انکار کر دیا تھا کہ وہ کسی لڑکے سے نہیں مل سکتی۔" غالب نے کرسی جھلاتے ہوئے آرام سے کہا تھا۔

"اوہو......" عارفہ جھلا گئیں۔ "مجھے نہیں پتا، میری بہو آئے گی تو بس وہی لڑکی آئے گی۔"

"تو پھر جیسے آپ کی مرضی...... میں پھر کنوارا بیٹھنے کے لیے تیار ہوں۔" غالب نے اس طرح پُرسکون انداز میں کہا اور کرسی جھلانا بند کیا اور جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"غالب!" عارفہ کا انداز تنبیہی تھا۔

"بیٹھ جاؤ......" ناچار غالب کو دوبارہ بیٹھنا پڑا۔

"تمہیں آخر حرج کیا ہے اس رشتے میں......" عارفہ نے اپنے آپ کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کی تھی اور وہ کسی حد تک کامیاب ہو گئی تھی۔

''حرج...... امی میں نے آپ کو بتایا تو ہے میں ایک لڑکی کو پسند کر چکا ہوں۔''

''کوئی اوٹ پٹانگ لڑکی ہی پسند کی ہوگی۔ مجھے تمہاری پسند کا پورا پورا اندازہ ہے۔''

''نہیں امی وہ ایک پرفیکٹ لڑکی ہے۔ بہت ساری خوبیاں ہیں اس میں۔ آپ نے یقیناً کوئی بونگی سی لڑکی پسند کی ہوگی۔ ویسے بھی آپ کو تو ہر دوسری لڑکی اچھی لگتی ہے۔'' غالب نے منہ بناتے ہوئے کہا تھا۔

غالب کے فقرے خصوصاً فقرے کے دوسرے حصے پر عارفہ اپنے اوپر بمشکل ہی جبر کر پائی تھیں، کیونکہ انہیں اندازہ تھا کہ شور شرابہ کرنے سے کام خراب ہو جائے گا۔ پچھلے دو تین ہفتوں سے گھر میں یہی بحث چل رہی تھی۔

عارفہ اپنی سہیلی زاہدہ کے بیٹے کی شادی پر گئی تھیں اور وہیں پر انہیں دلہن کی بہن پسند آ گئی تھی اور سونے پر سہاگا اس لڑکی کے انداز تھے اور جب عارفہ نے کہا کہ غالب سے مل لو تو اس نے ایک لڑکے سے ملنے کو ناپسندیدگی سے دیکھا تھا۔ بس اب ان کی شدید خواہش تھی کہ وہی لڑکی ان کی بہو بنے، لیکن غالب کسی طور نہیں مان رہا تھا، بلکہ خود اپنے لیے لڑکی پسند کر چکا تھا۔

''کیا خوبیاں ہیں اس لڑکی میں جو تم مرے جا رہے ہو۔'' عارفہ نے بیٹے کو طنزیہ انداز میں کہا تھا، لیکن غالب نے ان کے طنز کو نظرانداز کر دیا تھا۔

''بہت ساری خوبیاں ہیں۔''

''چھپا کر رکھنی ہیں یا بتانی بھی ہیں۔'' عارفہ کا انداز کٹیلا تھا۔ غالب نے شکوہ بھری نظروں سے ماں کو دیکھا اور ساتھ ٹیبل پر پڑے میگزین کو اٹھا لیا۔ عارفہ کو بھی احساس ہوا کہ اسے اس طرح نہیں کہنا چاہیے تھا۔ زندگی غالب نے گزارنی ہے وہ تو اس لڑکی کو لے کر کچھ زیادہ ہی ایموشنل ہو رہی تھیں۔

''اچھا! تم ایسا کرو کہ جس لڑکی کو پسند کرتے ہو اس سے ملواؤ مجھے......'' عارفہ نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد کہا تھا۔ انہیں احساس ہوا تھا کہ انہیں غالب کی پسند کو پہلے سامنے رکھنا چاہیے۔

''سچ......'' غالب ایک دم خوش ہو گیا۔ میگزین بھی اس نے واپس ٹیبل پر رکھ دیا۔ ویسے بھی وہ میگزین اس نے ناراضگی کے اظہار کے لیے اٹھایا تھا۔

''لیکن یہاں بھی مسئلہ ہے...... یہاں لے آنا اور آپ سے ملوانا تو دور، اس سے بلاضرورت بات کرنا بھی ایک مسئلہ ہوتا ہے۔'' غالب نے کچھ بے چارگی سے کہا تھا۔

''کیوں بھئی......'' عارفہ کو بات سمجھ میں نہیں آئی۔

''امی وہ لڑکی کسی بھی لڑکے سے بلاضرورت بات نہیں کرتی، اس طرح کالج میں بھی خواہ مخواہ اِدھر اُدھر نہیں پھرتی، عام لڑکیوں کی طرح سب کے سامنے منہ پھاڑ قہقہے بھی نہیں لگاتی۔''

''ہوں...... تو اچھا خاصا تجزیہ کیا ہے تم نے اس کا۔'' عارفہ کے کہنے پر غالب کچھ شرما گیا۔

''تم نے اسے کہاں دیکھا ہے......'' عارفہ نے پوچھا تھا۔

''امی وہ کالج میں مجھ سے دو سال جونیئر ہے۔''

کیا نام ہے اس لڑکی کا؟'' عارفہ نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا تھا۔

''رطابہ۔'' غالب نے نام لیا تھا۔ عارفہ مسکرانے لگی تھیں۔

(زندگی کی اونچی نیچی کٹھنائیوں پر سفر کرتے اِس خوبصورت ناولٹ کی چوتھی قسط ماہِ جنوری میں ملاحظہ فرمائیں)

خواہشوں، امیدوں اور ہر پل رنگ بدلتی زندگی سے آباد، ناول کی بائیسویں قسط

خلاصہ

رفیق احمد اور نفیس احمد دو بھائی ہیں جن کے درمیان بہت محبت اور رکھ رکھاؤ ہے۔ رفیق احمد کے دو بچے عرفان اور زرقون ہیں، جبکہ نفیس احمد کے دو بیٹے احمد، فراز اور ایک بیٹی مریم ہے۔ مریم ایک سلیقہ شعار اور درمیانی صورت وشکل کی کم پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ مریم کی منگنی عرفان سے ہوگئی ہے۔ عرفان سے مریم بے انتہا محبت کرتی ہے، جبکہ زرقون، جو بے حد خوب صورت، خوش اخلاق اور زندہ دل لڑکی ہے، یونیورسٹی سے ماسٹر کر رہی ہے۔ اس کا رشتہ اپنا تایازاد فراز کے ساتھ طے ہے۔ فراز اور زرقون ایک دوسرے کو بے حد چاہتے ہیں۔ رفیق احمد کی بیوی فہمیدہ بیگم ایک سلجھی ہوئی خدمت گزار خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے میکے پر بے حد جان چھڑکتی ہیں۔ میکے میں اُن کی بھاوج رقیہ بیگم بے حد حسین عورت ہیں۔ رقیہ بیگم کو ہمیشہ سے اپنی نند، فہمیدہ بیگم سے حسد ہے کہ وہ کس قدر آسودہ اور پُرتعیش زندگی بسر کرتی ہیں اور اُن کے میاں انہیں کس قدر چاہتے ہیں لیکن وہ اپنا حسد کبھی ظاہر نہیں کرتیں۔ حالات خراب ہونے کے باعث عرفان چند دن رقیہ بیگم کے گھر میں گزارتا ہے، جہاں وہ ثمینہ (جو اُس کی ماموں زاد ہے) کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے اور مریم سے منگنی توڑ دیتا ہے۔ مریم کو منگنی ٹوٹنے کا گہرا صدمہ ہوتا ہے اور وہ بیمار ہو جاتی ہے۔ ثمینہ سے شادی کے لیے فہمیدہ بیگم، بیٹے کا ساتھ دیتی ہیں جس کی وجہ سے رفیق احمد کے دل میں بیوی کی طرف سے بال آ جاتا ہے۔ فہمیدہ بیگم کو اُمید ہوتی ہے کہ اُن کی بھتیجی آ کر سب کا دل جیت لے گی۔ فطرتاً وہ دل کی نرم ہوتی ہیں، اس لیے انہیں مریم کی تکلیف کا بھی احساس ہوتا ہے اور وہ دل میں عہد کرتی ہیں کہ وہ مریم کے لیے اچھا سا رشتہ خود تلاش کریں گی۔ جہاں آرا بیگم جو نفیس احمد کی بیوی ہیں، مریم کا رشتہ ٹوٹنے کے بعد رفیق احمد اور اُن کے گھر والوں سے سخت ناراض ہو جاتی ہیں۔ ثمینہ اور عرفان کی شادی ہو جاتی ہے۔ عرفان بہت خوش، فہمیدہ بیگم مطمئن اور رفیق احمد اور زرقون اُداس ہوتے ہیں۔ شادی کے دوسرے دن جب زرقون اپنی کزنز کے ساتھ دلہن کو لینے جاتی ہے تو رقیہ بیگم، ثمینہ کو بھیجنے سے انکار کر دیتی ہیں۔ نفیس احمد اس بات کو سُن کر چراغ پا ہو جاتے ہیں۔ فہمیدہ بیگم چاچی زلیخا کے ساتھ ثمینہ کو لینے جاتی ہیں، جہاں اُن کو رقیہ بیگم ایک دوسرے ہی روپ میں ملتی ہیں۔ چاچی زلیخا یہ خبر جہاں آرا بیگم کو سُنانے پہنچ جاتی ہیں۔ جہاں آرا بیگم ایک رات کی دُلہن کے میکے بیٹھ جانے کا سُن کر دل ہی دل میں خوش ہونے کے ساتھ ساتھ حیران رہ جاتی ہیں۔ زرقون کو اپنی مامی کے رویے کا بہت دُکھ ہوتا ہے۔ اُس کے دُکھ پر فراز محبت کے پھائے رکھتا ہے۔ آفتاب احمد جو ایک بہت بڑی کمپنی کے ایم ڈی ہیں، وہ نرگس جو زرقون کی دوست ہے اور جس کا مڈل کلاس سے تعلق ہے، اُس کو بے حد پسند کرنے لگتے ہیں، لیکن نرگس اُن کی پسندیدگی سے ناواقف ہے۔ عرفان اور ثمینہ کی شادی سے رفیق

احمد ناخوش ہونے کے باوجود زرقون کو سمجھوتہ کرنے کو کہتے ہیں۔ رفیق احمد ایک رکھ رکھاؤ والے خاندانی آدمی ہیں۔ اُن کے گھر کے کچھ اصول ہیں۔ ثمینہ اُن اُصولوں کی پروانہیں کرتی۔ جس پر اُن کو اعتراض ہوتا ہے۔ ثمینہ پھوپو کے گھر کو سسرال ہی سمجھتی ہے۔ اور وہ سسرال والوں کو تنگ کرنے کا کوئی موقع نہیں گنواتی۔ مریم روز...... روز کے رد کیے جانے کی وجہ سے چڑچڑی اور بیمار رہنے لگی ہے۔ نفیس احمد اور جہاں آرا بیگم بیٹی کی بدلتی ہوئی کیفیت سے بہت پریشان ہیں۔ نفیس احمد دیکھ رہے ہیں کہ حالات تیزی سے کروٹ بدل رہے ہیں، لہٰذا وہ زرقون کا جلد از جلد فراز کے ساتھ بیاہ کر دینا چاہتے ہیں۔ فراز، زرقون کو بے حد چاہتا ہے۔ رقیہ بیگم چھوٹی چھوٹی باتوں کو بنیاد بنا کر فہمیدہ بیگم سے سوال جواب کرنے کھڑی ہو جاتی ہیں اور ایسے موقعوں پر ثمینہ مظلومیت کی شاندار اداکاری کرتی ہے۔ عرفان، ثمینہ کا دیوانہ ہے۔ اُن دِنوں جب عرفان کے سر پر ثمینہ کی محبت سوار ہوتی ہے، ایک خوب صورت، خوش مزاج لیڈی ڈاکٹر کا عرفان کی دکان پر آنا جانا شروع ہو جاتا ہے۔ ثمینہ نے اپنے رنگ دِکھانے شروع کر دیے ہیں۔ اُس کو فراز اور زرقون سے عجیب سا حسد محسوس ہونے لگا ہے۔ جہاں آرا کے مزاج میں رفیق احمد اور اُن کے گھر والوں کے لیے تلخی بڑھ رہی ہے۔ وہ فراز کو اُن کے گھر جانے سے منع کر دیتی ہیں۔ رفیق احمد کی آنکھوں میں کالا پانی اُتر آیا ہے۔ اُن کی آنکھوں کا آپریشن ناکام ہو جاتا ہے۔ عرفان ڈاکٹر تابندہ کو کاروبار کے لیے سونا دے دیتا ہے۔ مریم بہت ساری نفسیاتی اُلجھنوں سے نکل کر آخر زندگی کی طرف قدم بڑھا دیتی ہے۔ زرقون آفتاب کا نمبر حاصل کر کے اُس کو فون کرتی ہے۔ وہ دراصل یہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ آیا وہ نرگس سے محبت کرتا ہے یا نہیں۔ جہاں آرا بیگم نے کھل کر رفیق احمد کے گھرانے، زرقون اور فراز کے رشتے کی مخالفت شروع کر دی ہے۔ اس ساری صورت حال سے فراز بہت پریشان رہنے لگا ہے۔ زرقون سب کچھ سمجھ رہی ہے۔ لیکن اُس کو سوائے اللہ کے آگے گڑگڑانے کے کچھ نظر نہیں آ رہا۔ اِدھر ثمینہ نے ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ جلد از جلد الگ ہو جائے۔ مریم کا رشتہ ایک متوسط طبقے سے آتا ہے۔ جہاں آرا بیگم مریم کے رشتے سے بہت خوش ہیں لیکن زرقون اور رفیق احمد کے تمام گھر والوں کے ساتھ اُن کا رویہ بہت سرد ہو جاتا ہے۔ وہ فراز کو رفیق احمد کے گھر جانے سے منع کرتی ہیں۔ فراز بہت پریشان ہے لیکن نفیس احمد اُس کو حالات کو سنبھالنے کی اُمید دلاتے ہیں۔ زرقون جہاں آرا بیگم کے رویے سے بہت دل برداشتہ ہے۔ ثمینہ ایک بیٹے کو جنم دیتی ہے۔ ثمینہ اور رقیہ بیگم نے سارے خاندان میں بدگمانیاں پھیلا دی ہیں۔ فہمیدہ بیگم کے سارے رشتے دار اُن کی مخالفت کر رہے ہیں، جس کا اُن کو بہت صدمہ ہے۔ عرفان نے ثمینہ کو بہت جلد الگ گھر لینے کی اُمید دلائی ہے۔ مرتضیٰ اور شیری کے جھگڑے دن بدن بڑھ رہے ہیں۔ شیری ایک مکمل امریکن عورت کا روپ دھار رہی ہے اور مرتضیٰ اس بات سے سخت نالاں ہے۔ وہ چاہتا ہے اللہ اُس کو اولاد دے دے۔ شاید اس طرح شیری کو گھر داری کا شوق پیدا ہو جائے۔ آفتاب اور نرگس کی محبت خوب صورت جذبوں کے ساتھ پروان چڑھ رہی ہے۔ لیکن زرقون اور فراز کی محبت تیز آندھیوں کی زد میں ہے۔ اللہ نے ثمینہ کو بیٹے سے نوازا ہے، فہمیدہ بیگم بہت خوش ہیں لیکن رقیہ بیگم ثمینہ کو اپنے ساتھ گھر لے گئیں اور روک لیا۔ اب ان کا مطالبہ ہے کہ ثمینہ کو الگ گھر لے کر دیا جائے۔ وہ چاہتی ہیں کہ فہمیدہ اپنا برسوں کا بسا بسایا گھر بیچ کر عرفان کو ورثہ دے دیں۔ فہمیدہ بیگم ان کے مطالبے سے بہت پریشان ہیں، رقیہ بیگم نے ان کے اور ان کے تمام گھر والوں کے خلاف پورے خاندان والوں کو بدگمان کر دیا ہے۔ جس کا فہمیدہ بیگم کو بہت صدمہ ہے۔ مریم کا رشتہ طے ہو گیا ہے۔ جہاں آرا بیگم جہاں مریم کے رشتے سے خوش ہیں وہیں پُرانے طے کردہ رشتوں کے بارے میں وہ بہت کچھ سوچ چکی ہیں۔ فراز جہاں آرا بیگم کے رویّے کے بارے میں پریشان ہے لیکن نفیس احمد اس کو تشفی دیتے ہیں کہ جہاں آرا کا غصہ وقتی ہے۔ لیکن فراز مطمئن نہیں ہے۔ زرقون کے دل کو بھی اپنی تائی اماں کے سرد رویے کی وجہ سے عجیب سی بے چینی ہے۔ وہ فراز سے کہتی ہے، لیکن فراز اُس کو اطمینان دلاتا ہے۔ مریم اب بہت بدل گئی ہے۔ اُس میں ہونے والی ناخوش گوار تبدیلیاں جہاں آرا بیگم کے لیے اطمینان کا باعث ہیں۔ فہمیدہ بیگم اپنے میکے والوں کے رویے پر بہت دلبرداشتہ ہو جاتی ہیں وہ زرقون اور مریم سے اپنے دِل کی حالت بیان کرتی ہیں اُن کی باتوں کا کچھ حصہ رفیق احمد بھی سُن لیتے ہیں۔ اُن کو احساس ہوتا ہے انجانے میں وہ بھی فہمیدہ بیگم کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں وہ دِل ہی دِل میں فہمیدہ بیگم کو معاف کر دیتے ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ وہ بھی اُن سے معافی مانگ لیں گے۔ لیکن کسی معافی تلافی کے بغیر فہمیدہ بیگم ایک رات جو سوتی ہیں تو سوتی ہی رہ جاتی ہیں...... وقار...... کو جہاں آرا بیگم کاروبار کے لیے پیسا دیتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ انہوں نے بیٹی کے لیے سکھ خرید لیے، لیکن وقار کا شکی مزاج مریم کو ہر وقت ڈستا رہتا ہے اور مریم کے مزاج میں چڑچڑا پن آ جاتا ہے...... اِدھر آفتاب نرگس کے لیے اپنے والدین سے بات کرتا ہے...... اُس کے والد کہتے ہیں کہ انہوں نے اُس کے رشتے کے لیے اپنے دوست جنید سے اُن کی بیٹی حیا کے لیے بات کر رکھی ہے۔ آفتاب یہ سن کر حیران رہ جاتا ہے...... جہاں آرا بیگم کے ساتھ ساتھ مریم بھی فراز کے ساتھ زرقون کی شادی کے خلاف ہے کیوں کہ مریم کا خیال ہے اگر اس کی شادی عرفان سے ہو جاتی تو اُس کو دن رات وقار کے طعنے تو سُننے کو نہ ملتے...... زرقون کے لیے فراز کی محبت سے اُس کو حسد ہونے لگتی ہے۔ جہاں آرا بیگم نے زرقون کے خلاف ایک محاذ کھڑا کر رکھا ہے کیونکہ مریم نہیں چاہتی زرقون کی شادی فراز سے ہو۔ زرقون اور فراز بدلتے حالات

کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ زرقون فراز سے کہتی ہے کہ وہ وعدہ کرے کہ وہ اُس کے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کرے گا۔ تو وہ ساری زندگی اُس کا انتظار کرنے کے لیے تیار ہے۔ رفیق احمد، رقیہ بیگم سمیت فہمیدہ بیگم کے سارے خاندان کو اپنے گھر آنے سے منع کر دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ثمینہ اور عرفان پر کوئی پابندی نہیں وہ جب جس کے گھر جانا چاہیں جا سکتے ہیں، لیکن اُن کے گھر کوئی نہیں آئے گا۔ مرتضیٰ اپنی ماں کے سمجھانے پر شیری سے ایک بار پھر سمجھوتے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ آفتاب حیا کو نرگس کے بارے میں بتاتا ہے وہ چاہتا ہے حیا اِس رشتے سے انکار کر دے۔ وہ حیا کو چائے پر لے کر جاتا ہے لیکن حیا کوئی جواب دیے بغیر اُٹھ کر چلی جاتی ہے۔ آفتاب پریشانی سے سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ ثمینہ کو فہمیدہ بیگم کے بعد بہو ہونے کے ناتے گھر کی ذمے داری سپرد کی جاتی ہے۔ لیکن وہ حد سے زیادہ لاپروائی اور بے حسی کا مظاہرہ کرتی ہے اور یوں اُس کا اور زرقون کا پہلا جھگڑا ہوتا ہے۔ فراز اور زرقون کا رشتہ ختم کرانے کے لیے رقیہ بیگم، بنو خالہ کے ساتھ مل کر ایسا چکر چلاتی ہیں کہ جہاں آرا بیگم فوری طور پر رفیق احمد کی بیٹی سے فراز کو دور کر دیتی ہیں اور فراز کا رشتہ مریم کی پسند سے طے پا جاتا ہے۔ نرگس کی شادی آفتاب احمد سے ہو جاتی ہے اور وہ لندن چلی جاتی ہے۔ مرتضیٰ، شیری کو کسی گورے کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیتا ہے اور اسی وقت اسے طلاق دے دیتا ہے۔ موی کا رشتہ رفیق احمد نے طے کر دیا ہے اور اب وہ اس کی شادی کی تیاریوں میں مگن ہے۔ ڈاکٹر تابندہ عرفان کو دوا رب کا چونا لگا کر رفو چکر ہو جاتی ہے اچانک......

(اب آپ آگے پڑھیے)

"کیا مطلب؟" شانزے نے پلٹ کر فراز سے پوچھا۔

"آپ کی امی کہہ رہی ہیں، میں دوپٹا سر پر لوں، میں جم نہ جاؤں۔ میں کلب کی ممبر شپ ختم کر دوں۔ واٹ نان سینس۔" شانزے نے ہیئر برش زور سے ڈریسنگ ٹیبل پر پٹختے ہوئے پلٹ کر خاموش بیٹھے فراز سے کہا۔

"تم ناراض کیوں ہو رہی ہو۔" فراز کا لہجہ دھیما تھا۔

"Mind your Language تم نہیں آپ!" شانزے غرائی۔

"اچھا...... بھئی اچھا۔" فراز کھسیایا۔

جہاں رشتے محبتوں اور خلوص کی دیواروں کو گرا کر فقط نفع اور نقصان کی بنیاد پر رکھے جائیں وہاں زندگی برابری کی بنیاد پر نہیں بلکہ حکمران اور غلام کے درمیان تڑ ھکتے گزرتی ہے۔ اس بات کا اندازہ فراز کو شادی کے چند دن بعد ہی ہو گیا تھا۔ لیکن شانزے کے لاکھوں روپے کے جہیز اور Prioritg Bank Account نے اُس کو سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور ابھی تو شادی کے نئے نئے دن تھے، ابھی تو ایک عام مرد کی طرح اُس پر وصل کا نشہ چھایا ہوا تھا۔ آنکھوں کے گرد اتنی دُھند تھی کہ ایک دفعہ بھی زری کا چہرہ یاد نہیں آیا تھا۔

آج فراز کی شادی کے صرف ایک ہفتے کے بعد شانزے جم کے لیے تیار ہو رہی تھی تو جہاں آرا بیگم نے اُس کو جب ایسے لباس میں دیکھا تو دنگ رہ گئیں۔ اُن کے خاندان میں تو لڑکیاں چار چار بچوں کی مائیں بن جاتی تھیں تو بھی کبھی ساس سُسر کے سامنے ننگے سر نہ آتی تھیں، کبھی اونچی آواز سے نہ بولتی تھیں۔ جہاں آرا بیگم جانتی تھیں زمانہ بدل گیا ہے۔ اب اقدار اس طرح نہیں نبھائی جا رہی ہیں۔ جس طرح انہوں نے نبھائی ہیں لیکن پھر بھی شرفاء کے ہاں بڑے چھوٹے کا ادب لحاظ موجود ہے اور اُن کی بہو بیگم...... پنڈلیوں سے ذرا اوپر ٹائٹ پینٹ اور ٹاپ پہنے بہت آرام سے جوگر شوز پہن رہی ہیں ایک لمحے کے لیے تو اُن کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا اور جب اُن کو یقین آیا تو اُن کے منہ سے نکلا۔

"دلہن! یہ کیا پہنے کھڑی ہو؟ اور کہاں جا رہی ہو؟"

"کیا؟" شانزے نے اوپر سے نیچے تک آئینے میں نظر آتے اپنے عکس کو دیکھا۔

"کپڑے پہنے ہوئے ہوں، واک پر جا رہی ہوں اور وہاں سے Slimmer Club جاؤں گی۔ آپ اِس قدر حیران کیوں ہو رہی ہیں اور پلیز آپ مجھے یہ دقیانوسی لفظ دلہن اور بہو بیگم وغیرہ مت کہا کریں۔ I Hate

These Typical Words میرا نام شانزے ہے سو Please Call Me Shanzay۔" شانزے نے اپنی چھوٹی سی ناک کو چڑھاتے ہوئے نخوت سے کہا۔

"خیر تمہارا نام جو بھی ہو۔ ہمارے ہاں جو کہا جاتا ہے ہم وہیں کہیں گے اور یہ کپڑے بدلو کوئی جم وغیرہ نہیں جارہا۔ باہر آؤ فراز کے ابا گھر پر ہیں باہر آ کر اُن کو صبح کا سلام کرو۔" جہاں آرا بیگم نے رسان سے کہا کہ شانزے کو وہ بیاہ کر لائی تھیں اور اُس کی غلطیاں اُن کا جرم ہیں، وہ جانتی تھیں۔

'کمبخت بہت ہی بدتمیز ہے لیکن خیر!! میرے بیٹے کی پشت تو مضبوط ہوگئی۔ جتنا وہ ساری زندگی میں کما نہیں سکتا تھا اتنا تو شانزے جہیز لے آئی ہے۔ آہستہ آہستہ ڈھل ہی جائے گی ہمارے ماحول میں، میں فراز کو سمجھاؤں گی، ذرا رسی کھینچ کر رکھے۔' جہاں آرا بیگم نے فراز کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھتے ہوئے جیسے اپنے آپ کو تسلی دی۔ دروازہ اُن کے باہر نکلتے ہی جتنی زور سے شانزے نے بند کیا تھا، اُن کو برا تو بہت لگا تھا لیکن وہ برداشت کر گئیں اور ویسے بھی اُن کے خیال میں یہ سودا برا نہیں تھا۔ مریم کو اِس بات پر اعتراض تھا کہ اگر زری کی شادی فراز سے ہوگی تو عرفان کا آنا بڑھ جائے گا اور جو عرفان آئے گا تو وقار کو اعتراض ہوگا۔ عرفان کی موجودگی...... وقار کے دل میں پنپتے شک کے بیج کو تناور درخت بنادے گی اور انہوں نے مریم کا گھر بچایا تو بچایا فراز کے مستقبل کو بھی محفوظ کرلیا تھا۔ وہ ایک مستحکم گھر کی بیٹی لائی تھیں جو گھر میں بعد میں داخل ہوئی تھی، اُس کی گاڑی پہلے دروازے پر آ کھڑی ہوئی تھی۔

"دیکھو فراز! میں مڈل کلاس لوگوں سے بات بھی کرنا پسند نہیں کرتی۔ لیکن میری مام کا خیال تھا کہ مڈل کلاس ہزبینڈ بہتر ہوتا ہے بہ نسبت ایلیٹ کلاس ہزبینڈ کے لیکن فراز سُن لو۔ میں جم جارہی ہوں اور پلیز اپنی مدر کو سمجھا لو اور اگر نہیں سمجھاؤ گے تو پھر بھی مجھ پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔" شانزے نے غصے سے جوتے کے لیس باندھتے ہوئے خاموش بیٹھے فراز سے کہا۔

"ٹھیک ہے آپ جائیں میں امی کو بتادوں گا۔" فراز کا لہجہ عجیب منمناتا ہوا تھا۔

ہوتا ہے زندگی میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ ایک دفعہ ڈیفنس والے گھر کی چابی ہاتھ آجائے اور میرے پاسپورٹ پر امریکہ کا ویزا لگ جائے۔ تم اور آپ کا فرق تو میں تم کو سمجھا ہی دوں گا۔ فراز نے تصور میں اپنے آپ کو امریکہ کی پرواز میں بیٹھے، جوس پیتے تصور میں ڈوبتے ابھرتے ایک عجیب کمینگی اور لالچی انداز میں سوچا۔

زندگی میں لوگ سانپوں اور گرگٹوں سے زیادہ روپ بدلتے ہیں۔ یہ فراز کو دیکھ کر سوچا جاسکتا تھا۔

"پتا ہے آپ کو جنید جو لڑکی مجھے مرتضٰی کے لیے پسند آئی تھی۔ یہ دیکھیے اُس کی تصویر...... اُس نے یونیورسٹی میں ٹاپ کیا ہے یعنی حسین تو ہے ہی ذہین بھی ہے۔ بس میرے مرتضٰی کو ایسی ہی لڑکی کی ضرورت ہے کہ اس کا حسن مرتضٰی کو خوش کرے اور اُس کی ذہانت میرے ٹوٹے پھوٹے مرتضٰی کو پیار سے جوڑ دے۔ میں نے سب معلومات کرلی ہیں۔ گھر کا ایڈریس بھی میرے پاس آگیا ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میری دوست کی اسٹوڈنٹ ہے یہ لڑکی۔"

"لیکن...... جان جنید۔" جنید صاحب نے محبت سے تیز تیز بولتی اپنی بیوی کو جو کہیں سے بھی جوان بچوں کی ماں نہیں لگتی تھیں کو ٹوکتے ہوئے کہا۔

"یہ لڑکی تو شاید انگیج ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، آپ کا سابقہ بیان یہی ہے۔"

"ارے چھوڑیے وہ بات تو سابقہ بیان کی طرح سابقہ ہوئی، میں عنقریب اِس کے گھر جارہی ہوں۔ اِس لڑکی کو میرے گھر میں، میرے مرتضٰی کے ساتھ ہونا چاہیے۔ پتا نہیں کیوں جنید مجھے یہ لڑکی بہت ہی پسند آئی ہے۔ مجھے اپنی بیٹی جیسے لگ رہی ہے۔ نہ جان نہ پہچان لیکن یقین کیجیے۔ میرے دل میں اِس کے لیے ممتا کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہے۔ اور سُن

لیجیے جنید صاحب! میں اِس لڑکی کے لیے اللہ سے بھی دعا کروں گی۔" رومی کا لہجہ عجیب سا اٹل اور پیار بھرا تھا۔

"الٰہی خیر! ہماری بیگم تو کبھی ہم پر بھی اِس طرح عاشق نہ ہوئیں جس طرح اِس انجانی لڑکی پر ہو گئی ہیں۔ واہ میرے نصیب، خیر ذرا دکھایئے تو تصور ہم بھی تو دیکھیں، ہماری بیگم نے کون سا گوہرِ نایاب چُنا ہے۔ ہمارے صاحبزادے کے لیے۔" جنید صاحب نے مسکراتے ہوئے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلا اور پھر ہاتھ بڑھا کر رومی کے ہاتھ سے اخبار لے لیا اور پھر اُن کی نظر گلے میں میڈل ڈالے، ہنستی مسکراتی اُس لڑکی پر جیسے ٹھہری گئیں اور اُن کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "Wonderful"۔

☆......☆......☆

سارے کمرے میں ایک عجیب سا نہ نظر آنے والا لیکن محسوس کیے جانے والا نور بھرا ہوا تھا۔ اور اُس پُر نور کمرے کے وسط میں بچھی جائے نماز پر رحل پر قرآن رکھا ہوا تھا۔ قرآن میں ستائیسویں پارے کی سورۃ رحمٰن" وہ مرد جو سفید کرتا شلوار پہنا ہوا ہے۔ جس کی صرف پشت نظر آ رہی ہے۔ اُس کے شانے چوڑے اور کلائیاں مضبوط ہیں۔ جب وہ مرد اپنی خوبصورت آواز میں تلاوت کرتے ہوئے "فبایِّ آلاءِ ربِّکما تکذِّبٰن" پر پہنچا تو کمرے میں داخل ہوتی زری ٹھٹک گئی۔ اُس مرد کی حسین ترین آواز میں تلاوت اور پھر ترجمہ، زری کا سفید آنچل اُس کے سر پر لرزنے لگا۔ اُس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ آنسو چہرے سے ہوتے ہوئے گریبان میں منہ چھپا کر سسکنے لگے۔ اُس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس مسکرانے لگا اور وہ آہستہ آہستہ، چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی جائے نماز کے پاس جا کر کھڑی ہوئی۔ اُس نے پانی کا گلاس میز پر رکھا اور پھر دوزانو ہو کر اُس مرد کے برابر میں جا بیٹھی۔ وہ سورۃ رحمٰن پڑھ چکا تھا۔

اب وہ سورۃ نور کی تلاوت کر رہا تھا۔ ترجمہ (ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لیے ہیں اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں کے لیے ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے ہیں)

اِس آیت کے ترجمے اور مفہوم نے زری کے سسکتے ہوئے آنسوؤں کو آواز دے دی۔ زری آواز سے سسکنے لگی، وہ رونے لگی۔ اُس نوجوان مرد نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا بلکہ اُس کی آواز میں ایک ہی آیت بار بار گونجنے لگی۔ اُس کے آنسو گرتے رہے۔ اُس کا بدن ہچکولے کھانے لگا۔ زری آہستہ قدموں سے چلتی اُس کے برابر جا بیٹھی۔ زری نے اپنا ہاتھ جس میں سے عجیب سی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ اُس مرد کے شانوں پر رکھا اور پھر اپنا سر اُس کے شانوں پر رکھ دیا۔

ایک عجیب سا اطمینان اور سکون زری کو اپنے اندر اُترتا ہوا محسوس ہوا۔

وہ نوجوان اب قرات روک چکا تھا۔ اُس نے قرآن کو بند کر دیا تھا اور اب وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے سسک رہا تھا۔ سرگوشیوں میں مالکِ حقیقی سے راز و نیاز کر رہا تھا۔ زری نے اُس کے ہاتھ اُس کے چہرے پر سے ہٹائے، اُس کا چہرہ دُھندلا ہو رہا تھا، نقش و نگار گڈمڈ ہو رہے تھے۔ زری نے اپنے نرم و ملائم ہاتھوں سے اُس کے آنسو محبت اور عقیدت سے صاف کیے۔ اُس نے اپنا چہرہ جھکا لیا لیکن اُس کی تھوڑی پر نمایاں وہ تل، زری کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ پھر اُس نوجوان نے سر جھکائے جھکائے اپنی بانہیں زری کی طرف بڑھا دیں اور زری ایک مہکتے ہوئے، نرم و نازک پھول کی طرح اُس کی بانہوں میں سما گئی۔ اُس کے آنسو جب زری کے چہرے پر گرے تو اُس نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔"

"یا اللہ! یہ کیا تھا۔" زری جو گہری نیند میں تھی، چونک کر اُٹھتے ہوئے جیسے خود سے گویا ہوئی کہ یہ کیا تھا۔ خواب!" اُس نے رضائی پر ہاتھ پھیرا۔ یا حقیقت۔ اُس نے داہنے ہاتھ سے آنسو پونچھتے ہوئے اُنگلی کے پوروں پر لرزتے

آنسوؤں سے جیسے سوال کیا۔

''وہ کون تھا؟'' مضبوط بازوؤں کی گرفت اور تحفظ کے ایک عجیب سے احساس میں گھر کر وہ اپنے آپ سے گویا ہوئی۔ جب کوئی اُلجھن ہو، جب کوئی ایسا معاملہ آ کھڑا ہو کہ کہنے، سننے اور سمجھنے کے لیے کچھ نہ بچے تو دو نفل پڑھ لیا کرو، اللہ بڑا کارساز ہے۔ وہ اپنے بندوں سے بہت محبت کرتا ہے۔ وہ اپنے دروازے پر آنے والے کی اُمید کی لاج رکھتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کو تکلیف نہیں دیتا۔ وہ اپنے بندوں کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ بیٹا وہ رحمٰن ہے، وہ رحیم ہے۔ وہ قادرالمطلق ہے۔ وہ ہماری شہ رگ سے زیادہ قریب ہے۔ جب اپنے آپ کو تنہا سمجھنے لگو۔ جب تم اکیلی رہ جاؤ تو اُس کے در پر کھڑی ہو جایا کرو۔'' فہمیدہ بیگم کی ایک بھولی بسری بات اُس کو یاد آئی۔

اُس نے پلٹ کر دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھا اور پھر مسلسل آنکھوں سے نکلتے آنسوؤں کو دوبارہ صاف کیا اور عجیب افسردگی اور اطمینان کی کیفیتوں میں ڈولتی جائے نماز پر جا کھڑی ہوئی۔ اُس رب کے سامنے، جس سے جو مانگو تو دیتا ہے اور جو اُس سے نہ مانگو تو برا مانتا ہے۔ جو دیتا ہے تو واپسی کا تقاضہ نہیں کرتا۔ جو دیتا ہے تو شرمندہ نہیں کرتا۔ جو ایک کے ستر دیتا ہے۔ لیکن نماز پڑھتے ہوئے نہ جانے کیوں اُس کے پاس کوئی بیٹھا قرآن کی تلاوت کرتا رہا۔ اور وہ آنکھیں بند کیے سجدے میں پڑی رہی۔

☆......☆......☆

''بیٹا جس سے تم ناراض، اُس سے میں ناراض اور جس سے میں ناراض اُس سے اللہ ناراض اور جس سے راضی اُس سے میں راضی اور جس سے میں راضی اُس سے اللہ راضی۔'' رفیق احمد نے گلوگیر آواز میں روتی ہوئی زری سے کہا اور زری یک ٹک باپ کو دیکھنے لگی یا اللہ ایسا اعزاز، ایسی چاہت، روتی، بلکتی زری باپ کی محبت پر دم بخود رہ گئی۔

یوں تو ثمینہ ہمیشہ ہی سے زری سے حسد رکھتی تھی لیکن فہمیدہ بیگم کے انتقال کے بعد تو جیسے اُس نے زری کا پیچھا ہی لے لیا تھا گو کہ رفیق احمد ایک ڈھال کی طرح اُس کے سامنے کھڑے رہتے تھے۔ لیکن کب تک اور دن میں ہونے والی بہت ساری باتیں تو زری باپ کو بتاتی تک نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ایسی باتیں، ایسے چھوٹے چھوٹے جملے، رفیق احمد کے دل میں گھاؤ ڈال دیں گے۔ وہ چپ رہتی۔

آج جب کہ گھر میں کچھ مہمان آ گئے اور زری نے دبے لفظوں سے اُس سے صرف یہ کہہ دیا کہ وہ مہمانوں کے سامنے ذرا طریقے سے کپڑے تبدیل کر کے آ جائیں کیونکہ آنے والے لوگ رفیق احمد کے پھوپی زاد بھائی اور اُن کے بچے تھے جو کہ ایک طویل عرصے کے بعد کینیڈا سے پاکستان آئے تھے اور جب ثمینہ کو یہ پتا چلا کہ او ہو اگر اِن کی عزت رکھنی ہے تو اُس نے مہمانوں کے سامنے وہ طریقہ رکھا جس پر سوائے سر پیٹنے کے کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ ایک بدرنگا سوٹ پہن کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی اور سارا وقت گھر کی تنگدستی اور عرفان کے کاروبار کی زبوں حالی کے قصے سناتی رہی۔ کئی دفعہ رفیق احمد نے پہلو بدلا، کئی دفعہ زری اُس کو بہانے سے اُٹھا کر باہر لے کر گئی لیکن اُس نے بھی وہ تماشے رچائے کہ اگر رفیق احمد کو ایک زندگی اور مل جاتی تو بھی وہ اُس شرمندگی کو نہیں مٹا سکتے تھے جو انہوں نے اٹھائی۔

اور زری...... زری کو تو ویسے بھی آج کل رونے کا بہانہ چاہیے تھا اور اِس سے اچھا موقع کون سا ہو سکتا تھا کہ وہ باپ کے سامنے دل بھر کر روئے...... آسمان پر بیٹھے اللہ کے بعد وہی تو تھے جو اُس کے دکھ کو محسوس کر سکتے تھے۔ رفیق احمد بھی بیٹی کے دل کا دُکھ سمجھتے تھے۔ وہ ایک نبض شناس باپ تھے لیکن اپنا بھرم رکھتی، ٹوٹتی بکھرتی، اپنے آپ کو سنبھالتی، کبھی ہنسی اور چھپ چھپ کر روتی بیٹی کے لیے اُن کا دل تڑپتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ثمینہ نے آج پہلی دفعہ یہ

حرکت نہیں کی، اُس نے تو اِس گھر میں رہ کر بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔ ایسے کارنامے کہ اِس گھر کی چھت گر گئی اور ملبے تلے سب ہی دب گئے لیکن اُن کی بیٹی پھر بھی ملبہ جھاڑ کر کھڑی ہو گئی لیکن آج......

''بیٹا میرے لیے تم سے زیادہ کوئی اہم نہیں ہے۔ کاش میں اپنا سینہ چیر کر دکھاتا کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں، کاش عرفان کی جگہ بھی اللہ مجھ کو بیٹی دے دیتا۔ بیٹیاں کتنی اچھی ہوتی ہیں یہ کوئی مجھ سے پوچھے۔ لیکن بیٹا روؤ مت...... تمہاری ماں مری ہے باپ زندہ ہے۔ بس بیٹا میری زندگی کی دعا کیا کرو۔ اگر میں زندہ رہا تو انشاء اللہ ایک ایک سے نمٹ لوں گا، ورنہ یہ لوگ تمہارے بال پکڑ کر، تمہارا سر دیوار میں دے ماریں گے۔ میرے اندر کی آنکھ بہت کچھ دیکھ رہی ہے۔ موی اپنے گھر میں بہت خوش ہے۔ وہ بھی میرے دل کا ٹکڑا ہے لیکن زری بیٹا تم تو میرا پورا دل ہو۔ تم کو تکلیف ہوتی ہے تو میرے دل کو تکلیف ہوتی ہے۔ تم میرا گوہرِ نایاب ہو، اور یاد رکھنا بیٹا ہیرے کی قدر جوہری جانتا ہے۔ اگر میرے بھائی کے گھر والوں نے تم کو ٹھکرا دیا ہے تو دراصل وہ لوگ اس ہیرے کے لائق نہیں تھے۔ بیٹا بعض ہیرے تاج میں لگائے جاتے ہیں اور تم بھی وہی ہیرا ہو۔ میں نے فراز کو ہمیشہ بہت اچھا سمجھا لیکن ساری زندگی میں نے دھوکہ ہی کھایا۔ تمہاری امی سے، فراز سے اور بہت سارے لوگوں سے لیکن فراز...... فراز تو میرا خون تھا، میرے بھائی کی اولاد تھا۔ اُس کو میں کیسے نہ پہچان سکا۔

اتنا لالچی، اتنا کم ظرف، وہ لاکھ باتیں کرے لیکن میں جانتا ہوں اُس کے پیروں میں بیڑیاں اُس کی ماں کی ضد اور بہن کی زبان نے نہیں ڈالی ہیں بلکہ اُس کے منہ میں پڑی اُس کی بیوی کی دولت ہے۔ اُس نے کاغذ کے حقیر ٹکڑوں کے لیے میرا مان اور تمہارا دل توڑ دیا۔ ایک ہاتھ جوڑنے کی کسر رہ گئی تھی۔ اگر بھابی جان کہتیں تو بیٹا میں تمہاری خوشی کے لیے اُن کے آگے ہاتھ بھی جوڑ لیتا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ فراز جیسے معمولی لڑکے کے لیے میں تم کو اتنا کمتر نہیں کر سکتا تھا۔

بعض اوقات ہم سارا دن ایک پھل اُٹھا کر ریفریجریٹر میں رکھتے ہیں کہ شام کو روزہ افطار کے بعد کھائیں گے اور جب اُس پھل کا چھلکا اُترتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ اندر تو سب سڑا ہوا ہے، کیڑے چل رہے ہیں۔ ہمیں اُس کی اصلیت دیکھ کر گھن آتی ہے اور ہم باہر اُچھال دیتے ہیں۔ ہم اپنے ہاتھ رگڑ رگڑ کر دھوتے ہیں اور اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہم نے اُس پھل کو نہیں کھایا۔ تو میری بچی بعض زندگی کے معاملات بھی ایسے ہی ہوتے ہیں کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ہم جن کے لیے روتے ہیں پھر ایک دن اللہ کے فیصلے پر ہم شکر ادا کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے۔''

''ابا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' زری نے اپنے آپ کو کنٹرول کرتے ہوئے باپ کی بات پر کہا۔ وہ حیران تھی کہ وہ تو اپنے دل کا حال اپنے آپ سے بھی چھپاتی ہے لیکن ابا! ابا کو کیسے پتا چل گیا۔

زخم کب آیا کسی غیر کے پتھر سے مجھے
کاٹ ڈالا ہے میری سوچ نے اندر سے مجھے
میں نے نفرت کے پہاڑوں سے لڑائی جیتی
موت آئی تھی فقط پیار کے کنکر سے مجھے

زری سوچ کر رہ گئی۔

''دکھ مجھے ابا تائی اماں کے رویے کا ہے، اپنے بھائی کے بدلنے کا ہے۔ ابا سوچیے تو سہی اِس گھر میں ہم کتنے لوگ رہتے ہیں اور دو الگ ہانڈیاں پکنے لگی ہیں۔ بھابی صاحبہ جو دل میں آتا ہے بولتی رہتی ہیں۔ محلے کے گھروں میں جاتی ہیں اور ہماری برائیاں کرتی ہیں۔ ابا مجھے اِس بات کا دُکھ ہے...... میرا ملال اِن باتوں پر ہے۔'' زری نے

ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں باپ کو جیسے تسلی سی دی۔
''کیا کڑا وقت ہوتا ہے...... جب ہم حقیقت سے آنکھیں چراتے ہوئے ایک دوسرے کو جھوٹی تسلیاں دے رہے ہوتے ہیں اِس کی اذیت بیٹی کی آنکھوں میں ڈوبتے اُبھرتے آنسو رفیق احمد کے دل میں گھاؤ ڈال رہے تھے۔
''خیر بیٹا! آج میں تم کو ایک نصیحت کرتا ہوں۔ عرفان کی بیوی پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا اور بیٹا زندگی میں کوشش کرنا کہ اِن لوگوں سے علیحدہ رہو۔ اللہ تمہارا گھر بسائے اور جب اللہ تمہارا گھر بسائے گا تو بیٹا صرف اپنی زندگی گزارنا۔ تم نے اِن کے لیے اور اِس گھر کے لیے بہت کیا ہے۔ اب بیٹا اپنے بارے میں سوچنا۔ عرفان نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔ میری زندگی کی جمع پونجی کا تو مجھے شاید اتنا ملال نہیں لیکن اُس کا رویہ اور بے انصافیاں مجھے تکلیف دیتی ہیں۔''
''ابا! فون......'' رفیق احمد کی بات کے دوران زری نے اُن کی طرف فون بڑھاتے ہوئے کہا۔
''کون......؟'' رفیق احمد نے ہاتھ فون کی طرف بڑھاتے ہوئے تجسس بھرے انداز میں پوچھا۔
''ابا موی ہے۔'' زری کے لہجے اور چہرے پر بہن کے لیے دلآویز محبت تھی۔
''ارے میری موی بٹیا! آج مجھے میری بیٹی بہت یاد آ رہی تھی۔ اللہ نے میری بیٹی کو اپنے گھربار کا کر دیا۔ اللہ کا احسان ہے۔'' کہتے ہوئے رفیق احمد نے فون کان سے لگا لیا اور زری باپ کو موی سے بات کرتے دیکھ کر کچن میں چلی گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اُس کے ابا کو رات کو بھوک لگتی ہے تو اُس نے سوچا ابا بات کر رہے ہیں تو وہ اُن کے لیے ایک گلاس دودھ ہی لے کر آ جائے۔
''بیٹا یہ دودھ تم پیو، میرے لیے کیوں لے آئیں۔''
''ارے ابا آپ لیجیے، ہم تو پانی بھی پئیں گے تو دودھ کی طرح لگے گا اور ابا جو آپ صحت مند تو ہم صحت مند۔ ارے لوگ ڈرتے ہیں کہ ہمارے ابا، سو جوانوں سے زیادہ جوان ہیں۔ میں تو ایک جوان ابا کی بیٹی ہوں۔'' گلاس میں دودھ اُنڈیلتے زری کو ایک پرانی بات یاد آئی تو اُس کے لبوں پر ایک خوبصورت سی مسکراہٹ رینگ گئی...... واقعی۔

محبت معنیٰ و الفاظ میں لائی نہیں جاتی
یہ وہ نازک حقیقت ہے جو سمجھائی نہیں جاتی

''ابا موی خیریت سے ہے۔'' زری نے دودھ کا گلاس باپ کو تھمایا۔ ماں باپ کا رشتہ بھی کیسا انوکھا رشتہ ہوتا ہے۔ وہ زری جو دُکھی، غمزدہ باپ کے پاس بیٹھی رو رہی تھی۔ باپ کی تسلیوں، شفقت اور محبت نے جیسے ہر زخم پر مرہم رکھ دیا تھا۔ وہ بھول گئی تھی کہ ابھی وہ کتنی دلبرداشتہ تھی۔ واقعی ماں باپ کا کوئی نعم البدل نہیں۔
''ارے بیٹا کیا کہنا۔ شادی ہو گئی، گھربار کی ہو گئی لیکن میری موی تو بچہ ہی رہی۔ بس نہ جانے کیوں ایک ہی ضد کیے جا رہی تھی کہ ابا آپ عرفان بھائی سے بہت محبت کرتے ہیں۔ آپ انہیں معاف کر دیں۔ میں نے کہا بھی بیٹا کہ وہ میری اولاد ہے۔ میں اُس سے ناراض نہیں ہوں لیکن بیٹا...... وہ نہیں مانی۔'' اُن کے لبوں پر پُرشفقت مسکراہٹ تھی۔
''میں نے اُس کی تسلی کے لیے کہہ تو دیا کہ میں نے معاف کر دیا لیکن بیٹا اِس طرح کسی کو معاف یا دعا تھوڑی دی جاتی ہے۔ معافی تو آتما دیتی ہے اور میری آتما اِس کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں۔ میں مجبور ہوں۔ وہ میری اولاد ہے، میں اُس کا کبھی بُرا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں اُس کو کبھی بددعا دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ لیکن جب دل پر ہاتھ رکھتا ہوں تو ایک ٹیس سی اُٹھتی ہے۔ بیٹا! عرفان میرا اکلوتا بیٹا ہے اور اُس کی ضد اور ناعاقبت اندیشیوں نے میرے گھر کے در و دیوار ہلا دیے۔ میرا دل اُس کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔'' رفیق احمد نے دل کا ایک زخم

اپنی سمجھدار بیٹی کے آگے کھولا۔

''چلیے چھوڑیے ابا! اولاد ہیں۔ اولاد سے تو غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔'' زرقون کی محبت نے باپ کو سمجھانا چاہا۔

''ہاں بیٹا لیکن اس معاملے میں کوئی مجھ سے ضد نہ کرے جب میرا دل راضی ہوگا میں عرفان تو کیا ہر کسی کو معاف کردوں گا۔ مجھے پیسوں کے نقصان کی پروا نہیں ہے۔ پیسہ تو جو تقدیر میں لکھا ہے، مل کر رہے گا۔ مجھے دُکھ عرفان کے رویے کا ہے۔ مجھے صدمہ عرفان کی تم سے بدگمانی کا ہے۔ لگتا ہے یہ دُکھ میری جان لے لے گا۔'' رفیق احمد کا لہجہ رو رہا تھا لیکن اُن کی آنکھیں خشک تھیں۔

زری چند لمحوں تک بالکل خاموش رہی۔ اُس کو لگا جیسے اُس کے پاس بولنے کو کچھ نہ بچا ہو۔ ہر طرف ایک عجیب سی اُداسی برسنے لگی۔ اُس کو لگا کھڑکی پر جھولتی بوگن ویلیا کے سفید پھولوں والی بیل جھومنا چھوڑ کر ساکت ہوگئی ہو۔ اُس نے نظر اُٹھا کر شکستہ وجود لیے، چپ چاپ، سوگوار سے باپ کو دیکھا۔

''یا اللہ! اِس عمر میں میرے ابا کو کیا کیا سہنا پڑ رہا ہے۔ میرے مالک! میرے ابا پر اور اُن کے ساتھ ہم سب پر رحم فرما۔'' زرقون نے دل کی گہرائیوں سے دعا کی۔

''ابا آج عبداللہ کی رپورٹس بھی تو آئی تھیں نا۔'' اچانک زرقون کو یاد آیا۔ عرفان اور ثمینہ سے لاکھ ناراض سہی لیکن عبداللہ میں تو اُن کی جان تھی۔

''ارے ہاں بیٹا میں تو بھول ہی گیا۔ عشاء کی نماز جب پڑھنے گیا تھا تو لیتا آیا تھا۔ میری الماری پر رکھی ہیں۔'' رفیق احمد نے چونکتے ہوئے کہا اور زرقون جو کمرے سے باہر نکل رہی تھی اُس کا دایاں ہاتھ بجلی کے بٹن پر تھا۔ اپنی جگہ رُک گئی۔

''تم جاؤ بیٹا! تم سو جاؤ۔ بہت رات ہوگئی۔ رپورٹ صبح دیکھ لینا۔ اِس وقت میری طبیعت کچھ بوجھل ہو رہی ہے۔'' رفیق احمد نے کہتے ہوئے کروٹ بدل لی۔

زرقون چند لمحوں تک خاموش کھڑی باپ کو آنکھیں بند کیے لیٹا دیکھتی رہی۔ اُس کا دل چاہا بھاگ کر جائے اور باپ سے لپٹ جائے اور اُن سے کہے ابا آپ اتنا اُداس نہ ہوا کریں۔ میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔ مجھے اور میرے دل کو آپ کی بہت تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ سارے لفظ گونگے ہوگئے۔ اُس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا۔ پلکوں پر اٹکا آنسو، بے دردی سے مسلا اور باپ کے کمرے کی لائٹ بند کرکے کمرے سے باہر نکل گئی۔

ایک لمحے کو اُس کی بے بسی پر کاتب تقدیر کا قلم بھی لڑکھڑایا۔

☆......☆......☆

''کیا مصیبت ہے کیا دروازہ توڑو گے۔ ارے آ رہی ہوں۔ آ رہی ہوں۔'' رقیہ بیگم جو زرینہ سے بات کر رہی تھیں۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولیں۔ آج دوپہر سے زرینہ آئی ہوئی تھی۔ نہ بچوں کو لائی تھی نہ میاں چھوڑنے آیا تھا۔ زرینہ جب سے آئی تھی بہت خاموش تھی۔ رقیہ بیگم ابھی بھی اُسی سے باتیں کر رہی تھیں۔ اُن کو یہ تو معلوم تھا کہ اُن کی سب بیٹیاں زبان درازی میں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں اور یقیناً اِس وقت زرینہ بھی جھگڑا کرکے ہی آئی ہے۔ لیکن وہ چاہ رہی تھیں کہ اُن کو زرینہ بتائے تاکہ وہ جا کر اُس کے میاں کا گریبان پکڑ سکیں۔ لیکن زرینہ تو جیسے چپ شاہ کا روزہ ہی رکھ کر آئی تھی۔

''دھڑ......دھڑ......دھڑ......اب کے دروازہ بہت زور زور سے دھڑ دھڑایا گیا۔

''ارے بھیا آ رہی ہوں۔ یہاں ویسے ہی زندگی بیزار ہے رکو کیا موت آ رہی ہے۔ کیا دروازہ توڑو گے۔'' کہتے

ہوئے جب رقیہ بیگم نے دروازہ کھولا۔

''ہٹو اماں رستے سے۔'' دروازے پر پولیس تھی اور لیڈی پولیس نے کرخت آواز میں کہتے ہوئے اُلٹے ہاتھ سے رقیہ بیگم کو دھکا دیا اور گھر کے اندر گھستی چلی گئی۔

''ارے بہن کیا ہوا؟ اِس طرح اندر کیوں آ رہی ہو۔ یہ شریفوں کا گھر ہے۔'' رقیہ بیگم بوکھلا کر لیڈی کانسٹیبل کے پیچھے لپکتے ہوئے بولیں۔

''شریف عورتیں...... شریفوں کا گھر...... تم لوگ عورتیں کہلانے کے قابل نہیں ہو۔ خون چوسنے والی ڈریکولا کی نسل، قتل و غارت گری کرتی پھرتی ہو اور شریف ہونے کا دعویٰ کرتی ہو۔ لعنت تمہاری شکل پر۔'' اُس مردانہ شکل والی کرخت چہرہ اور سخت زبان میں بات کرتی لیڈی کانسٹیبل نے زمین پر تھوکتے ہوئے کہا۔

ایسی ذلت، ایسی شرمندگی، رقیہ بیگم نے تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ سارا محلہ دروازے پر اکٹھا ہو چکا تھا۔ رقیہ بیگم کی سٹی گم تھی۔ دوسروں کو انگلیوں پر نچانے والی عورت کو دن میں تارے نظر آ رہے تھے۔ صحن میں کھڑی رقیہ بیگم کے پاؤں جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے۔ لیڈی کانسٹیبل اپنی ساتھیوں کے ساتھ گھر میں جا چکی تھی۔

''کیا معاملہ ہے جناب۔'' برابر والے احمد صاحب نے آگے بڑھ کر سب انسپکٹر سے پوچھا۔ جو لاپروائی سے ماچس کی تیلی سے اپنے کان میں جمع شدہ میل نکال نکال کر اپنی ہتھیلی پر جمع کر رہا تھا۔

''ارے جناب شاب کیا کر رہے ہو۔ بڑی بی کی بیٹی نے اپنے میاں اور بچوں کو قتل کیا ہے اور اِس بڑھیا نے بیٹی کو چھپا رکھا ہے۔ ہم قاتلہ کو لینے آئے تھے لیکن لگتا ہے بڑھیا کو بھی گرفتار کرنا پڑے گا۔ بڑی چنٹ بڑھیا لگ رہی ہے۔''

''چل باہر...... یہ رہی سر۔'' اِس سے پہلے کہ احمد صاحب کچھ کہتے، اس سے پہلے کہ رقیہ بیگم کوئی صفائی پیش کرتیں۔ اندر سے لیڈی کانسٹیبل زرینہ کو چوٹی سے گھسیٹتی لیے چلی آئی۔

رقیہ بیگم کو ایسا لگا جیسے آسمان اُن کے سر پر آ گرا ہو۔ جیسے اُن کے پیر زمین میں دھنستے چلے جا رہے ہوں۔ انہوں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے خاموش کھڑی زرینہ کی طرف دیکھا۔ لوگ کھڑکیوں اور چھتوں سے لٹک لٹک بن پیسے کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے لیکن جب پڑتی ہے تو کمر کے دو ٹکڑے کر دیتی ہے۔ رقیہ بیگم کو احساس ہوا۔

''ہاں میں نے قتل کر دیا۔ اُس نے میرے ذریعے ثمینہ سے پیسے لیے اور اُن پیسوں سے الگ گھر لے کر دوسری شادی کر لی۔ وہ بچوں کو کہہ رہا تھا کہ وہ اُس کے نہیں ہیں۔ ہاں میں نے قتل کر دیا۔ میں نے اُس کو اور بچوں کو زہر دے دیا۔ اور میں اماں تم کو بھی قتل کر دوں گی کہ تمہاری تربیت نے ہماری زندگیاں برباد کر دی ہیں۔ میں سب کو قتل کر دوں گی۔'' زرینہ ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔

محلے کے مرد، عورتیں اپنے کانوں کو ہاتھ لگا رہے تھے اور کچھ ایسے دو قدم پیچھے ہٹے جیسے زرینہ ابھی تلوار نکال لے گی۔

''ارے بھیا، میری بچی ایسی نہیں ہے۔ ارے کسی نے اِس پر کوئی عمل کروا دیا ہے۔ اُس کے اثر کے تحت بول رہی ہے۔ اری کیا بکواس کر رہی ہے۔ کیا کتے کی طرح بھونکے جا رہی ہے۔'' رقیہ بیگم گھبرا کر کبھی پولیس سے اور کبھی زرینہ سے مخاطب ہو رہی تھیں۔

''سر اندر سے اور کچھ نہیں ملا۔'' پولیس نے سارا گھر دیکھ ڈالا تھا۔ الماریوں کے پٹ کھلے تھے۔ حتیٰ کہ فرج میں رکھے گوشت کے پیکٹ تک زمین پر نکال کر ڈال دیے تھے۔ پلنگ اور صوفے اُلٹے پڑے تھے۔ رقیہ بیگم نے ڈوبتے دل اور سُن ہوتے ہاتھ پیروں کے ساتھ اپنے گھر کی ابتر حالت کو دیکھا۔

''تم دونوں بہت ماہر اور خطرناک لگتی ہو۔ آلۂ قتل چھپالیا۔ کہاں چھپایا ہے۔ کیا اپنے باپ کی قبر میں رکھ کر آئی ہے۔'' لیڈی کانسٹیبل نے زرینہ کے منہ پر تھپڑ مارا اور ایک لات رقیہ بیگم کی کمر پر لگی۔

''دونوں کو ہتھکڑی لگاؤ۔ اِن دونوں کو لے کر چلو۔'' سب انسپکٹر نے کہا۔

''م......م...... مجھے کیوں۔'' رقیہ بیگم کی آواز ساری زندگی میں پہلی مرتبہ لڑکھڑائی۔

''تجھ سے صاحب کا نکاح کروائیں گے۔'' ایک پولیس والے نے اپنے پیلے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے قہقہہ لگایا۔

'یا اللہ ذلت بھی ذلت جیسی...... زندگی میں یہ دن بھی لکھا تھا۔ واقعی...... کیا میں اتنی بداعمال اور بری عورت ہوں کہ میرا تماشا اللہ نے ساری دنیا کے سامنے بناڈالا۔ میرا سفید چونڈا...... چار غیروں کے بیچ میں رگڑ دیا گیا۔' رقیہ بیگم کانپ رہی تھیں۔

لاکھ تیز سہی، لڑی اور چالاک اور فسادن سہی لیکن یہ سب تو زندگی میں اُن کے تصور میں نہیں تھا۔ گھر کا دروازہ کُھلا تھا۔ محلے والے دیکھ رہے تھے۔ کچھ حیران تھے۔ کچھ کانوں کو ہاتھ لگا رہے تھے۔ رقیہ بیگم رو رو کر اپنی بے گناہی کی قسمیں کھا رہی تھیں۔ اپنی بیٹی ثمینہ کو آوازیں دے رہی تھیں۔ لیکن لگتا تھا حشر کا میدان لگا ہے۔ کوئی سُن ہی نہیں رہا تھا۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنے روتی ہوئی وہ گھسیٹی جا رہی تھیں۔ زرینہ کو مارا جا رہا تھا اور پھر زرینہ پولیس وین میں بٹھا دی گئی۔ رقیہ بیگم نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے ایک دفعہ پھر سارے منظر کو دیکھا۔ وین میں بیٹھی زرینہ کو دیکھا جس کے چہرے پر تھپڑوں کے نشان تھے۔ اپنے پیچھے تالیاں بجاتے محلے کے بچوں کو دیکھا اور پھر جیسے سارے منظر دُھندلاتے چلے گئے اور پھر وہ فرش پر آ رہیں۔

☆......☆......☆

سارے لوگوں کی کِل کِل میری اماں پر پڑ گئی اور جو کیا زرینہ نے ٹھیک کیا۔ اُس کا میاں کمبخت تھا ہی اِس قابل کہ اُس کو زہر دے دیا جائے۔ لیکن دیکھنا میں کسی بدنصیب کو نہیں چھوڑوں گی۔ خاص کر میری سُسرال والوں نے تو میرے گھر والوں اور خاص کر میری اماں کا پیچھا پکڑا تھا۔ میں کسی بدنصیب کو نہیں چھوڑوں گی۔'' ثمینہ نے بستر پر خاموش لیٹی ماں کو دیکھتے ہوئے خالہ بتّو سے کہا۔

رقیہ بیگم کو جسم کے سیدھی طرف والے حصے پر فالج کا حملہ ہو گیا تھا۔ اُن کی زبان بند ہو گئی تھی۔ اُن کے پلنگ پر اُن کا ایک پیر ہتھکڑی سے بندھا ہوا تھا۔ پلنگ سے ذرا فاصلے پر ایک پولیس والا بیٹھا اُونگھ رہا تھا۔ جس وقت ثمینہ کو پتا چلا تو وہ ہانپتی کانپتی خالہ بتّو کے ساتھ چلی آئی۔ گو کہ رقیہ بیگم قتل کے کیس میں گرفتار ہوئی تھیں۔ وہ مجرم تھیں یا نہیں اِس کا فیصلہ عدالت کو کرنا تھا۔ لیکن اِس ملاقات کے لیے ثمینہ نے بہت ہاتھ پیر مارے۔

'اونہہ! رقیہ بیگم تو ساری زندگی صرف لوگوں کے خلاف منصوبے بناتی رہی۔ فہمیدہ کو تیری حسد کھا گئی۔ اُس کا بھرا پُرا گھر اُجڑ گیا۔ اُس کی بچی رُل گئی اور ایک فہمیدہ کیا تُو نے تو نا جانے کتنوں کے گھر اُجاڑے کیسی آگ تھی تیرے اندر جو بجھتی ہی نہ تھی۔ بھلا مانس مرد ملا اور تُو، تُو نے ساری زندگی اُس کی ناشکری کی۔ اری اللہ کے بعد میں اِس بات کی گواہ ہوں کہ تُو نے اُس کو زہر دیا تھا۔ پان میں رکھ کر نیلا تھوتھا دے دیا تھا۔ وہ مر گیا اور تُو آزاد ہو گئی۔ اور میں...... میں بدنصیب ہمیشہ تیرے گناہوں کی رازدار رہی۔ تیرا ساتھ دیتی رہی اور مجھے اپنے گناہوں کے بدلے اپنے بیٹے کو دینا پڑا۔ ہائے میرا ایک ہی تو بچہ تھا۔ نہ سر پر سہرا سجا، نہ میں نے اُس کی زندگی کی کوئی بہار دیکھی۔ کیسا جوان جہان چلا گیا۔ مجھے یقین ہے میں فہمیدہ کے صبر میں آ گئی۔ لیکن اللہ کا شکر ہے اللہ نے مجھے توبہ کا موقع دیا اور انشاء اللہ کم از کم فہمیدہ کے ساتھ کیے گئے

روپے کا میں کفارہ بھی ادا کروں گی۔ لیکن تُو...... تجھے اللہ نے توبہ کی توفیق ہی نہ دی۔ تیری زبان جو تُو کندھے پر ڈالے پھرتی تھی، آج خاموش ہے۔ تیری زبان پر فالج گر گیا اور رحم کھانے کے بجائے میرا دل کرتا ہے تیری شکل پر تھوک دوں۔'
رقیہ بیگم پر فالج گر گیا تھا۔ اُن کی زبان کے ساتھ ساتھ پہلے دایاں حصہ مفلوج ہوا اور پھر بایاں بھی مفلوج ہو گیا۔ اِس وقت اُن کی عجیب سی حالت تھی۔ اُن کے دونوں ہاتھ معافی کے انداز میں جڑے تھے اور دونوں پیر آپس میں جڑ گئے تھے۔ اُن کا سر تکیے سے اونچا تھا جتنے بھی تکیے رکھ لو...... سر اونچا رہتا۔ تکیے پر نہ ٹکتا تھا آنکھوں میں بے بسی اور جڑے ہاتھوں سے پلنگ پر لیٹی وہ جھولا سا جھول رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ معافی مانگ رہی ہوں۔
''تجھے اب کون معاف کرے گا۔ رُقی!'' خالہ بٹو نے آنسو بہاتی ثمینہ کو ماں کے منہ سے ٹپکتی رال اپنے دوپٹے کے پلو سے پونچھتے دیکھ کر دل ہی دل میں بے پناہ نفرت محسوس کرتے ہوئے سوچا۔

☆......☆......☆

''بھئی امی اب آپ شانزے سے یہ توقع مت کریں کہ وہ آپ کو جھک جھک کر سلام کرے گی یا ابا کے لیے تازہ روٹی پکائے گی۔ بھئی ہماری بیگم ایک مالدار گھر سے تعلق رکھتی ہیں اور امی اُن کے گھر کا ایسا ماحول نہیں ہے۔'' فراز نے انتہائی کھردرے لہجے میں کھانا پکاتی ماں سے کہا۔
''تم اتنے بڑے غلام نکلو گے فراز میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ ارے میں نے کب کہا ہے کہ بیگم صاحبہ روٹی ہانڈی کریں۔ اُس کے لیے میں ہوں نا تمہارے خاندان کی ملازمہ لیکن میاں یہ رات دن اُن کے رنگ برنگے کزن، وقت بے وقت چلے آتے ہیں اور پھر بازار سے دونے آتے ہیں۔ اونچی آواز میں گانے سُنے جاتے ہیں اور کل تو بہو بیگم نے حد ہی کر دی نہ پوچھا نہ کچھا۔ میں پوچھتی رہ گئی گلے میں پٹی جیسا دوپٹا بمشکل ڈالا اور چل دیں اپنے لمبے بالوں والے کزن کے ساتھ فلم دیکھنے۔ بیٹا یہ شریفوں کا گھر ہے، محلے والے دیکھیں گے، رشتہ دار سُنیں گے تو کیا کہیں گے۔'' جہاں آرا بیگم نے غصے سے کھولتے ہوئے اِدھر اُدھر لاپروائی سے دیکھتے فراز سے کہا۔ یہ وہ فراز تو نہیں تھا جو اُن کی آنکھ کا اِشارہ دیکھتا تھا، یہ تو کوئی اور تھا۔ یہ اُن کا بیٹا تو نہیں تھا۔ ہاں یہ شانزے کا شوہر تھا۔
''دیکھیں امی جیسی سوسائٹی سے شانزے تعلق رکھتی ہے وہاں یہ سب باتیں بہت عام ہوتی ہیں۔ یہ تنگ نظری صرف ہماری کلاس اور خاص کر ہمارے گھر میں دکھائی جاتی ہے۔ اور ویسے بھی شانزے سے شادی آپ نے کی ہے اور اب آپ ہی شکایتیں کر رہی ہیں۔'' فراز نے ساری برائی کا ٹوکرا ماں کے سر پر انڈیلا۔
''تو بیٹا! تمہاری گردن پر پستول تھوڑا ہی رکھی تھی۔ تم خوش تھے، تمہاری رضامندی کے بعد بات آگے بڑھی تھی۔ بہت خوب بھئی، بہت خوب۔ اِس گھر میں سب سے پتلی گردن میری ہی ہے۔ ابا، بیٹا ہر جرم میرے سر پر ڈال دیتے ہیں۔
''معاف کیجیے گا امی میں نے شادی کی ہے کوئی جرم نہیں کیا۔ اور برائے مہربانی اب ہر وقت شانزے کو برا مت کہا کریں، مجھے بہت برا لگتا ہے اور جب مجھے کسی بھی بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے تو آپ کیوں اعتراض کر رہی ہیں اور ویسے بھی جلد ہی شانزے کا ڈیفنس والا بنگلہ تیار ہونے والا ہے۔ میں اُس کے ساتھ وہاں شفٹ ہو جاؤں گا۔ پھر آپ آرام سے رہیے گا اپنے رشتہ داروں اور محلے داروں کے ساتھ۔'' فراز نے انتہائی بدتمیز لہجے میں کہا اور اندر کی طرف بڑھ گیا اور جہاں آرا پر تو جیسے حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے توے پر روٹی جلتی رہی لیکن اُن کے دل کی تکلیف اور جلن ہر چیز پر جیسے حاوی ہو گئی۔ یہ اُن کا فرمانبردار بیٹا تھا۔ یہ کس کی زبان بول رہا تھا۔ اِس کے خیالات و انداز راتوں رات کیسے بدل گئے۔ یہ تو ایک رات ماں کو دیکھے بغیر نہیں رہتا تھا یہ الگ گھر میں جانے کی بات کر رہا ہے۔

جہاں آرا بھنچتے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے سوچ رہی تھیں لیکن وہ بھول رہی تھیں کہ مظلوم کی آہ اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ وہ بھول رہی تھیں کہ ہمیشہ اُس کو تکلیف دینے سے ڈرو جس کے پاس شکایت کے لیے اللہ کے سوا کوئی نہ ہو اور مظلوم کی آہ! اللہ تک پہنچ چکی تھی، اُس کا احساس جہاں آرا بیگم کو ہوا تو وہ کانپ کر رہ گئیں۔

☆......☆......☆

''میں تو بھئی اِس گھر کی بدنصیبیوں سے تھک گئی ہوں۔ اچھی خاصی زندگی تھی خوامخواہ بدنصیبوں کے ٹولے میں آ پھنسی۔ اور تو اور میری اماں کو دیکھو وہ ایسی بیمار ہوگئی ہیں میں اُن کو دیکھوں، اپنے بچے کو دیکھوں یار میں تو تھک گئی۔'' ثمینہ نے اپنی بچپن کی دوست عاصمہ سے کہا۔

''تمہاری نند کی کہیں بات لگی۔'' عاصمہ نے خاموشی سے صحن دھوتی اُجڑی صورت، پپڑی زدہ ہونٹوں والی زرقون کو دیکھتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں پوچھا۔

''نہیں، بہن اِن کو کون پوچھے گا۔ اماں ابا مزے سے اوپر چل دیے اور اِس کُتیا کو میرے سینے پر مونگ دلنے کے لیے چھوڑ گئے۔ بیچاری نے بچپن سے تایا کے بیٹے کو پھنسا رکھا تھا۔ ارے وہ ایسا زبردست لڑکا تھا۔ ایسی لات ماری ہے اِس کے منہ پر کہ رات دن ماتم کرتے نہ تھکتی ہے۔'' ثمینہ نے انتہائی سفاکی سے کہا۔

زرقون جو صحن دھونے کے بعد، صحن میں لگے بیسن پر کھڑی نماز کے لیے وضو کر رہی تھی، نے پلٹ کر انتہائی تکلیف سے ثمینہ کو دیکھا۔

''تمہاری نند ایسی لگتی تو نہیں۔'' عاصمہ کو زرقون اچھی لگی۔

''آنکھیں کس پر نکال رہی ہو زرقون بیگم! دونوں آنکھیں نکال کر ہتھیلی پر دھر دوں گی۔ اب یہ گردن کا سریا نکال کر کباڑیے کے ہاتھ بیچ دو۔ جن کے بل پر تم پھولتی تھیں وہ اپنی اپنی قبروں میں لیٹے اپنی بے انصافیوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔ اب اِس گھر میں رہنا ہے تو طریقے سے رہو۔ اور سُن لو تم عاصمہ، اِس ناگن کو میں نے بھگتا ہے۔ میں جانتی ہوں یہ کیسی ہے۔'' ثمینہ نے تڑخ کر عاصمہ کو بھی لتاڑا۔

''بھابی میں آپ کو کچھ نہیں کہتی لیکن برائے مہربانی میرے ماں باپ کے متعلق سوچ سمجھ کر بولا کریں۔'' زرقون کا لہجہ حتمی تھا۔

''کیوں بولوں...... ایک دن بڑے میاں نے مجھے چین سے رہنے نہ دیا۔ یہاں رہنا ہے تو یہ سب سُننا پڑے گا۔ ورنہ باندھو اپنا بوریا بستر اور نکلو یہاں سے۔ بہت خیراتی ادارے ہیں، جا کر کہیں منہ چھپا لو، ورنہ کسی اپنے جیسے کو پھنسا لو، میں تم کو دھکا دوں۔ کوئی شریف تو تم کو پوچھے گا نہیں۔ بڑی آئیں بیگم صاحبہ، ماں باپ کی حمایتی۔'' ثمینہ دیکھ رہی تھی کہ زرقون نے نماز کی نیت باندھ لی ہے لیکن وہ مسلسل بولے چلی جا رہی تھی۔

جب سے رفیق احمد زرقون کو اِس بھری دنیا میں اکیلا چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی کے پاس گئے تھے، زرقون پر اِس گھر میں سانس لینا مشکل ہو گیا تھا۔ زری بنیادی طور پر ایک سیدھی سادی لڑکی تھی۔ باپ اور ماں کی زندگی نے اُس کو ایک عجیب سا اعتماد بخش رکھا تھا اور جانے والے اپنے ساتھ اُس کا حوصلہ، اعتماد، خوشی، تحفظ، ہر چیز لے گئے۔

اُس نے ثمینہ کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ہار گئی اور وہ جیتتی بھی کس بل بُوتے پر۔ اُس کا بھائی اُس کو مارنے کھڑا ہو گیا تھا۔ کیسا غم لگا تھا اُس کو جب عرفان نے اُس کو گالی دی تھی۔

کیسی ذلت محسوس ہوئی تھی اُس کو جب ثمینہ نے اُس کی ڈائری کا وہ ورق جو اُس نے رات کی تنہائی میں فراز

کے لیے لکھا تھا، ہر جاننے والے کو پڑھ پڑھ کر سُنایا تھا۔
کیسا دل نوچا تھا اُس کا اِن لوگوں نے۔ موی، رفیق احمد کے انتقال پر آئی تھی لیکن اُس کی حالت ایسی تھی کہ اُس کو واپس جانا تھا۔ وہ پریگیننٹ تھی۔ یہاں کے حالات کا وہ اِس قدر ٹینشن لے رہی تھی کہ ڈاکٹر نے مس کیرج کا خدشہ ظاہر کیا تو زرقون نے زبردستی اُس کو ابا کی قسم اور اللہ رسول کا واسطہ دے کر واپس اُس کے گھر دبئی بھیج دیا تھا۔
ثمینہ تو چند دن بھی اپنے اوپر غلاف نہ چڑھا سکی اور زری کی زندگی اُس نے اُس کے ہی گھر میں تنگ کر دی۔
لیکن زری کیا کرتی، سوائے صبر کے، اور وہ صبر کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

''لو بھئی اماں کھالو۔'' ثمینہ نے انگلیوں کے درمیان ڈبل روٹی مسل کر رقیہ بیگم کے منہ میں ڈالی۔ رقیہ بیگم منہ نہیں چلا سکتی تھیں تو اُن کو تقریباً پیس کر کھانا کھلانا پڑتا تھا۔
''دیکھو ثمینہ میں تم کو ایک مشورہ دیتی ہوں۔ ہاتھ مرے بھی تو سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ تمہارا یہ گھر بہت مہنگا ہے، کم از کم ایک سے ڈیڑھ کروڑ کا ہوگا۔ تم سب سے پہلے اِس کانٹے کو نکالو۔ اِس کی شادی کر دو۔'' عاصمہ نے دبے دبے انداز میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے آنسوؤں کے ساتھ قرآن پڑھتی زری کو پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔
''اور کیا تمہاری نند بولتی نہیں ہے۔'' عاصمہ نے ایک بات ختم کرتے ہی دوسری بات پوچھی۔
''ارے بہت لمبی زبان ہے اِس کی لیکن کس سے بات کرے گی۔ میں تو اِس بدنصیب سے بات کرتی ہی نہیں بلکہ اس کے سائے سے بھی دور رہتی ہوں۔ کم بخت ماں باپ کو کھا گئی۔ تایا تک نے رشتہ نہیں لیا۔ ارے ہماری اماں کہتی تھیں کہ بدنصیبوں سے دور رہنا چاہیے۔ تمہاری نظر میں ہو کوئی رشتہ تو تم دکھا دو لیکن بھائی یہاں کچھ نہیں رکھا ہے۔ کوئی خالی ہاتھ اِس بدنصیبی کی پوٹ کو لے جانا چاہے تو آئے ورنہ پڑی سڑتی رہے میں تو ایک دمڑی نہیں دینے کی اِس کم بخت کو۔''
''میری بچی کو زیور کا بہت شوق ہے۔ میرا دل چاہتا ہے اِس کے بارات کے سوٹ پر سونے کے پھول ٹکواؤں۔'' فہمیدہ بیگم نے زری کے جہیز کے صندوق سے اُس کا کمخواب کا جوڑا نکالتے ہوئے، پیچھے پلٹ کر اخبار پڑھتے رفیق احمد سے کہا۔
''ہاں بھئی! یہ بات آپ کئی دفعہ کہہ چکی ہیں۔ میں نے حساب لگوایا تھا۔ دس تولے میں تقریباً ڈھائی سو پھول بنیں گے۔ میں نے الگ رکھ دیا ہے دس تولے سونا، بنوا دیجیے گا بیٹی کا جوڑا اپنی خواہش کے مطابق۔'' رفیق احمد نے مسکراتے ہوئے محبت سے بیٹی کے جہیز کی ایک ایک چیز کو احتیاط سے ٹرنک میں رکھتی بیوی سے کہا۔
''اور بھئی میں تو بھابی جان سے کہوں گی کہ بری میں تاج کے ساتھ سیٹ لے کر آئے گا۔ میری ایک ہی تو بیٹی ہے۔ میں انشاء اللہ اپنی بچی کو شہزادیوں کی طرح اِس گھر سے رخصت کروں گی۔'' فہمیدہ بیگم نے ٹرنک کو تالا لگایا اور میاں کے پاس آ بیٹھیں۔
''ارے بھئی بھائی جان اور بھابی جان کا جو دل چاہے لے کر آئیں۔ میں خود اپنی بیٹی کو تاج پہنا کر رخصت کروں گا۔ انشاء اللہ ایسی شادی کروں گا کہ دنیا دیکھتی رہ جائے گی۔ اللہ وہ دن لے کر آئے۔'' رفیق احمد کے لہجے میں ایسا آرمان تھا کہ کمرے میں ماں باپ کے لیے چائے لے کر آتی زری کو اپنی قسمت پر رشک اور اپنے ماں باپ پر بے انتہا پیار آیا۔
لیکن آہ! بیٹیوں کے نصیب میں کیا لکھا ہوتا ہے، خواب بنتے ماں باپ کیا جانیں۔ برسوں پرانی، ایک بات نے زری کو خون کے آنسو رُلا دیا۔
''ہائے امی کاش آپ ہوتیں! ہائے ابا! ایسی ذلت کا تو میں نے سوچا بھی نہ تھا۔'' زری نے قرآن کو سینے سے لگا کر بھینچتے ہوئے ماں باپ کو یاد کیا۔

جو چمن خزاں سے اُجڑ گیا
میں اُسی کی فصلِ بہار ہوں

"زری کے لیے آنسوؤں کو روکنا مشکل ہو گیا۔ وہ جو ہنستی بہت خوبصورت تھی۔ آج بہت روئی تھی اور کوئی آنسو پونچھنے والا نہ تھا۔ لیکن کیا واقعی کوئی آنسو پونچھنے والا نہ تھا۔
"نہیں کوئی ہے! کاتبِ تقدیر اُس کے آنسوؤں کو دیکھ رہا تھا اور اُس کا قلم تیزی سے کچھ لکھ رہا تھا۔"

☆......☆......☆

"السلام وعلیکم! ڈاکٹر تابندہ، میں پاکستان سے عرفان بات کر رہا ہوں۔" جیسے ہی تابندہ نے ایک غیر مانوس نمبر دیکھا تو فون اٹھالیا اور دوسری طرف عرفان کی آواز سُن کر اُس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔
اِس احمق کو یہ ٹرک کس نے سکھا دی۔ توبہ ہے، احمق، گدھا، نمبر بدل بدل کر اب فون کر رہا ہے۔ اس کو صبر کیوں نہیں آجاتا۔ اِس کا مال...... اُس نے ایک نظر انتہائی خوبصورتی سے ڈیکوریٹ گھر کو دیکھا۔ آتش دان کی بجھتی ہوئی آگ میں اُس نے خشک لکڑی ڈالی۔ لکڑی بھک بھک جلنے لگی۔ اُس نے گھڑی دیکھی۔ احمد جمال دو دن سے نیویارک گیا ہوا تھا۔ وہ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے اُس کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ ڈاکٹر احمد جمال نیویارک سے ریذیڈینس کرنا چاہتا تھا۔ ارادہ تو ڈاکٹر تابندہ سنبل کا بھی ریذیڈینس کرنے کا تھا لیکن احمد جمال نے بہت محبت سے اُس کو اپنے بازوؤں میں بھر کر، اُس کے ماتھے پر محبت کی مہر ثبت کرتے ہوئے اُس کو منع کر دیا تھا۔ احمد جمال چاہتا تھا بس اب تابندہ سنبل گھر سنبھالے، اور فیملی بنائے اور ڈاکٹر تابندہ سنبل بہت شاطر ہونے کے باوجود، تھی تو ایک عورت ہی نا اور عورت مرد کی محبتوں کے دو لفظوں سے موم ہو جاتی ہے اور پھر مرد کی محبت میں وہ موم کی طرح اپنی شبیہ کھو دیتی ہے اور پھر اُس کا محبوب جس سانچے میں چاہتا ہے اُس کو ڈھال دیتا ہے اور وہ خوشی خوشی ڈھل جاتی ہے۔ وہ محبوب کی محبت میں ہار جاتی ہے۔
"ڈاکٹر صاحبہ!" عرفان کی آواز اُبھری اور تابندہ سنبل نے غصے سے فون کو گھورا اور پھر......
"دیکھیے یہاں کوئی ڈاکٹر تابندہ نہیں رہتی۔ یہ غلط نمبر ہے۔ برائے مہربانی آئندہ اِس نمبر پر فون مت کیجیے گا۔" اُس نے بہت رُکھائی سے کہا۔
"کیسی باتیں کر رہی ہیں ڈاکٹر صاحبہ! آپ کو میں نے اپنی ساری جائیداد دے دی اور آپ ایسی باتیں کر رہی ہیں۔ میں آپ پر مقدمہ کروں گا۔ میں آپ کے خلاف ایف آئی آر درج کرواؤں گا۔" عرفان دھاڑا۔
"مسٹر آرام سے بات کرو۔ نہ میں تم کو جانتی ہوں اور نہ ہی تمہاری کسی گیدڑ بھبکی سے ڈرتی ہوں اور مسٹر جہاں دل چاہے F.I.R درج کرواؤ۔ میں نہ پاکستان کو اور نہ تم کو جانتی ہوں اور نہ ہی میں کبھی واپس آؤں گی۔" اور پھر اُس نے دوسری طرف عرفان کی بات سننے بغیر فون بند کر دیا اور پھر سم نکال کر آتشدان میں ڈال دی۔ اور سم اِسی طرح لمحوں میں بھسم ہو گئی جیسے عرفان کی حماقتوں سے اُس کا خاندان۔
عرفان چند لمحوں تک پتھرائی آنکھوں سے فون کو دیکھتا رہا اُس نے سُن ہوتے دماغ اور ہاتھ پیروں کے ساتھ ہاتھ میں پکڑی عبداللہ کی بائیوسی کی رپورٹ کو دیکھا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اُس کو لگا۔ وہ اکیلا رہ گیا ہے۔ اُس کو ماں کی محبت بھری آغوش اور باپ کے مشورے کی شدید طلب ہوئی۔ اُس نے اپنے دونوں خالی ہاتھ دیکھے اور پھر اُن ہاتھوں سے بالوں کو جکڑ کر رونے لگا۔ ایسے جیسے رونا اُس کا مقدر ٹھہرا ہو۔

☆......☆......☆

''بیٹا تم دین کی بات کر رہے ہو نا۔ تم اللہ اور اُس کے رسول کی بات کر رہے ہو۔ چہرے کو اللہ کے رسول کی سنت سے سجاتے ہو۔ تو میرے بچے شادی بھی تو سُنت ہے نا۔ تو کیا تم اِس سنت پر عمل نہیں کرو گے؟ تو کیا تم سنتوں اور فرض میں سے اپنی سہولت اور مرضی کے احکام چھانٹ لو گے؟ دین میں مرضی نہیں چلتی، دین بجالانے کا نام ہے۔ تم دین کی طرف آئے ہو۔ تم کو اللہ نے ہدایت دی۔ تو ہدایت کو پوری طرح قبول کرو۔ تمہاری ماں کی خواہش ہے، تو ماں کا حکم مانو۔ ماں باپ کا اولاد پر حق ہے۔ ایک نیک عورت سے نکاح، ایک اچھے مسلمان خاندان کی بنیاد ہے۔'' ڈاکٹر احمد منیب سے جب مرتضٰی نے ذکر کیا کہ اُس کی والدہ اُس پر شادی کے لیے زور دے رہی ہیں لیکن اُس کا اعتبار اب عورت پر سے اُٹھ گیا ہے۔ وہ اپنی باقی ماندہ زندگی بھلائی کے کاموں اور دین کی تبلیغ پر صرف کرنا چاہتا تھا۔ اُس کو زندگی میں اب پتا چلا تھا کہ سکون کیا ہوتا ہے؟ وہ سکون کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔

''ہمارے دین میں خاندان بنانے کو اہمیت دی گئی ہے۔ تم خاندان بناؤ۔ یہ اللہ اور اُس کے رسول کی رضا ہے۔ یہ تمہاری ماں کی خواہش ہے۔''

مرتضٰی جب عشاء کی نماز پڑھ کر بستر پر آیا تو اُس کو ڈاکٹر احمد منیب کی بات یاد آئی۔

'میں جانتا ہوں، سب سمجھتا ہوں لیکن میں ایک انسان ہی تو ہوں۔ میں کسی کو تکلیف دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا لیکن میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ اگر میں کسی لڑکی سے نکاح کروں گا تو میں اُس سے محبت نہیں کر سکوں گا۔ اُس لڑکی کی زندگی ایک امتحان بن جائے گی۔ میرا اپنے دل پر اختیار نہیں۔ میں اب محبت نہیں کر سکتا۔'

مرتضٰی نے اپنے آپ سے کہا اور تکیے پر سر رکھتے ہوئے سائیڈ ٹیبل پر رکھے لیمپ کی لائٹ آف کر دی۔

کمرے میں بکھری سفید روشنی میں اُس نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ بستر پر اُس کے برابر میں تھی۔ وہ اپنی حسین انگلیوں سے اُس کے بالوں کو سہلا رہی تھی۔ اُس کے گلے میں باریک سی چین میں لٹکا ہوا وہ مونو گرام اُس کی آنکھوں کے سامنے لہرا رہا تھا۔ اُس کا چہرہ جھکا ہوا تھا۔ اُس نے سر پر نماز کی طرح سفید دوپٹا لپیٹا ہوا تھا۔ سفید آستینوں میں سے اُس کی دودھیا کلائیاں دمک رہی تھیں۔ اُس کی انگلیوں میں ایک عجیب سی تاثیر تھی، ایک ٹھنڈک تھی، ایک اطمینان اور ایک محبت تھی۔

اُس کی آنکھیں ایک محبت بھرے سرور کے تحت بند ہو گئیں۔ وہ گہری نیند میں چلا گیا۔ سکون، اطمینان، اور محبت نے اُس کو اپنے حصار میں لے لیا۔ کمرے میں ہلکی ہلکی سسکیوں سے اُس کی آنکھ کھلی تو وہی لڑکی جس کا چہرہ، وہ دیکھ نہیں پا رہا تھا، جس کا چہرہ دُھندلا رہا تھا۔ جائے نماز پر بیٹھی رو رہی تھی۔ وہ اللہ کے حضور گڑگڑا رہی تھی۔ وہ دبے پاؤں بستر سے اُٹھا اور اُس کے قریب جا بیٹھا۔ اُس نے اُس کے قریب جا کر اُس کی سرگوشیاں، جو وہ اپنے اللہ سے کرنا چاہ رہی تھی سننا چاہیں۔

''میرے مالک، میں تھک گئی۔ میرے لیے رونے والے، میرے لیے دعا کرنے والے، میرے ماں باپ تیرے پاس ہیں، میں یہ سب نہیں سہہ سکتی۔ ایسی ذلت، میرے مالک! ایسی تنہائی، ایسی بے چارگی، میرے اللہ میاں! بس جو شخص بھی آپ نے میرے نصیب میں لکھا ہے، اُس کو بھیج دیں۔ اللہ میاں مجھے پناہ چاہیے۔ اللہ میاں میں آپ کی رضا میں راضی ہوں۔ بس اللہ مجھ پر رحم کر دے۔'' اُس کے بعد اُس کے لفظ اُس کی سسکیوں میں مدغم ہونے لگے۔ مرتضٰی نے اُٹھ کر میز پر سے جگ میں سے پانی نکال کر اُس کو دیا۔ جس کو اُس لڑکی نے نہیں لیا بلکہ وہ سجدے میں چلی گئی اور سجدے میں اُس کا وجود لرزنے لگا۔ اُس کی سسکیاں سارے کمرے میں گونجنے لگیں۔ مرتضٰی نے سسکیوں کی آواز پر گھبرا کر آنکھیں کھول دیں، کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ لیکن زمین پر ایک جائے نماز بچھی تھی اور اُس جائے نماز کے پاس پانی سے بھرا گلاس بھی رکھا تھا۔ مرتضٰی گم صم اُس گلاس کو دیکھ رہا تھا اور اُس کی آنکھوں کے

سامنے سونے کی باریک چین میں وہ لاکٹ جھول رہا تھا۔

☆......☆......☆

"کئی ماہ ہوگئے ہیں اُن کی شادی کو۔" زرقون نے سوکھے ہونٹوں اور نم آنکھوں کے ساتھ خالہ بنّو کو بتایا۔
"یا اللہ! اتنا بڑا ظلم کرنے میں، میں بھی شریک تھی۔ بیٹا مجھ کو معاف کر دینا۔ میں یہ نہیں کہوں گی کہ میں بے قصور ہوں۔ نہیں میں تمہاری قصوروار ہوں۔ میں بدنصیب انسانوں کو خوش کرنے کے چکر میں اللہ کو ناراض کر بیٹھی۔ میرا تو اتنا منہ بھی نہیں ہے کہ میں تم سے معافی مانگ سکوں۔ لیکن پھر بھی میری بچی تم مجھے معاف کر دو۔ میں نے اتنا ظلم کیا اور تم نے میرے بیٹے کے علاج کے لیے اپنا سارا زیور دے دیا۔ تم کون ہو؟ تم اِس دنیا کی باسی تو نہیں ہو۔ آفرین ہے اُس ماں پر جس نے تم جیسی بیٹی کو پیدا کیا۔ بس میری بچی مجھ بیوہ بدنصیب پر ایک اور رحم کر دو۔ مجھے معاف کر دو۔ اللہ کے واسطے مجھے معاف کر دو۔" خالہ بنّو زرقون کے آگے ہاتھ جوڑے، رو رو کر معافی مانگ رہی تھیں۔
"آپ اِس طرح کی باتیں نہ کریں۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے اور ویسے بھی خالہ بنّو میں اللہ کی رضا میں راضی ہوں۔ کیونکہ میں جانتی ہوں جب اللہ ہم کو ہماری مرضی کی چیز دیتا ہے تو ہمیں شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہم نے جو چاہا اُس نے دے دیا اور جو وہ ہماری مرضی کی چیز ہمیں نہ دے تو ہمیں اور زیادہ شکر ادا کرنا چاہیے کہ اب وہ ہمیں اپنی مرضی سے دینا چاہتا ہے۔ اور میں جانتی ہوں اللہ تعالیٰ جب اپنی مرضی سے کوئی چیز دیتا ہے تو اپنی شان کے مطابق دیتا ہے۔ میرے ماں باپ چلے گئے۔ میرے دل میں ایک زخم کی طرح اُن کی یاد، اُن کی محبتیں پل رہی ہیں۔ لیکن کسی کے چلے جانے میں کسی کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ دنیا میں ہر کام اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے، بس یہ اللہ کی مرضی ہے کہ وہ کس انسان کو کس کام کے لیے چُنتا ہے۔ افسوس اِس بات کا نہیں کہ ہماری زندگیوں میں اتنا زہر گھولا گیا، افسوس اِس بات کا ہے کہ اللہ نے اِس کام کے لیے آپ کو چُنا۔ میرے وہ رشتے جن پر میں اپنی ذات سے زیادہ بھروسہ کرتی ہوں۔ اُن رشتوں کا مُنہ کالا ہوا۔ آپ میری امی کی کزن بھی ہیں اور دوست بھی، آپ میرے لیے قابلِ احترام ہیں، اِس لیے پلیز اِس طرح ہاتھ نہ جوڑیں۔" زرقون نے خالہ بنّو کے دونوں جڑے ہوئے ہاتھوں کو کھولتے ہوئے کہا۔
"اللہ تم کو خوش رکھے بیٹا۔ اللہ تم کو زندگی میں ہر سُکھ اور آرام دے۔ لیکن میری بچی تمہاری اعلیٰ ظرفی نے آج مجھے جس پاتال میں پھینکا ہے وہ میں تمہیں بتا بھی نہیں سکتی۔ آج اپنے مرے ہوئے بیٹے کی قسم کھا کر میں تم سے کہتی ہوں کہ زندگی میں کبھی بھی تم کو میری ضرورت پڑی تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میری بچی اپنے آپ کو کبھی اکیلا نہیں سمجھنا۔ گو کہ یہ بات کہنے کا میرا منہ تو نہیں ہے لیکن پھر بھی تم مجھے اپنی ماں کی طرح سمجھو۔ لیکن بیٹا یہ تو بتاؤ کہ بھائی رفیق احمد کو اچانک کیا ہوا تھا؟" خالہ بنّو نے آنسو پونچھتے ہوئے، سینے میں اٹکتا ایک سوال پوچھا۔ "ابا کو......" زری کے منہ سے نکلا۔

☆......☆......☆

"بھابی آپ عثمان کو سنبھالیے میں عبداللہ کو دوائی پلا دیتی ہوں۔" زرقون نے بخار میں پھنکتے عبداللہ کو گود میں لیتے ہوئے ثمینہ سے کہا۔
"ارے کیا دیکھوں میں اپنے بچوں کو، اندر اماں گندگی میں لتھڑی پڑی ہیں۔ میں نے عرفان سے کہا بھی تھا کہ اماں کے لیے ڈائپر لے آئے گا۔ لیکن اُن کا تو پتا ہی نہیں چلتا۔ کن چکروں میں لگے رہتے ہیں۔ اماں کو بھی صاف کرنا ہے۔ اللہ معاف کرے بدبو کی وجہ سے ناک نہیں دی جا رہی۔ ارے بلکہ بھئی تم میرے بچے کو تو چھوڑو۔ تم تو ویسے ہی بہت بدنصیب ہو۔ جس کے قریب جاتی ہو وہ پھٹکا نہیں کھاتا۔ ارے میں تو بدنصیبوں میں گھر کر خود کو بھی

بدنصیب سمجھنے لگی ہوں۔تم ایسا کرو، تم جا کر ذرا اماں کو صاف کر دو۔ میں اپنے بچے کو خود دوائی پلا دوں گی۔'' ثمینہ نے زرقون سے کہتے ہوئے عبداللہ کو اپنی طرف کیا۔

''بھابی میں......'' زرقون نے تھوک نگلا۔

''ہاں......ہاں بھئی تم اور کون......ظاہر ہے تم لوگوں کی بدنصیبی کی وجہ سے سارے گھر میں جھاڑو سی پھر گئی ہے۔اب کوئی نرس رکھنے کی تو ہماری سکت ہے نہیں اور ظاہر ہے میں تو اپنی اماں سے بہت محبت کرتی ہوں۔اُن کو لاوارث تو نہیں چھوڑ سکتی نا۔اور بھئی اُن کی گندگی بھی صاف نہیں کر سکتی۔تو جاؤ جا کر اماں کی صفائی کر دو۔جاؤ! کھڑی کیوں ہو۔'' ثمینہ کی آواز تیز ہوئی۔

''کیا بات کر رہی ہیں آپ؟'' اور زری تم کو کیا ہو گیا ہے۔یار تم کیسے بھول رہی ہو تم ایم ایس سی پوزیشن ہولڈر لڑکی ہو۔تم تو اسٹیج پر کھڑی ہو کر جب بولنا شروع کرتی تھیں تو سامنے والے کے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔تم کو کیا ہو گیا۔تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔''

نرگس جو آج صبح ہی لندن سے آئی تھی اور اِس وقت زری سے ملنے آئی تھی تو ثمینہ کی باتیں اور زری کی خاموشی نے اُس کو حیرت زدہ کر دیا۔زری کو ایسی شرمندگی ہوئی کہ وہ نظریں نہیں اُٹھا سکی۔وہ اپنی واحد دوست سے یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ تم اب آئی ہو؟ اب جب میری ساری کشتیاں جل گئیں۔اب جبکہ میرے دونوں ہاتھ میرے دل کی طرح خالی رہ گئے ہیں۔نرگس تم اِس وقت کیوں آئی ہو۔میری ذلت، میری رسوائی، تمہارے سامنے......یا اللہ! کاش زمین پھٹ جائے اور میں اُس میں سما جاؤں، زری نے کانپتے وجود اور برستی آنکھوں کے ساتھ جیسے اپنے آپ سے کہا۔

''لو بھئی یک نہ شُد دو شُد۔ایک کم تھی کہ تم بھی آ گئیں۔بی بی یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے اور ہمارے گھر کے معاملات میں کسی ایرے غیرے کو بولنے کی بالکل اجازت نہیں ہے۔اور چلو بی بی مظلوم! جا کر اندر جو کہا ہے وہ کرو۔'' ثمینہ نے زرقون سے کہا۔

''پھوپو! پھوپو......'' عبداللہ زرقون کی طرف ہاتھ بڑھا کر رونے لگا۔

''ارے جاؤ اپنی پھوپو کم بخت، بدنصیب کے پاس۔'' ثمینہ نے غصے سے عبداللہ کو زری کی گود میں تقریباً پٹخا اور اندر چلی گئی کیونکہ اندر سے رقیہ بیگم کی عجیب سی ڈراؤنی آوازیں آ رہی تھیں۔

''زری......'' نرگس نے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے زری کی کمر کو سہلاتے ہوئے کہا۔زری اپنی دوست کے سینے سے لگی رو رہی تھی، بلک رہی تھی کتنے آنسو جو اُس نے اپنے آپ سے بھی چھپا رکھے تھے وہ آنسو ایک تواتر سے بہہ رہے تھے۔روتے روتے اُس کو لگ رہا تھا کہ اُس کا دم نکل جائے گا۔''میری جان! زرقون! یہ سب کیا ہے، تم کو کیا ہو گیا ہے؟''

''بس نرگس میری ہمت جواب دے گئی، میں تھک گئی۔میرا دل ہی نہیں چاہتا کہ میں ریزسٹ کروں۔اِس عورت کی زیادتیوں نے میرے اعصاب توڑ دیے ہیں۔یتیمی کتنی بُری چیز ہوتی ہے، یہ کوئی مجھ سے پوچھے۔نرگس میں اکیلی رہ گئی ہوں۔'' زرقون نے دونوں خالی ہتھیلیوں کو دیکھتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر رونے لگی۔

''لیکن زری اِس طرح ہمت تو نہیں ہارتے نا۔اِس طرح اپنے آپ کو ایک آسان شکار کی طرح دوسروں کے آگے تھوڑا ہی پھینک دیتے ہیں۔''

''نہیں ایسا نہیں ہے۔میں نے شروع میں بہت ہمت کی، احتجاج کیا۔اپنے حق کے لیے لڑی بھی اور اپنا حق جتایا بھی، لیکن نرگس، کچھ نہیں ہوا۔میری کون حمایتی ہے۔کون کہے گا کہ تم غلط ہو، میری بچی ٹھیک ہے۔عرفان بھائی اپنی بیوی کی آنکھوں سے دیکھتے اور اُن کے کانوں سے سُنتے ہیں۔اور یہ عورت......یہ عورت اِتنی بری ہے۔یہ بات کو اِس طرح پلٹنا جانتی ہے کہ ایک لمحے کے لیے تم خود بھی حیران رہ جاؤ گی۔''

''خیر تم نے سنا فراز......''

''پلیز میں فراز کا نام بھی سننا نہیں چاہتی۔'' زرقون نے ہاتھ اُٹھا کر نرگس کو ٹوکا اور نرگس چپ ہوگئی کہ زری کا لہجہ قطعیت لیے ہوئے تھا۔''آفتاب بھائی ٹھیک ہیں۔'' زری نے اپنے آپ کو کنٹرول کرتے ہوئے موضوع بدلنا چاہا۔

''آفتاب ٹھیک ہیں۔ ساری دنیا ٹھیک ہے، آرام سے ہے۔ مسئلہ ہے تمہارا۔ میں تمہارے لیے ایک رشتہ لے کر آئی تھی۔ اِس وجہ سے میں پاکستان آئی ہوں۔'' نرگس نے سرگوشیانہ انداز میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے زری سے کہا۔

''اونہہ......شادی!'' میری شادی کا تو تم خیال چھوڑ دو۔ ابھی کچھ ہفتے پہلے تایا ابا، میرا ایک رشتہ لے کر آئے تھے تو ہمارے گھر سے صاف انکار کر دیا۔ تایا ابا نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ میں سارا خرچہ خود اٹھاؤں گا لیکن ہمارے بھائی بھاوج نے صاف انکار کر دیا۔''

''تو کیا یہ لوگ تمہاری شادی کرنا نہیں چاہتے۔'' نرگس حیران ہوئی۔

''پتا نہیں اِن لوگوں کی کیا مرضی ہے۔ ویسے تو ہر آئے گئے سے بھابی مجھ بدنصیب کے رشتے کے لیے کہتی پھرتی ہیں۔'' زری نے حیران بیٹھی نرگس کو بتایا۔

''خیر زری! تم اپنے آپ کو اکیلا نہیں سمجھو۔ میں، موی اور سب سے بڑھ کر اللہ تمہارے ساتھ ہے۔ تم نے زندگی میں کسی کے ساتھ بُرا نہیں کیا تو یاد رکھو تمہارے ساتھ بھی بُرا نہیں ہوگا۔ اللہ کے رحم اور انصاف سے اُمید رکھو۔'' نرگس نے اُس کو تسلی دی۔''اچھا یہ بتاؤ تمہارے ابا کو کیا ہوا تھا۔ حد ہوگئی ہے گھر میں داخل ہوتے ہی ایسی غیر متوقع سچویشن نظر آئی کہ میں تم سے پُرسہ کرہی نہیں سکی۔ اللہ میں تم کو بتا نہیں سکتی جب امی کا فون آیا تو مجھ پر کیا گزری تھی۔''

''ابا کو......بس میں بدنصیب تھی۔ میرے ابا بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔'' زری ایک دفعہ پھر رونے لگی۔

''پلیز میری جان ایسی باتیں نہ کرو۔ میری بہن میرے دل کو تکلیف ہوتی ہے۔''

''کیا ہوا ابا......'' اُس نے سینے کو دونوں ہاتھوں سے بھینچے درد کی شدت میں تڑپتے باپ سے پوچھا۔

''بس بیٹا سینے میں درد ہو رہا ہے۔ سانس لینے میں تکلیف ہو رہی ہے۔ تم بھائی جان کو فون کر دو۔'' رفیق احمد نے درد کی شدت سے تڑپتے ہوئے گھبرائی ہوئی بیٹی سے کہا۔

''عرفان بھائی پہلے آپ ٹیکسی لے کر آئیے۔'' زری نے گھبرا کر پیچھے کھڑے عرفان سے کہا۔

''کہاں کی ٹیکسی......؟'' ایسا لگا جیسے عرفان اپنے حواسوں میں نہیں ہو۔

''کہیں کی بھی بھائی! کارڈیو کی، آغا خان کی کہیں کی بھی، جلدی کریں۔ ابا کو اسپتال لے کر جانا ہے۔ زری تیز تیز بولی اور عرفان تیزی سے پلٹ گیا۔

''ابا آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ آپ ٹھیک ہیں ابا، ابا ہمت کریں۔ ابا پلیز میرے لیے ہمت کریں۔ ابا مجھے آپ کی بہت ضرورت ہے۔ ابا مجھے آپ کی بہت ضرورت ہے۔'' زری نے اپنے آنسوؤں کا گلا گھونٹتے ہوئے لیکن رُندھے ہوئے لہجے میں باپ سے کہا۔ وہ باپ کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے سیڑھی اُتر رہی تھی۔

''بیٹا میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ میرے اندر اب ہمت نہیں ہے۔'' رفیق احمد بے بسی سے آخری سیڑھی پر بیٹھ گئے۔

''کوئی بات نہیں ابا! بھائی ٹیکسی لے کر آنے والے ہیں۔ بس ابا اسپتال چل رہے ہیں۔ ابا پلیز ہمت کریں۔ آپ تو بہت ہمت والے ہیں۔'' اُس نے ثمینہ کے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے باپ سے کہا۔ کمرے میں پھیلا اندھیرا اِس بات کا اعلان کر رہا تھا کہ ثمینہ گہری نیند سو رہی ہے۔ درد کی ایک ٹیس زری کو اپنے سر میں اُٹھتی محسوس ہوئی۔

''بیٹا لگتا ہے وقت ختم ہوا۔'' رفیق احمد کی آواز لرزی۔ ''اللہ نہ کرے ابا۔'' زرقون کانپ اُٹھی۔
''بیٹا میں تم سے راضی ہوں۔'' رفیق احمد کا لہجہ عجیب ہوا۔ زرقون خاموش رہی۔ اُس کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔
''بیٹا عبداللہ بیمار ہے۔ بیٹا وہ بہت بیمار ہے۔ عبداللہ بہت بیمار ہے۔ تمہارے ساتھ لوگوں کا رویہ میرے لیے تکلیف دہ ہے۔ بیٹا تم روتی ہو تو سمجھو میں روتا ہوں۔ میں تکلیف میں ہوں۔''
''ابا آپ اتنی فکر کیوں کر رہے ہیں، وہ ٹھیک ہو جائے گا۔'' اُس نے اسپتال کے بستر پر لیٹے باپ کے دونوں ہاتھوں کو محبت سے چومتے ہوئے کہا۔ ''اور میں خوش ہوں۔''
''زندگی اکثر ہمیں وہ نہیں دیتی جو ہم چاہتے ہیں لیکن بیٹا زندگی میں جو ملے اُس کو بخوشی قبول کرنا ہی مومن کی نشانی ہے۔ لیکن عبداللہ کی رپورٹ، عبداللہ کی رپورٹ مجھ سے نہیں پڑھی گئی۔ اور بیٹا تم...... تم میری جان......'' رفیق احمد کو ایک بار پھر سینے میں شدید درد کا احساس ہوا۔

''لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ محمد رَسُول اللہ۔''

''کیا ہوا میرے بھائی کو......'' نفیس احمد کی گھبرائی ہوئی آواز پر اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ اور اُسی لمحے رفیق احمد کے ہاتھ کی گرفت اُس کے ہاتھ میں ڈھیلی پڑ گئی۔ ''رفیق میرے بھائی۔''
''ابا......'' زری کی چیخ میں نفیس احمد کی آواز اور عرفان کی ڈاکٹر کو پکارتی آواز ڈوب سی گئی۔ اور فراز جس نے کئی ماہ کے بعد زری کو دیکھا تھا۔ اُس کے دل پر زری کی حالت دیکھ کر ایک گھونسہ سا لگا۔ اور اُس کو شادی کے کئی ماہ بعد احساس ہوا کہ وہ کسی سے بھی شادی کرے۔ زری کی حیثیت اُس کی زندگی میں خاص ہے۔ وہ دور کھڑا حسرت سے تکتا رہا۔ یہ جانے بغیر کہ اب وہ زری کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا کہ عورت محبت میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن تذلیل نہیں اور فراز نے زری کی محبت کی تذلیل کی تھی۔ خمیازہ تو اُسے بھگتنا ہی تھا۔

☆......☆......☆

''تم کو لحاظ نہیں ہے، شرم نہیں ہے۔ ماں اِن حالوں پر پڑی ہے، بہن جیل میں سڑ رہی ہے اور تم اِس یتیم، معصوم کے ساتھ یہ سلوک کر رہی ہو۔'' خالہ بٹو نے ثمینہ کو اُس کے رویے پر درشتی پر ٹوکا۔
''او ہو! معصوم! خالہ بٹو کیا سیاست دان لوٹا ہوں گے جو تم ہو۔ ایک وقت تھا کہ تم کو یہ بدنصیب ناگن لگتی تھی اور آج معصوم واہ......واہ......اور ویسے بھی بھئی میں تو صاف کہہ رہی ہوں۔ جس کو بھی بیگم صاحبہ سے ہمدردی ہو، وہ بیگم صاحبہ کا ڈولا اپنے گھر لے جائے۔'' ثمینہ نے تمسخرانہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔
''ہاں، ہاں میں لے جاؤں گی۔'' خالہ بٹو غصہ سے پھنکاریں۔
''بھئی وہ کیوں کہیں جائے گی، اُس کے باپ کا گھر ہے۔'' نرگس نے بیچ میں مداخلت کی۔
''بس بس تم تو چپ رہو۔ ایری غیری۔ چلو بی بی اپنے گھر کی راہ لو۔ اپنے گھر سے بہت فالتو ہو، جو ہر وقت یہاں دھرنا دیے بیٹھی رہتی ہو۔'' ثمینہ نے دو منٹ میں نرگس کی تو عزت ہی اُتار کر رکھ دی۔
''بھابی پلیز۔ آپ نرگس کو ایک لفظ بھی نہ کہیں۔'' زری تڑپ کر بولی۔
''تم تو چپ رہو...... بڑی آئیں نرگس کو ایک لفظ بھی نہ کہیں۔ ارے کیوں نہ کہوں۔ بڈھا بڑھیا اپنے اپنے ٹھکانوں کو سدھارے تو سوچا تھا اب سکھ کا سانس لوں گی تو یہ مصیبت...... یہ ڈھول میرے گلے میں ڈال گئے۔ اب رات دن اِس ڈھول کو پیٹوں۔'' ثمینہ کی اتنی زبان ہو گی نرگس تو نرگس خالہ بٹو کو بھی اندازہ نہیں تھا۔

''اری تیرا بچہ اتنا بیمار ہے، پھر بھی تیرا دل نرم نہیں ہوا۔''
''ہاں بیمار ہے تو کیا ہوا۔ جاندار ہے تو بیمار بھی ہوگا اور بیمار ہے تو ہمارے پاس پیسے ہیں۔ ہم اپنے بچے کا علاج کروا سکتے ہیں۔'' ثمینہ نے جان بوجھ کر خالہ بٹو کے کلیجے میں چٹکی نوچی اور خالہ بھی بولتے بولتے چپ ہوگئیں۔
'ہوتا ہے نا، کبھی کبھی ایسا۔ لگتا ہے لفظ اور اعصاب دونوں نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا ہو۔ بالکل ایسے ہی خالہ بٹو اِس عورت نے میری زبان کو تالے لگائے ہیں۔ میرے اعصاب کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔ میں اِس عورت کی بدزبانی اور ظلم سے نہیں جیت سکتی میں نے ہار مان لی۔ لفظوں کا خزانہ مجھے وراثت میں ملا ہے۔ لیکن لفظ بدتہذیبی کے آگے چھوٹے پڑ جاتے ہیں۔ یہ اتنی چھوٹی اور مکار عورت ہے کہ چٹ بھی اپنی اور پٹ بھی اپنی کرنا جانتی ہے اور کرتی ہے۔'' زری سوچتی رہ گئی۔ ''اری ثمینہ توبہ کر۔ اللہ سے ڈر۔ اتنا پیسے پر نہ پھول، ایک لمحہ لگتا ہے عرش سے فرش پر آنے میں۔ توبہ کر توبہ۔'' خالہ بٹو نے جلبلا کر کہا۔
''فی الحال تو فرش والے تیزی سے عرش کی طرف جا رہے ہیں۔ ہیں نا زرقون صاحبہ!'' ثمینہ نے کمینگی کی انتہا کرتے ہوئے زری کو مخاطب کیا۔ اُس نے ایک تاسف بھری نظر ثمینہ پر ڈالی اور اُٹھ کر اندر اپنے کمرے میں چلی گئی کہ اب ثمینہ کی باتیں اُس کی برداشت سے باہر ہوگئی تھیں۔
نرگس نے چند لمحے کا توقف کیا اور پھر وہ خاموشی سے اُٹھ کر بوجھل قدم لیے باہر نکل گئی کہ وہ زری کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ زرقون رونا چاہتی ہے اور وہ چاہتی تھی کہ زرقون اکیلے میں روئے، دل بھر کر روئے۔ اُس کو زرقون کے لیے جلد از جلد کچھ کرنا تھا۔ اُس کو زرقون کو اِس ماحول سے نکالنا تھا۔ لیکن ثمینہ...... ہاں اُس کو ثمینہ کے لیے سوچنا تھا۔ لیکن کیا...... فی الحال اُس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

سارے کمرے میں ایک عجیب پُرسکون اندھیرا تھا۔ فراز نے اپنے برابر میں لیٹی نیم برہنہ نائٹی میں ملبوس شانزے کو دیکھا۔ بیوی ہونے کے باوجود اُس کو نیم برہنگی پسند نہ آئی۔ سیاہ دوپٹے کے ہالے میں جگمگاتا چہرہ، ناک میں لشکارے مارتی وہ باریک سی ہیرے کی لونگ، شیروانی کالر اور فل آستینوں والی قمیض، سیدھی چوٹی میں سمٹے وہ بال، اور کمر پر بل کھاتی وہ چوٹی، وہ زری تھی۔
زری کتنا بدل گئی۔ اُس کی آنکھیں، اُس کی آنکھیں کتنی تھکی ہوئی اور غمزدہ تھیں۔ کتنا کرب تھا اُس کی آواز میں۔ میں سمجھتا تھا کہ جب بھی اُس کے سامنے آؤں گا تو وہ پہلے کی طرح میری طرف دیکھے گی، وہ مسکرائے گی۔ لیکن اُس نے، اُس نے تو میرے منہ سے نکلے تسلی کے لفظ بھی سُننا گوارہ نہ کیے۔ اُس کے لہجے میں، اُس کے انداز میں کس قدر اجنبیت تھی۔ وہ میری زری تھی...... تھی...... ہاں تھی...... میں سمجھتا تھا وہ میری رہے گی۔ لیکن نہیں، وہ کیا تھا۔
وہ کون سا لمحہ تھا کہ میں نے زری کو چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ فراز نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔
''تو کیا تم سمجھتے تھے کہ زرقون تم سے ملتی رہے گی۔ تم بیوی کے ساتھ شب بسری کرو گے، دادِ عیش دو گے اور زری...... تمہارے دل کی تسکین کے لیے رہے گی۔ جب تمہارا دل چاہے گا تم خوبصورت گفتگو کرو۔ ایک شریف عورت کو دیکھو اُس کو ملو۔ جب تمہارا دل چاہے کہ کوئی تم سے محبت کرے تو تم زری کے پاس جا بیٹھو۔ اور جب تمہارا دل چاہے کہ تم عیاشی کرو تو تم بیوی کے بستر پر جا بیٹھو۔ تم اِس قابل ہی نہیں تھے کہ زری جیسی لڑکی تم کو ملتی۔ تمہاری وہ حیثیت ہی نہیں تھی کہ زرقون کی محبت تمہارے دامن میں ڈال دی جاتی۔ تم اِس قابل ہو کہ چند سکوں کے لیے، بیوی کی

باتیں سنو...... دھتکاریں کھاؤ۔ ایسا کیا تھا شانزے کے پاس جو زری کے پاس نہیں تھا۔ ہاں زری کے باپ کے پاس حرام کی کمائی کے ڈھیر نہیں تھے۔" فراز کے ضمیر نے فراز کی کمر پر ہتھوڑے مارے۔

"نہیں میں نے زری کو پیسے کے لیے نہیں چھوڑا۔" فراز نے فریاد کی۔

"بکواس مت کرو۔ تم شانزے کے حسن اور دولت کے آگے ہی ڈھیر ہوئے تھے۔" اُس کا ضمیر دھاڑا۔

"میری بہن مشکل میں تھی۔ میری امی کی خواہش تھی۔" فراز نے اپنا دفاع کیا۔

"اوہو! تم کو تو جیسے بہن سے بہت محبت ہے اور تم تو اپنی ماں کے بہت فرمانبردار ہو۔ مسٹر فراز! یہ دھوکے تم کسی اور کو دینا۔ میں تمہارا ضمیر ہوں، جس کو نہ تم دھوکہ دے سکتے ہو اور نہ ہی بہلا سکتے ہو۔ یہ بات کیوں نہیں مان لیتے تم کو کبھی بھی زری سے محبت تھی ہی نہیں۔ تمہارا اُس سے کوئی دلی تعلق نہیں تھا۔ بس ایک وقتی وابستگی تھی جو شانزے کی دولت کے آگے بھربھری ریت کی طرح بیٹھ گئی۔ سمندر کے جھاگ کی طرح غائب ہوگئی۔ تم...... تم کیا جانو محبت کیا ہوتی ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ جن سب چیزوں کے لیے تم نے زری جیسے انمول ہیرے کو چھوڑا۔ وہ تو تم کو ملی بھی نہیں۔ شانزے تو بس ایک عالی شان گھر میں رہتی تھی۔ وہ خود تو عالی شان نہیں تھی۔ اُس کا بدبودار اور بیہودہ کردار تمہارے حصے میں آیا۔ وہ جو کچھ لائی اُس کو وہ خود استعمال کرتی ہے اور تم...... تم تو ایک غلام کی طرح اُس کے پیچھے پیچھے پھرتے ہو۔ تمہاری حیثیت ہے ہی کیا۔" اُس کے ضمیر نے قہقہہ لگایا اور فراز کا سارا وجود پسینے میں نہا گیا۔

"ہاں...... واقعی میری حیثیت کیا ہے؟" فراز نے جیسے اپنے آپ سے سوال کیا۔

"بس اب ساری زندگی خود سے سوال کرنا اور خود ہی کو جواب دینا...... تم...... تم اسی قابل تھے۔ زری جیسی لڑکی کے تم قابل تھے ہی نہیں۔ کہاں زری اور کہاں تم۔ چند پیسوں کے عوض محبت، خلوص اور وعدوں کا سودا کرنے والے بے غیرت، ضمیر فروش۔" فراز کا ضمیر...... حد سے زیادہ سچائی بیان کر رہا تھا۔

"خاموش رہو، چپ رہو۔" فراز اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر چیخا۔

"زری آج بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ وہ میری ہے۔ وہ میرے لیے تڑپ رہی ہے۔ میں آج بھی اگر اُس کی طرف بڑھوں تو وہ میرے لیے بانہیں پھیلا دے گی۔ وہ مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتی تھی۔"

"اور تم!" فراز کے ضمیر نے اُنگلی اُٹھا کر سوال کیا۔

"تم کیا سمجھتے ہو۔ وہ مظلوم تمہاری بیوفائی پر چار آنسو بہا کر خاموش ہوگئی تو کوئی تم سے سوال کرنا والا نہیں ہے۔ تم ہر رات گہری نیند سو جاؤ گے۔ نہیں...... نہیں مسٹر فراز! ابھی میں جاگ رہا ہوں اور میں تم کو سونے نہیں دوں گا۔"

"میں تم پر ثابت کردوں گا کہ زری مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میں اِس قابل ہوں کہ زری جیسی لڑکی میرے لیے ہر بات سہہ لے گی۔ میں تم پر ثابت کردوں گا۔" فراز جنونی ہو رہا تھا اور ضمیر ہنستا ہی جا رہا تھا کہ بعض باتوں کے جواب نہیں ہوتے لیکن اُس کے باوجود اُن پر قہقہہ تو نکل ہی جاتا ہے نا......!

☆......☆......☆

"بھئی تم تو واقعی اتنی پیاری ہو کہ تمہارے لیے تخت و تاج کو بھی ٹھکرا دینا چاہیے، آفتاب نے تو صرف مجھ سے منگنی ہی توڑی ہے۔" حیا نے محبت سے نرگس کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ آج آفتاب نرگس کو حیا سے ملوانے لایا تھا کہ آفتاب کی شادی کے موقع پر حیا ملک سے باہر تھی اور سب اِس لیے خاموش ہوگئے تھے کہ اُس کی دل کی حالت اور جذبات کا سب کو اندازہ بھی تھا اور خیال بھی تھا۔

اور اب جب آفتاب لندن سے نرگس کے ساتھ چند دن کے لیے آیا اور اُس کو پتا چلا کہ حیا بھی Vacation کے لیے پاکستان آئی ہوئی ہے تو وہ دوڑا چلا آیا۔ ''خیر تم سے منگنی توڑنا تو تخت و تاج ٹھکرانے سے زیادہ بڑی بات تھی۔'' آفتاب نے سچائی سے کہا۔ نرگس نے ترچھی نظروں سے آفتاب کو دیکھا اور پھر حیا کی طرف دیکھتے ہوئے دوستانہ انداز میں مسکرا دی۔ ''لیکن نرگس میں ایک سوال آپ سے۔ I Am Sorry میں تم سے کروں گی کیونکہ تم بہت اپنی اپنی سی ہو۔'' حیا نے اپنائیت سے کہا۔

''Oh! Its My Pleasure'' نرگس نے اپنی مخصوص محبت بھری مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ اُس کو حقیقتاً حیا بہت ہی پسند آئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ محبت کیا چیز ہوتی ہے کہ آفتاب نے اِس لڑکی کے مقابلے میں مجھے چُنا واقعی۔

محبت سدھ بدھ کھو دیتی ہے...... محبت دیوانہ کر دیتی ہے..... محبت زمین کو آسمان کر دیتی ہے..... محبت مہان کر دیتی ہے..... محبت کیا سے کیا کر دیتی ہے..... واقعی!..... محبت حواس کھو دیتی ہے

''چلو تم تو ہو ہی اتنی معصوم، اتنی پیاری کہ یہ پاگل مزید پاگل ہو گیا لیکن تم کو اِس جنگلی بکرے میں کیا نظر آیا۔ ہائیں!'' حیا نے شرارت سے آنکھیں نچاتے ہوئے کہا۔

''حیا!'' آفتاب بلبلایا۔

''دیکھو نرگس میں نے صحیح کہا تھا نا جنگلی بکرا۔'' حیا قہقہہ مار کر ہنسی۔

''چلو خدا کا شکر ہے میں تو بچ گیا لیکن اب جو بھی اِس جنگلی بلی کو بیاہنے آئے گا تو دیکھنا میں کیسے کیسے بدلے لوں گا۔'' آفتاب نے دھمکی دی۔

''تو......''

''لو بھئی مبارک ہو۔ بہت بہت مبارک ہو۔'' اِس سے پہلے حیا اپنی بات مکمل کرتی مسز روحی جنید خوشی سے بولتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔

''السلام وعلیکم آنٹی!'' آفتاب اور نرگس نے مودبانہ کھڑے ہو کر سلام کیا۔

''وعلیکم السلام اَفی۔ بھئی اب سب شادی کی تیاریاں کرو۔ مرتضٰی شادی کے لیے تیار ہو گیا ہے۔'' مسز روحی جنید نے خوشی سے بے حال ہوتے ہوئے بتایا۔

''کیا مطلب!'' آفتاب چونکا۔

''مرتضٰی کی شادی......''

''ہاں اَفی! مرتضٰی نے شبانہ کو طلاق دے دی تھی۔ ناکافی عرصے پہلے، پھر تو جیسے اُس کا دل ہی شادی اور عورت کے نام سے بدکنے لگا تھا۔'' مسز روحی جنید نے آفتاب کی حیرت کو دور کیا۔ کیونکہ آفتاب کو آج پہلی دفعہ پتا چلا تھا کہ مرتضٰی اپنی بیوی کو طلاق دے چکا تھا۔

''اور اَفی تم کو پتا ہے مرتضٰی کا دین کی طرف بہت رجحان ہو گیا ہے۔ اللہ نے میرے بیٹے کو دنیا کے ساتھ ساتھ دین کی دولت بھی بھرپور دی ہے۔ مرتضٰی یکسر بدل گیا ہے اور......''

''بس رہنے دیں ممی، پتا ہے اَفی ہماری ممی مرتضٰی کے معاملے میں اتنی ایموشنل ہو جاتی ہیں کہ صبح تک بغیر کسی فل اسٹاپ اور کومہ کے اپنے بیٹے کی شان میں قصیدے پڑھ سکتی ہیں اور تمہاری بیگم صاحبہ جو بیچاری کسی مرتضٰی نامی چڑیا سے واقف بھی نہیں ہیں، بور ہوتی رہیں گی۔'' حیا نے نرگس کی خاموشی کو دیکھتے ہوئے موضوع بدلنا چاہا۔

''نہیں......نہیں میں بالکل بور نہیں ہورہی بلکہ میں آنٹی کی خوشی کو محسوس کررہی ہوں۔ میں آنٹی کی خوشی کو ایک بیٹی کی طرح انجوائے کررہی ہوں۔ چلیے آنٹی میں آپ کے ساتھ مل کر مرتضیٰ بھائی کے لیے لڑکی ڈھونڈوں گی۔'' نرگس نے بہت اپنائیت سے روحی سے کہا۔

''ارے بیٹا جیتی رہو۔لڑکی ڈھونڈنے کی تو ضرورت ہی نہیں ہے۔لڑکی میں نے ڈھونڈ رکھی ہے اور اُس کے بارے میں ساری معلومات بھی اکٹھا کرلی ہیں، بس کل ہی انشاء اللہ اُس کے گھر پہنچ جاؤں گی۔'' مسز روحی جنید نے خوشی خوشی بتایا۔

''V.Good آنٹی! ہمیں بھی تو بتایئے کون ہے وہ لڑکی جس کے لیے ہماری ڈیئر آنٹی اِس قدر ایکسائیٹڈ ہورہی ہیں۔'' آفتاب نے ٹیبل پر سے چائے کا کپ اُٹھا کر چسکی لیتے ہوئے کہا۔

''جاؤ حیا ذرا اندر سے اخبار تو لاؤ میں اُنی کو تصویر دکھاؤں۔'' مسز روحی جنید نے آرام سے چٹنی کے ساتھ سموسے کھاتی حیا سے کہا۔

''Oh! My God آنٹی اخبار......خیریت محترمہ کی اخبار میں تصویر ہے کہیں......اشتہاری ملزم تو نہیں یا کسی سیاسی جماعت کی کارکن تو نہیں، یا نامعلوم افراد میں سے تو نہیں۔'' حیا نے ہنستے ہوئے آفتاب کی بت بیچ میں سے اُچکتے ہوئے اُس پر مرچ مسالا لگایا۔

''توبہ استغفار حیا تم تو بس......جاؤ تصویر لاؤ۔'' روحی جنید نے حیا کو بری طرح گھورا اور حیا کے قہقہہ میں نرگس کی بے ساختہ ہنسی بھی شامل ہوگئی۔

''یہ......'' نرگس کی نظر جیسے ہی اخبار میں چھپی تصویر پر پڑی تو اُس کے منہ سے نکلا۔

''کیا تم جانتی ہو اِس کو بیٹیا۔'' روحی نے بے تابی سے پوچھا۔

''ارے ممی یہ محترمہ تو واقعی اشتہاری نکلیں۔'' حیا ایک بار پھر ہنسی۔لیکن نرگس کو تو جیسے کچھ سنائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ وہ تو بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے گلے میں میڈل پہنے ہنسی مسکراتی لڑکی کو دیکھے جارہی تھی۔

☆......☆......☆

''بھابی اُس دن مجھے آپ کی باتیں تو بہت بری لگی تھیں لیکن جب میں نے گھر جاکر سوچا تو آپ مجھے سو فیصد حق پر لگیں۔ واقعی میں تو اِس گھر میں آپ کے پہلے دن سے گواہ ہوں۔ آپ کے ساتھ ہمیشہ زیادتی ہوئی ہے۔ کبھی بھی آپ کو، آپ کا جائز مقام نہیں ملا اور نہ ہی عزت۔ آج جب دوستی اور تعلق کو ایک طرف کرکے صرف حق بات سوچتی ہوں تو آپ کی ہمدردی اور محبت دل میں محسوس کرتی ہوں۔ بس اب آپ بھی مجھے دل سے معاف کردیں اور اس بات کی تو آپ فکر ہی نہ کریں۔ میرے میاں کے بہت تعلقات ہیں۔ میں آپ کی بہن کو جیل سے ایسے نکال کرلاؤں گی جیسے ملائی میں سے بال، اور جب آپ کو میں نے اپنی بہن بنا ہی لیا ہے تو انشاء اللہ لندن جاتے ہی میں آپ کے اور آپ کی امی کے ویزے کا بندوبست کرتی ہوں تاکہ آنٹی کا بہترین علاج ہوسکے۔'' نرگس نے ثمینہ کو نرم پڑتے ہوئے مزید اُس کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔

''چلو تم اتنی بات کرتی ہو تو تمہاری بات مان لیتی ہوں۔ خیر یہ تو مجھے یقین ہے کہ جس کے دل میں ذرا سا بھی اللہ کا خوف ہوگا۔ وہ میری سچائی پر یقین رکھے گا لیکن دیکھو بھئی یہ بات تم کان کھول کر سُن لو، اگر میری بہن بن گئی ہو تو اپنی حرافہ بھابی سے دوستی توڑنا پڑے گی۔'' ثمینہ نے شرط رکھی۔

”ارے کیسی دوستی! ثمینہ بھابی کیا بات کر رہی ہیں۔ جب سے آپ نے مجھے بتایا ہے کہ یہ کس کس طرح آپ کو ستاتی رہی، آپ کا دل دُکھاتی رہی، مجھے تو ویسے ہی اِس کی شکل بری لگنے لگی ہے۔ دراصل پتا ہے یہ آپ کی خوبصورتی سے جلتی ہے۔“ نرگس نے اندر بیٹھی زرقون کے دل میں جیسے ایک اور بھالا اُتارا۔

”ہاں وہ تو مجھے یقین ہے لیکن کیا کبھی اِس نے تم سے کچھ کہا بتاؤ۔“ ثمینہ نے تجسس بھرے انداز میں پوچھا۔

”نہیں کہا تو کبھی کچھ نہیں۔“ نرگس ہکلائی۔

”دیکھو نرگس تمہارا دل ابھی بھی اُسی کی طرف ہے۔ تم مجھ کو سچ نہیں بتا رہی ہو۔ پتا ہے ساری زندگی میرے ساس بھی میری اماں کی خوبصورتی سے جلتی رہی ہیں تو جلنا اور کُڑھنا تو اِس کے خون میں ہے۔“ ثمینہ نے مری ہوئی پھوپی پر بہتان باندھا۔

”واہ! بیٹا واہ! یہ تو سُنا تھا کہ برے وقت میں سایا بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے لیکن تم نے آج یہ ثابت بھی کر دیا۔“ خالہ بٹو جو اندر زرقون کے پاس بیٹھی نرگس کی ساری بکواس سُن رہی تھیں باہر آ کر بولیں۔

”جس بچی نے ہمیشہ تم کو اپنی بہن سمجھا۔ بہنا پا نبھایا تمہاری شادی میں ڈھول پیٹے، تمہارے ساتھ ہنسی اور تمہارے ساتھ روئی۔ آج تم اُسی کے لیے یہ بات کر رہی ہو۔ لعنت ہو تم پر۔“ خالہ بٹو کا بس نہیں چل رہا تھا کہ نرگس کا منہ نوچ لیں۔

”دیکھیں بھئی خالہ بٹو! زری کو میں بھی اچھا ہی سمجھتی تھی لیکن جب بھابی نے مجھے اُس کے بارے میں بتایا اور مجھے یہ بتایا کہ صرف اُس کی وجہ سے زری کے ماں باپ نے بھی اُن کو بیٹی نہ سمجھا تو مجھے بہت تکلیف ہوئی اور اب میں بھی شادی شدہ ہوں اور ایک شادی شدہ لڑکی کے سُکھ دُکھ سمجھ بھی سکتی ہوں۔ تو بھئی صاف بات ہے میں تو حق بات ہی کروں گی۔“

”ارے بی بی! اگر تم پر یہ بچی اتنا ہی بڑا بوجھ ہے تو اُتار پھینکو۔ اُس کی شادی کر دو تا کہ تمہاری بھی جان چھوٹے اور اُس کی بھی۔“ خالہ بٹو نے پلنگ پر تقریباً جھولتی، ہاتھ جوڑے لیٹی رقیہ بیگم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ جن کو دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ وہ ہاتھ جوڑے معافی مانگ رہی ہوں۔

”ہاں تو کر دوں گی۔ کوئی آئے تو سہی...... کوئی اِس بدنصیب کو پوچھے تو سہی۔ ساری زندگی فراز کو پھنسا کر رکھا، اُس نے بھی ہری جھنڈی دکھا دی۔ اب کسی کو اِس کا ہاتھ پکڑا دوں۔ کوئی راہ چلتا، اندھا گونگا اور بہرہ ملے گا تو ابھی دو بول پڑھوا دوں گی۔“ ثمینہ نے غصے سے چیختے ہوئے کہا۔ اِس وقت نرگس اور اپنے درمیان اُس کو خالہ بٹو کی موجودگی سخت ناگوار گزر رہی تھی۔

”اللہ سے ڈر ثمینہ! اللہ سے ڈر! اور بی بی تم تو بہت محبت اور دوستی کے دعوے کرتی تھیں۔ تم نے بھی کینچلی بدل لی۔“ خالہ بٹو نے پہلے ثمینہ کو ٹوکا اور پھر نرگس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں۔ نرگس خاموش رہی لیکن اُس کی مسکراہٹ خالہ بٹو کو سُلگانے کے لیے کافی تھی۔ ”واقعی آستین کے سانپ کے بارے میں سُنتے آئے تھے لیکن آج دیکھ بھی لیا۔“ خالہ بٹو نے نرگس کو دیکھتے ہوئے زمین پر تھوکا اور پھر ہاتھ کی پشت سے اپنی باچھیں پونچھیں۔ نرگس اب بھی خاموش ہی رہی۔

”میں نے زندگی میں صبر ہی تو کیا ہے۔ امی اور ابا کی جدائی سہہ گئی۔ فراز کی بے وفائی کو برداشت کیا اور آج نرگس تم بھی۔ لیکن مجھے تم سے یہ اُمید نہیں تھی۔ اُمید تو مجھے فراز سے بھی نہیں تھی۔ لیکن نرگس تو نرگس تھی، گرم گرم آنسو اُس کا چہرہ بھگونے لگے۔ برا وقت، بہت ہی بُرا ہوتا ہے۔ انسان اپنے ہی گھر میں اجنبی بن جاتا ہے۔ راستے کا پتھر بھی اُس کو پامال کرتا ہے۔ اپنے غیروں سے بدتر ہو جاتے ہیں۔ چلتی ہوا چٹکیاں لیتی ہے۔ پھول پیروں میں چھالے ڈال دیتے ہیں۔ وجود بوٹی بوٹی ہو جاتا ہے۔ لہولہو وجود ساری زندگی انسان کو گھسیٹنا پڑتا ہے۔ لیکن اللہ کبھی اپنے بندے کی ہمت سے زیادہ دُکھ نہیں دیتا۔ لیکن اُس کی اوقات سے زیادہ سُکھ ضرور دیتا ہے۔

"لیکن اللہ میاں جی میں اب تھک گئی ہوں۔ میرے پاس کوئی راہ نہیں ہے۔ روز روز کی تکلیف اور ذلت مجھے بہت تکلیف دیتی ہے۔ یااللہ تُو نے میرے نصیب میں جو لکھا ہے۔ جو تیرا فیصلہ ہے۔ اُس کی تکمیل کر دے میری مدد فرما رب العالمین! میں اکیلی ہوں۔ لیکن اطمینان ہے کیونکہ تُو میرے ساتھ ہے۔ لوگ مجھے بدنصیب کہنے اور سمجھنے لگے ہیں لیکن میں مطمئن ہوں کیونکہ تُو نے میرا نصیب لکھا ہے اور تیرے لکھے پر میں راضی ہوں۔ لیکن اللہ میاں پلیز! پلیز اللہ میاں!" زرقون رات کو بستر پر لیٹ کر سارے دن کی تکلیف دہ باتوں کو دل سے نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے اللہ سے باتیں کر رہی تھیں۔ اللہ سے فریاد کر رہی تھی۔

اور ظلم کرنے والے بھول گئے کہ مظلوم کی آہ سے بچنا چاہیے کہ اللہ اور اُس کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ لیکن افسوس، لوگ نہیں سمجھتے اور جب سمجھتے ہیں تو......

☆......☆......☆

"بھائی یہ مکان میں نے آپ کے نام لکھ دیا ہے۔ میرے لیے ابا اور اماں کے بعد یہ گھر نہیں رہا بلکہ مکان بن گیا ہے۔ آپ اِس مکان کو گھر کی طرح رکھیے گا۔" زری نے خاموشی سے چائے پیتے عرفان کے آگے مکان کے کاغذات رکھتے ہوئے کہا۔ تو عرفان نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

"نہیں زری! یہ گھر تمہارا ہے ابا کی یہی خواہش تھی تم ہی اس کو رکھو۔" عرفان نے مکان کی فائل زرقون کو تھمانی چاہی۔

"ارے، لو! یہ کیا کر رہے ہو۔ وہ دے رہی ہے، اُس کی خوشی کوئی تم چھین تھوڑا ہی رہے ہو۔" اِس سے پہلے کہ عرفان زبردستی زری کے ہاتھ میں فائل پکڑوا دیتا، ثمینہ نے تقریباً جھپٹنے کے انداز میں فائل چھین لی۔ زرقون نے چند سیکنڈ تک اُس کو تاسف سے دیکھا اور پھر سر جھٹک کر اندر چلی گئی کہ اب اُس کے لیے کسی بھی بات کی کوئی حیثیت نہیں رہی تھی۔

☆......☆......☆

وسیع و عریض کمرہ، پھولوں سے مہکتا، خوشبوؤں میں بسا کمرہ، اُس نے کمر کے پیچھے لگے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائی اور کمرے کے وسط میں رکھے پھولوں کے تکیے کو دیکھا۔ سارا کمرہ اے سی کی کولنگ سے ایک عجیب سی رومانیت کا تاثر دے رہا تھا۔ سامنے دیوار پر اُس کی ایک قد آدم تصویر آویزاں تھی۔

"یہ تصویر۔" زری حیران ہوئی، یہ تصویر تو بہت پہلے کی ہے یہ کہاں سے آ گئی، پھر اُس نے دونوں ہاتھوں میں بھرے سونے کے جڑاؤ کڑے دیکھے اور پھر سامنے خوبصورت نگینوں سے مزین شیشے میں اپنا عکس دیکھا۔

"یہ میں ہوں یا سنڈریلا!" اُس نے اپنے چٹکی کاٹی۔ وہ بہت معمولی لباس میں رُخصت ہوئی تھی۔ کہا گیا تھا کہ دولہا ملک سے باہر ہے لہٰذا ٹیلیفون پر نکاح ہوا تھا۔ اور وہ حیران ہوئی جب گاڑی پاپوش کی طرف مڑنے کے بجائے پل کے اُس پار چلی آئی۔ وسیع و عریض روشنیوں سے جگمگاتے گھر میں اُس کا استقبال بہت خوشیوں اور محبتوں کے ساتھ ہوا۔ اُس نے شہزادیوں کی طرح اِس محل نما گھر میں قدم رکھا۔ گھر میں چپے چپے پر ملازم ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ اُس کو اِس محل نما گھر میں دوبارہ سجایا گیا، سنوارا گیا۔ وہ جو دودھ کے گلاس پر رُخصت کر دی گئی تھی، یہاں پر فائیو اسٹار ہوٹل کا مینو مہمانوں کا منتظر تھا۔ مہمان مہمان...... بھی تو وہ نہ تھے جو باراتی تھے۔ یہ مہمان تو دوسرے تھے۔ باراتی کوئی اور تھے۔ دولہا کمرے میں آنے والا تھا۔

"دولہا...... دولہا تو پاکستان سے باہر تھا جب ہی تو نکاح فون پر ہوا تھا...... اور...... اب۔" دل میں مچلتے بہت سارے سوالات جب برداشت سے باہر ہو گئے تو اُس نے ساتھ بیٹھی خالہ بنو سے پوچھ ہی ڈالا۔

"بس بیٹا! یہ تقدیر کے فیصلے ہیں۔ تمہارے ماں باپ کی دعا ہے۔ یہ اللہ کا کرم ہے۔ سارے سوال ذہن سے جھٹک دو۔ اور بس اللہ کا شکر ادا کرو۔ اللہ نے تمہاری آزمائش کے دن ختم کیے۔ دشمنوں کا منہ کالا کیا۔ لوگ اپنی اپنی چالیں چلتے رہے اور اللہ نے اپنی چال چلی۔ بہت دل میں ملال تھا کہ تمہاری شادی تمہارے تایا کے گھر نہ ہونے میں میرا بہت ہاتھ ہے۔ لیکن اب تمہارے دولہا کو اور تمہاری سُسرال کو دیکھ کر میرا دل خوشی سے دیوانہ ہو رہا ہے۔ آج تمہارے ماں باپ کی روحیں بہت خوشی ہوں گی۔ تم تو محلوں کے لائق تھیں۔ تم اِس قدر پذیرائی کے لائق تھیں۔"

"وہ فراز!! لالچی تمہارے لائق ہی نہیں تھا۔ اُس کو اللہ نے تم سے دور کر دیا۔ تم زبردستی کسی پر مسلط نہیں ہوئیں۔ تم کو بہت خوشی سے اپنایا گیا ہے۔ اللہ نے ساری دنیا کے سامنے تمہاری اچھائی واضح کر دی۔ تم کو ایک مکمل مومن مرد ملا ہے۔ وہ مرد جس کی تمنا ہر عورت کرتی ہے۔ وجیہ، تعلیم یافتہ، باشعور، باادب اور مالدار......"

"واہ بیٹا واہ! میں آج اتنی خوش ہوں کہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔ اللہ تم کو سدا سہاگن رکھے۔ تم دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو، خوش رہو، آباد رہو۔ جو چاہو وہ تمہاری دسترس میں ہو۔" خالہ بُو نے محبت سے کہتے ہوئے نم آنکھوں سے بہت دل اور جذبے کے ساتھ زرقون کو دعائیں دیں اور کمرے سے باہر نکل گئیں کہ دولہا کے اندر آنے کا شور بلند تھا۔

زرقون کے ہاتھ پیروں میں ایک عجیب سی سنسناہٹ سی ہونے لگی۔

"فراز!" فراز کا نام تک اس کے دل سے نکل گیا کہ یہ اللہ کا ایک بڑا کرم تھا۔

'پتا نہیں، یہ کیسی ہوگی، شیری جیسی، یا اُس سے بھی زیادہ بُری، سر جھکا کر پہلی رات تو شیری بھی بیٹھی تھی۔ میرا دل اِس کی طرف راغب کیوں نہیں ہو رہا۔ لیکن میں پھر بھی اِس کو، اِس کا حق دینے کی کوشش کروں گا کہ میرے اللہ کا یہی حکم ہے اور میں نے یہ شادی اپنے رب کی رضا کے لیے کی ہے۔ لیکن از کم مجھے اِس لڑکی کی تصویر پہلے دیکھ لینی چاہیے تھی۔ ممی اور حیا نے کتنی ضد کی تھی لیکن میں یہی کہتا رہا کہ میں نے غلافِ خانہ کعبہ کو پکڑ کر اللہ سے ایک نیک اور باکردار شریکِ حیات مانگی تھی۔ وہ ستائیسویں شب تھی، جب میں نے اللہ سے باکردار شریکِ حیات مانگی تھی اور دوسرے دن ممی نے مجھ سے اِس لڑکی کے بارے میں کہا تھا بلکہ ضد کی تھی۔ جب میں نے اِس لڑکی کو اللہ کا تحفہ اور اللہ کا فیصلہ سمجھ کر قبول کیا ہے تو پھر کیا سوچنا۔'

مرتضٰی نے سامنے صوفے پر بیٹھ کر سر جھکائے بیٹھی زری پر نظریں جمائے جمائے اپنے آپ سے کہا۔

'چلو میاں مرتضٰی اُٹھو، کیا ساری رات اپنے آپ سے ہی باتیں کرو گے۔ دلہن تھک رہی ہے۔' کسی نے مرتضٰی کے اندر سے نصیحت کی۔

"یا اللہ!" گھونگھٹ اٹھاتے ہی مرتضٰی کے لب کپکپائے۔ احمر کی دکھائی تصویر، خواب والی لڑکی اور گلے میں جھولتا وہ لاکٹ...... اُف! بے ساختہ مرتضٰی نے اُسے اپنی بانہوں میں بھر لیا اور اُس کے تپتے ماتھے پر اپنے سُلگتے ہونٹ رکھ دیے۔

اور اُس شرمائی لجائی دُلہن کی نظر جب تل پر پڑی تو وہ مسکرا اٹھی اور اُس نے مطمئن ہو کر، ہر فکر سے بے فکر ہو کر اپنے مجازی خدا کے سینے میں سر چھپا لیا کہ یہ اُس کے لیے، اُس کے اللہ کا فیصلہ اور انعام تھا۔ وہ خوش نصیب تھی جس کو دنیا میں بھی انعامات سے نوازا جا رہا تھا۔

اور پھر پوری رات وہ مرتضٰی کی لازوال محبتوں میں بھیگتی رہی اور اُس کا پور پور شانت ہو گیا۔

ہر رات کے بعد صبح ہوتی ہے۔ اُس کے دل نے کہا۔ تو اُس نے انتہائی اطمینان سے برابر میں لیٹے اپنے وجیہہ شوہر کو دیکھا اور...... فجر کی اذان ہونے والی تھی اور اُس کو مرتضٰی کے ساتھ سفید دوپٹے کے ہالے میں سمو کر نماز ادا کرنی تھی۔

☆......☆......☆

’زری کی شادی ہوگئی، لیکن زری تو مجھ سے محبت کرتی تھی۔ میں زری کو کسی اور مرد کے ساتھ نہیں دیکھ سکتا۔ میں زری سے بات کروں گا۔ میں زری سے دوبارہ رابطہ کروں گا۔ میں زری سے کہوں گا اُس آدمی کو چھوڑ دے۔ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔‘ فراز کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اُس نے بار بار زری کا نمبر ملایا لیکن اُس کا فون آف تھا۔ آج زری کی شادی کی پہلی رات تھی اور فراز کے لیے یہ بات سوہانِ روح تھی کہ وہ کسی اور مرد کی قربت میں ہوگی۔ ’زری تم مجھے معاف کردو۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ زری پلیز‘ فراز نے تصور میں زری کے آگے ہاتھ جوڑے۔

’’تم جانتی ہو زری میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟ نہیں نا۔ میں تم کو بتاتا ہوں زری۔ میرے ساتھ بہت بڑا دھوکہ ہوا ہے۔ زری سنو!‘‘

☆......☆......☆

’’منحوس! کمبخت! واقعی سانپ، سانپ ہوتے ہیں۔ پتا نہیں کیا ہوا تھا۔ میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔ میں کیسے اُس کتیا کی باتوں میں آگئی۔ ایک تو اماں کی بیماری نے مجھے اَدھ موا کردیا ہے۔ یہ ٹھیک ہوتیں تو کم از کم مشورہ ہی دے دیتیں اور وہ کم بخت زرمینہ اُس نے اور منہ کالا کردیا ہے۔ اچھا ہے کم بخت کو پھانسی ہو۔ میرا بس چلے تو میں پھانسی پر خالہ بتّو اور نرگس کو بھی لٹکا دوں۔ کیسا جھوٹ بول کر اِن لوگوں نے زری کی شادی کروائی ہے اور تو اور وہ کم بخت بڈھا بھی اِن کے ساتھ مل گیا۔ اپنے بیٹے سے تو شادی کروا نہ سکا، تو اِس طرح اُس نے اپنے منہ کی کالک مٹائی ہے۔ کہہ رہی تھی۔ غریب ہے، ایک ٹانگ کٹی ہوئی ہے۔ سعودی عرب میں کام کرتا ہے۔ بس فون پر نکاح کر کے دو جوڑوں میں رخصت کردو۔ کاش میں عرفان کی بات مان لیتی۔ عرفان کی تو بالکل ہی مرضی نہیں تھی لیکن ہمیشہ کی طرح میں نے ضد کر کے اُس کو منایا۔ میں نے سوچا ساری زندگی کمبخت لنگڑے کے ساتھ گھسٹتی پھرے گی۔ لیکن نرگس نے تو مجھ کو تصویر بھی کسی ساٹھ سالہ لنگڑے مرد کی دکھائی تھی۔ لیکن دولہا، دولہا تو ایسا شہزادے جیسا نکلا۔ اتنا مالدار، اتنا پیارا، جیسے افسانوی ہیرو ہوتے ہیں۔ ارے اِس سے بہتر تھا اِس کی شادی فراز سے ہوجاتی۔ فراز تو مرتضٰی کے پیر کی جوتی کے برابر بھی نہیں ہے۔ میں تو زرتون کو اِس طرح نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جب ہی تو میں نے صاف منع کردیا ہے کہ بی بی بس اب تم کو بیاہ دیا۔ میکہ ماں باپ سے ہوتا ہے اور تمہارے ماں باپ مرگئے ہیں۔ برائے مہربانی آئندہ اِس گھر میں نہ آنا۔‘‘

’’ثمینہ!‘‘ ثمینہ جو کب سے بیٹھی سوچوں کے تانے بانے سلجھا رہی تھی۔ عرفان کی آواز پر حقیقت کی دنیا میں پلٹ آئی۔

’’ارے آپ! آپ کب آئے اور طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی۔‘‘ ثمینہ نے عرفان کے دھواں دھواں ہوتے چہرے کو دیکھ کر بہت پریشانی سے پوچھا۔ عرفان خاموش رہا۔

’’کیا ہوا؟ کچھ تو بتایئے؟‘‘ ثمینہ نے گھبرا کر پوچھا کہ عرفان کو اِس قدر ٹوٹا ہوا اُس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

’’عبداللہ کی بائیوسی کی رپورٹ آگئی ہے۔‘‘ عرفان کا لہجہ رو رہا تھا۔

’’اچھا! سب ٹھیک ہے نا۔‘‘ ثمینہ نے جلدی سے پوچھا۔

’’نہیں!‘‘ عرفان نے دائیں ہاتھ سے چہرے پر پھیلتے آنسو پونچھے۔

’’کیا مطلب؟‘‘ ثمینہ کا لہجہ گھبرایا۔

’’عبداللہ کو بلڈ کینسر ہے اور وہ بھی......‘‘ عرفان سے جملہ مکمل نہ ہوسکا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا اور ثمینہ کو زندگی میں پہلی بار پتا چلا کہ پیروں کے نیچے سے زمین نکلنا کس کو کہتے ہیں۔

(خوبصورت ناول آئینہ، عکس اور سمندر کی آخری قسط انشاء اللہ اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں)

میرا خیال تھا کہ کتابیں بڑی قیمتی چیز ہوتی ہیں، حالانکہ بھانجی تو مجھے یہ لکھ چکی ہے کہ آپ جتنی کتابیں چاہیں، آ کر لے جائیں، لیکن اُس کا شوہر شاید اس بات کو پسند نہ کرے۔ اس لیے جب میں سکھر میں اپنی بھانجی کے ہاں پہنچا تو اُس کے شوہر سے، بہت ہی معذرت......

ذخیرۂ ادب سے ایک خاص انتخاب، جو دلوں سے مکالمہ کرے گا

پڑھنا میرے لیے ایک ایسے مرض کی حیثیت رکھتا ہے جو لاعلاج ہو۔ ویسے کوئی بھی مرض اِتنا پرانا ہوجائے جتنی میری پڑھنے کی عادت تو لاعلاج ہی ہوجاتا ہے۔ جب میں باقاعدہ طور پر اسکول میں بھی

داخل نہیں کرایا گیا تھا، اُس وقت میرے ایک رشتے کے چچا نے بچوں کی لائبریری کھولی تھی۔ میں ناشتا کرکے اُن کی دکان پر جا بیٹھتا اور پھر مجھے اپنا گھر اُسی وقت یاد آتا جب بھوک کے مارے پڑھنا دوبھر ہو جاتا۔ بچوں کے لیے لکھی ہوئی کہانیوں کے جب سارے سیریز ختم ہو گئے تو بڑی پریشانی ہوئی۔

کچھ دیر گھر میں پڑی ہوئی کتابیں کھنگالیں۔ پھر خدا کا کرنا کیا ہوا کہ بازار میں ایک بوڑھے میاں نے چھوٹی سی لائبریری کھول لی، مگر اُس میں 'ٹارزن کی واپسی' اور 'طلسمی قلعہ' وغیرہ قسم کی کتابیں نہ تھیں، چنانچہ مجبوراً بڑوں کے ناول پڑھنے پڑے۔ لوگ کہتے ہیں کہ بھوک میں کواڑ پاپڑ ہو جاتے ہیں۔ وہی میرے ساتھ بھی ہوا۔ چھٹی کلاس میں 'فردوسِ بریں' اور 'توبۃ النصوح' ہضم کر لیے۔ اُس وقت سے اَب تک پڑھنے کا مرض جان سے چمٹا ہوا ہے۔

پڑھنے والوں کے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ پڑھنے کے لیے اتنی بہت سی کتابیں حاصل کہاں سے کی جائیں۔ کبھی کبھی تو کتاب خریدی جاسکتی ہے، لیکن آدمی روز کتابیں خریدے تو زندگی کی اور ضرورتیں پوری کرنے کے لیے پیسے نہ رہیں۔ اب ہر آدمی تو 'اُمراؤ جان ادا' والے مرزا رُسوا کی طرح نہیں ہو سکتا جو تن خواہ ملتے ہی چھکڑا بھر کتابیں خرید لائے تھے اور جب اُن کی بیوی نے پوچھا۔ "ہائے اللہ! مہینہ بھر ہم کھائیں گے کیا؟"

تو انہوں نے جواب دیا کہ اِسی چھکڑے پر بُھنے ہوئے چنوں کی ایک بوری بھی لدوا کر لایا ہوں، چنانچہ ہم نے کتابیں لوگوں سے مانگ تانگ کر کام چلایا۔ کبھی یوں ہوا کہ کسی بدذوق کے ہاں بہت اعلیٰ معیار کی کتاب دیکھی تو چپکے سے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لی۔

جب کالج میں آیا تو وہاں کی لائبریری سے وافر تعداد میں کتابیں ملنے لگیں، لیکن کبھی کسی بک اسٹال پر افسانوں کا کوئی بہت اچھا مجموعہ نظر آ جاتا تو جیب خرچ میں سے بڑی کسامسی کرکے پیسے اُس پر خرچ کر دیتا۔ اُس وقت میں بڑے یقین سے اپنی بھابی سے کہا کرتا تھا۔

"تم دیکھنا بھابی، میں جب نوکر ہو جاؤں گا تو ہر مہینے آدھی تنخواہ میں گزر کیا کروں گا۔ اور آدھی تنخواہ کی کتابیں خریدا کروں گا۔"

نوکر ہو کر کچھ دن تو واقعی یہی کیا، اِس لیے کہ اکیلا تھا اور تنخواہ کافی تھی، لیکن وہ 'ہاں' کرنے کے بعد جس کے عوض ہر شریف آدمی عمر بھر کے لیے اپنی آزادی بیچ دیتا ہے، کبھی آدھی تنخواہ کی کتابیں خریدنے کی توفیق نہ ہوئی، بلکہ ہر بچے کی پیدائش کے ساتھ کتابوں پر خرچ ہونے والی رقم کا تناسب گھٹتا گیا، اور اب چار بچوں کے ساتھ جو ماشاءاللہ اسکول میں پڑھتے ہیں اور بیوی کے ساتھ جو بڑی باقاعدگی سے بیمار رہتی ہے، یہ تناسب صفر سے کچھ ہی اوپر رہ گیا ہے۔

ایسے عالم میں میری بھانجی کا خط آیا تو مجھے یوں لگا جیسے سُوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا ہو۔ اُس نے لکھا تھا "ابو کی کتابیں اب میرے گھر میں پڑی ہیں۔ آپ کبھی سکھر آئیں تو اِن میں سے جتنی بھی کتابیں آپ کو پسند ہوں، وہ لے جائیں۔"

اُس لڑکی کے ابو بے چارے بڑے اچھے آدمی تھے۔ بہت قناعت پسند اور گوشہ گیر قسم کے۔ زندگی میں اُن کی ایک ہی تفریح تھی، ایک ہی مشغلہ تھا اور وہ تھا کتابیں پڑھنا۔ اوائلِ جوانی میں سائنس اُن کا دل پسند مضمون تھا۔ پھر سائنس سے ادب کی طرف آئے۔ چند افسانے بھی لکھے۔ ادب سے جی اُکتایا تو فلسفے کی وادی میں نکل گئے۔ آخری عمر میں طبیعت

کتابیں۔

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

بہت دل پر پتھر رکھا اور کتابیں دل سے اُتارنے کی کوشش کی، لیکن پسندیدہ کتابوں کی تعداد سو سے کم نہ ہوئی تھی۔ ایک ساتھ اتنی کتابیں لانے کی ہمت بھی نہ ہوئی۔ اِس کی دو وجوہات تھیں۔ پہلی تو وہی کہ بھانجی کا شوہر کیا سوچے گا اور دوسری یہ کہ سفر میں سامان زیادہ رکھنا میری طبیعت کے خلاف تھا۔ عجیب کش مکش کی کیفیت تھی۔ آخر میں نے فیصلہ اپنی بھانجی ہی پر چھوڑ دیا۔ میں نے اُس سے کہا۔ ''سنو منی! میرے سوٹ کیس میں کپڑوں کے علاوہ جو جگہ ہے، اُس میں تو صرف پندرہ سولہ کتابیں آتی ہیں۔ یہ میں لے جا رہا ہوں۔ باقی کتابوں کا یہ ہے کہ میں نے اپنی دلچسپی کی کتابیں الماری سے نکال کر ریک میں بھر دی ہیں۔ یہ کوئی ڈیڑھ سو کتابیں ہیں اور اِن میں سے کوئی بھی کتاب چھوڑنے پر میرا دل راضی نہیں ہو رہا اور چونکہ میں بہت کاہل آدمی ہوں، اِس لیے اتنی کتابیں لے جانے کا جھمیلا بھی نہیں کر سکتا۔ اب یہی صورت رہ جاتی ہے کہ تم کبھی کراچی آؤ تو لیتی آنا۔'' وہ ہنس پڑی۔

چلتے وقت اُس نے کہا۔ ''اچھے ماموں! یہ کتابیں یا تو میں خود لیتی آؤں گی یا کراچی آنے کا پروگرام نہ بنا تو اِن کے آفس کی وین کراچی جاتی ہے، اُس سے آپ کے گھر بھجوا دوں گی۔''

میں کراچی آ گیا۔

وہ پندرہ سولہ کتابیں جو میں ساتھ لایا تھا، مہینے بھر میں ختم ہو گئیں۔ میں اب پچھتانے لگا کہ کیوں اِتنا پیارا ذخیرہ چھوڑ آیا۔ اِس بات کا یقین ہی نہیں آتا تھا کہ بھانجی اتنی ڈھیر ساری کتابیں میرے گھر بھجوانے کی تکلیف بھی گوارا کرے گی جبکہ اُن کتابوں سے عشق کے باوجود میں خود یہ تکلیف گوارا نہ کر سکا۔

☆......☆......☆

ایک خوش گوار صبح، جب میں دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا، دروازے پر کھٹکا ہوا۔ میں نے دروازہ کھولا تو ساجد کھڑا تھا۔ یہ میری بھانجی کا بڑا بیٹا تھا۔ میں نے حیرت سے کہا۔ ''ارے تم کیسے؟ کس کے ساتھ آئے؟''

اُس نے بتایا۔ ''ابو کے آفس کی وین کراچی آ رہی تھی، اُس میں، میں بھی آ گیا اور چھوٹا بھائی بھی۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا، اندر آؤ۔''

وہ ہنس کر بولا۔ ''یہ بوری تو اُتروا لیجیے وین سے۔''

بوری بہت بھاری تھی۔ اُس میں اَٹا اَٹ کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ شکر گزاری کے جذبے سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ کتابیں اگر بازار سے خریدی جاتیں تو اِن کی قیمت کئی ہزار بنتی۔ اِتنی کتابیں نہ صرف بغیر کسی قیمت کے مل گئی تھیں، بلکہ گھر بھی پہنچا دی گئی تھیں۔

بوری اُتروا کر میں نے کمرے میں رکھوائی۔ پھر یوں ہی بات چیت کی خاطر ساجد سے پوچھا۔

''اور بھئی، امی نے کچھ کہلوایا بھی ہے؟''

وہ بولا۔ ''جی ہاں..... امی نے تاکید کی ہے کہ خالی بوری واپس لے آنا، بھولنا مت۔''

میں نے حیرت سے کہا۔ ''بوری واپس کر دوں؟ اِس کی تاکید ہے؟ بھئی اِس بوری میں کیا خاص بات ہے؟''

ساجد نے ہنس کر کہا۔ ''لیجیے آپ کو یہ بات بھی معلوم نہیں کہ بوریاں کتنی مہنگی ہو گئی ہیں۔ دس، بارہ روپے کی آتی ہے خالی بوری۔ اِسی لیے تو امی نے کہا۔ بوری ضرور واپس کر دیں، کام آ جائے گی کبھی نہ کبھی۔''

☆☆......☆☆

دوشیزہ میگزین

- رنگِ کائنات
- دوشیزہ گلستاں
- نئے لہجے، نئی آوازیں
- یہ ہوئی نا بات
- لولی وُڈ، بولی وُڈ
- نفسیاتی اُلجھنیں اور اُن کا حل
- کچن کارنر
- حکیم جی!
- بیوٹی گائیڈ

دوشیزہ گلستان

اسماء اعوان

فرمانِ الٰہی

دین (اسلام) میں زبردستی نہیں ہے۔ ہدایت (صاف طور پر ظاہر اور) گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔ تو جو شخص بتوں سے اعتقاد نہ رکھے اور اللہ پر ایمان لائے، اس نے ایسی مضبوط رسی ہاتھ میں پکڑلی ہے، جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں اور اللہ (سب کچھ) سُنتا (اور سب کچھ) جانتا ہے☆ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور ان کا دوست اللہ ہے کہ اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لے جاتا ہے اور جو کافر ہیں، ان کے دوست شیطان ہیں کہ ان کو روشنی سے نکال کر اندھیرے میں لے جاتے ہیں۔ یہی لوگ اہلِ دوزخ ہیں کہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

(سورۃ البقرہ 2۔ ترجمہ: آیات 256 تا 257)

حدیث نبوی

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ لوگوں کی امامت فرما رہے ہیں اور اُمامہ بنت ابی العاص جو حضرت زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی تھیں (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی) کو کندھے پر اُٹھائے ہوئے ہیں۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع میں جاتے تو اسے زمین پر اُتار دیتے اور جب سجدہ سے اُٹھتے تو دوبارہ اُٹھالیتے۔1105

(صحیح مسلم شریف: باب جواز حمل الصبیان فی الصلوٰۃ الخ)

طہارت کی اقسام

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے۔'' دین کی بنیاد طہارت ہے۔ اسلام طہارت، نفاست اور پاکیزگی پر بہت زیادہ زور دیتا ہے۔ اسلام جسمانی، روحانی، ظاہری، باطنی اور قلبی ہر قسم کی گندگی اور ناپاکی کو دور کرنے کا حکم دیتا ہے۔ طہارت چار قسم کی ہے۔ اول ظاہری بدن کو نجاست اور گندگی سے پاک صاف کرنا۔ دوم، اعضائے بدن کو گناہوں اور خطاؤں سے پاک کرنا۔ سوم، قلب کو برے اخلاق اور ناپسندیدہ خصائل سے پاک کرنا۔ چہارم، اپنے باطن کو ماسوا اللہ سے پاک کرنا اور صرف اسی کی طرف متوجہ رہنا۔

مرسلہ: ابوحمزہ۔ مریدکے

لہسن

لہسن جڑی بوٹیوں والی ان بہترین دواؤں میں سے ایک ہے جو بڑے پیمانے پر استعمال کی جاتی ہیں اور عمدہ معالجاتی خصوصیات کی حامل ہیں۔ لہسن میں Allicia شامل ہوتا ہے جو کہ کینسر کی روک تھام کرنے والا ایک موثر جزو ہے۔

لہسن سردی، زکام اور انفیکشن کے لیے بھی بہت مفید ہے۔ لہسن کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ یہ

خون میں کولیسٹرول کی سطح کو کم کرتا ہے۔ اسے اکثر خمیر کے باعث ہوجانے والے انفیکشن کے علاج کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ لہسن پیٹ کے کینسر کی روک تھام میں بھی مدد دیتا ہے۔

لہسن ایک طاقتور قدرتی اینٹی بایوٹک ہے۔ یہ خلیوں کی نشوونما اور ان کی فعالیت میں اضافہ کرسکتا ہے۔ لہسن کو اس کے اینٹی بایوٹک خواص کی وجہ سے استعمال کرنے کا اصل فائدہ یہ ہے کہ یہ جسم کے قدرتی نباتیہ (Flora) کو تباہ نہیں کرتا۔

کیل مہاسوں وغیرہ سے نجات حاصل کرنے میں بھی لہسن مفید ثابت ہوتا ہے۔ اس غرض سے لہسن کے جووں کو چھل لیجیے اور ان کو جلد پر لگایئے۔

تیزابیت کو دور کرنے میں بھی لہسن فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ایک چائے کا چمچہ لہسن کو ایک چائے کی پیالی کے برابر دودھ میں ابالیے اور اسے دن میں دوبار پی لیجیے۔

مرسلہ: انگبین فاروق۔ فیصل آباد

غزل

چھاؤں میں گیسوؤں کی مہکے تھے
داغ دل کے رہے کنول برسوں
زندگی صرف ایک پل ہے مگر
خوں رُلاتا ہے ایک پل برسوں
فیصلے وقت کے اٹل ہی سہی
کیا رہیں گے یونہی اٹل برسوں
جاں گدازیٔ عشق ہے آخر
اب جلی ہے تو شمع جل برسوں
ہم خراباتیوں سے پھر ملنا
اس خرابے کی راہ چل برسوں
نیند سی نیند تھی اُن آنکھوں میں
ادھ کھلے سے رہے کنول برسوں

شاعر: رسا چغتائی

احسان

ایک خاتون نے ایک فقیر کو بہت سے پرانے کپڑے دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ سب تمہارے کام آجائیں گے۔ انہیں معمولی سی مرمت کی ضرورت ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک دن کا کام ہے۔“

”ٹھیک ہے بیگم صاحبہ! تو پھر میں کل آجاؤں گا۔“ فقیر نے کپڑے وہیں چھوڑ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

مرسلہ: رانا شاہد۔ بورے والا

وجۂ خاص

ایک نوجوان حسین لڑکی سے اس کی سہیلی نے پوچھا۔ ”تم اس بڈھے کھوسٹ شخص کے ساتھ کیوں گھومتی پھرتی ہو؟ سنا ہے کہ تم اس سے شادی کرنے والی ہو...... آخر تم نے اس میں کیا دیکھا ہے؟“

لڑکی نے جواب دیا۔ ”اس کی سب سے بڑی اور سب سے کامیاب خوبی یہ ہے کہ وہ دس کروڑ کی جائیداد کا تنہا مالک ہے۔“

مرسلہ: تقی احمد۔ ملتان

کارکردگی

ریلوے کے گارڈ نے اسٹیشن ماسٹر کے دفتر میں داخل ہوتے ہوئے بتایا۔ ”سر! ایک دیہاتی ہماری پسنجر ٹرین کے بارے میں شکایت لے کر آیا ہے۔“

”اس بے وقوف کی گائے یا بھینس ٹرین کے نیچے آکر مرگئی ہوگی اور اب وہ ریلوے کے محکمے سے ہرجانہ وصول کرنے کے چکر میں ہوگا۔ اس احمق کو بتادو کہ ہمارا محکمہ اس قسم کے حادثوں پر ہرجانہ ادا نہیں کرتا۔ غلطی ان بے وقوفوں کی ہوتی ہے، جو اپنی گائے، بھینسوں کو آوارہ کتوں کی طرح کھلا چھوڑ دیتے ہیں اور......!“

ممکن تھا کہ ان کی تقریر جاری رہتی، مگر گارڈ ان کی بات کاٹ کر بولا۔ ”سر! یہ مسئلہ نہیں ہے۔ بات کچھ اور ہے۔ دیہاتی کا کہنا ہے کہ ہماری ٹرین اس کے کھیتوں

کے قریب سے گزرتی ہے تو مسافر اُتر کر اس کی گائے، بھینسوں کا دودھ نکال لیتے ہیں اور پھر دوڑ کر دوبارہ ٹرین میں سوار ہوجاتے ہیں...... وہ درخواست کررہا ہے کہ ٹرین کی رفتار کچھ تو بڑھائی جائے۔"

مرسلہ: شہباز خان۔ خانیوال

کڑھی پتا اور کولیسٹرول

متعدد ریسرچ سے معلوم ہوا ہے کہ کڑھی پتے (نباتاتی نام Murraya Koenigii) میں خون میں شامل کولیسٹرول کی مقدار گھٹانے کی خوبی بھی پائی جاتی ہے۔ ان پتوں میں چونکہ اینٹی آکسیڈنٹس بھرے ہوتے ہیں، اس لیے یہ کولیسٹرول کی آکسیڈیشن کو روکتے ہیں۔ اس طرح خراب LDL کولیسٹرول نہیں بن پاتا اور اچھے کولیسٹرول HDL کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں جسم امراض قلب اور شریانوں کی سختی (Atherosclerosis) جیسی بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔

مرسلہ: عمرانہ اسلم۔ راولپنڈی

بہت جی لیے

دُکھوں کی تپتی ریت پر چلتے چلتے پاؤں جل جل گئے، حرفِ شکایت نہ لائے لب پر کہ صبا داصبر کے ثواب سے محروم نہ رہ جائیں ہر گام پہ زندگی اک نیا امتحان ہے کھڑی نظر آئی۔ سانسوں کا خراج مانگتی رہی زندگی، آنسوؤں کے ہار گلے میں پہنا گئی زندگی جی لیے سب جی لیے دل مرگیا۔ اب کیا رہ گیا جینے کو ناکام آرزوئیں، نامکمل خواہشات' تعبیر ملنے کے انتظار میں آنکھوں سے بہہ جانے والے خواب، بہت جی لیے، اب تو انتظار ہے کب زمین اپنے اندر سمیٹ کر سُلائے گی۔ ہاں وہاں کوئی دُکھ نہ ہوگا۔ کوئی پتھر پھینک کر زخمی نہ کرے گا۔ ہاں سکون ہوگا دکھوں سے نجات کا واحد اضطراب ہی بچا ہے۔

حسنِ خیال: عظمیٰ شکور۔ سرگودھا

غزل

زندگی مجھ میں لوٹ آئی ہے
زندگی پھر سے مسکرائی ہے
تم سے ملنے کے بعد ایسا لگا
میں نے دل کی مراد پائی ہے
مدتوں بعد میں نے جُوڑے میں
اک گلابی کلی لگائی ہے
کسی صورت جو کم نہیں ہوتی
تم نے کیسی لگن جگائی ہے
بس تری اک نگاہِ الفت پر
میں نے تو زندگی لٹائی ہے
تم مری سوچ کے ہو محور پر
میری تم تک کہاں رسائی ہے
تم نے نیلم پری کہا جس کو
وہ شگفتہ تری، پرائی ہے

شاعرہ: شگفتہ شفیق

نصیحت

"پڑھائی سوچ سمجھ کے چھوڑنا میرے دوستو، کیونکہ گدھا 25,000 کا اور ریڑھی 10,000 روپے کی ہوگئی ہے۔"

"اوہ میرے خدا! کہاں ہے میری کتاب۔"

مرسلہ: صاحب خان۔ گوجر خان

دوستی

☆ کوئی موسم نہیں، جو اپنی مدت پوری کرکے گزر جائے۔

☆ ساون کا بادل نہیں، جو ٹوٹ کر برسے اور تھم جائے۔

☆ آگ نہیں، جو سلگے، بھڑکے اور بجھ جائے۔

☆ آفتاب نہیں، جو جہاں کو روشن کرے اور ڈوب جائے۔

☆ کوئی کلی نہیں، جو کھل کر پھول بنے اور شام

ہونے پر مرجھا جائے۔

☆ خوشبو نہیں، جو فضا میں بکھر کر چند لمحوں بعد ختم ہو جائے۔

☆ پیاس نہیں، جو سیراب ہونے پر بجھ جائے۔

☆ دوستی ملاپ ہے، دو روحوں کا، دو سانسوں کا جو چلے تو دلوں کی دھڑکن ہے اور رُک جائے تو زندگی کچھ بھی نہیں۔

مرسلہ: قراۃ العین۔ حیدر آباد

مسواک

ایک آدمی چوری چھپے جنگل سے لکڑیاں کاٹ رہا تھا کہ گارڈ آیا اس نے پوچھا۔ "کیا کر رہے ہو؟"

آدمی۔ "مسواک بنا رہا ہوں جناب۔"

"اتنی بڑی۔" گارڈ نے کہا۔

اس نے فوراً جواب دیا۔ "اپنے لیے نہیں جناب چولہے کے لیے۔"

مرسلہ: نعمان عمر۔ اورنگی ٹاؤن

نصیحتیں

☆ متقی بن جاؤ سب سے زیادہ عبادت گزار شمار ہو گے۔

☆ قناعت کرنے والے بن جاؤ، سب سے زیادہ شکر گزار سمجھے جاؤ گے۔

☆ جو اپنے لیے پسند کرو وہی دوسروں کے لیے پسند کرو۔ کامل مومن بن جاؤ گے۔

☆ پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرو کامل مسلمان بن جاؤ گے۔

☆ کم ہنسا کرو زیادہ ہنسا قلب کو مردہ کر دیتا ہے۔

مرسلہ: عالم زیب۔ چیچہ وطنی

ملک الموت

ایک عورت کا شوہر نہایت بیمار تھا جسے ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا وہ بہت پریشان اور فکر مند رہتی تھی۔ ایسی مصیبت کے عالم میں وہ خدا سے دعائیں کرتی تھی۔ "اے اللہ! ملک الموت میری جان لے لے لیکن میرے شوہر کی جان بخش دے۔" ابھی عورت یہ دعا مانگ رہی تھی کہ ادھر بلی نے کچن میں دودھ پینے کی غرض سے دیگچی میں منہ ڈالا اور برتن گر پڑا۔ عورت گھبرا گئی سمجھی ملک الموت آ گئے ہیں اسے یہ خیال آیا کہ میری یہ دعا قبول ہوئی۔ بہت ڈری اور کہنے لگی کہ "حضرت ادھر خیال نہ کیجیے گا جس کے لیے آپ آئیں ہیں اسے ہی لے جائیں، وہ یہاں پڑا ہوا ہے۔"

مرسلہ: شبانہ زمان۔ سکھر

عظیم لوگ۔ عظیم باتیں

☆ سورج اور سورج مکھی کے حیرت انگیز تعلق میں کتنا گہرا راز پوشیدہ ہے۔

☆ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میں نے قتل کرنے والا کوئی ہتھیار ایجاد نہیں کیا۔

☆ ہماری نفرت ہمارے دشمنوں کو کم اور ہمیں زیادہ نقصان پہنچاتی ہے۔

☆ اگر کوئی بات ناگوار گزرے تو اسے نظر انداز کر کے معاف کرنا سیکھیے۔

☆ جس پر نصیحت عمل نہ کرے وہ جان لے کہ اس کا دل ایمان سے خالی ہے۔

☆ دوست ہزار بھی کم ہے دشمن ایک بھی زیادہ ہے۔

☆ انسان عقل سے پہچانا جاتا ہے۔ شکل سے نہیں۔

☆ بے وقوف جب تک خاموش رہتا ہے وہ عقل مند شمار ہوتا ہے۔

☆ جو شخص حرام کھاتا ہے اس کے تمام اعضا گناہ میں پڑ جاتے ہیں۔

☆ اپنے زخم اس نہ دکھاؤ جس کے پاس مرہم نہ ہو۔

☆ عتماد وہ نازک شیشہ ہے جو ایک بار ٹو جائے پھر جڑ نہیں سکتا۔

مرسلہ: فہد غفار۔ کراچی

نئے لہجے نئی آوازیں

پھر لوٹ کے آیا دسمبر

ہے پھر اب لوٹ کے آیا دسمبر
پیام سوگ ہے لایا دسمبر
سنائیں کیسے اپنی داستاں اب
ہماری زیست چھایا دسمبر
ہے ایسے میں گھنا سایا دسمبر
میں نم آنکھوں میں بھی ہنسنے لگا ہوں
ہنر کیسا سکھا لایا دسمبر
کبھی کچھ کھو دیا ہے عشق کر کے
بس اک باقی ہے سرمایا دسمبر

عماد حسین انصاری۔ کراچی

محبت ہم سے نہ ہو گی

محبت ہم سے نہ ہو گی
سنا ہے اِس محبت میں، بہت نقصان ہوتا ہے
مہکتا جھومتا جیون، غموں کے نام ہوتا ہے
سنا ہے چین کھو کر وہ، سحر سے شام روتا ہے
محبت جو بھی کرتا ہے، بہت بدنام ہوتا ہے
محبت ہم سے نہ ہو گی
سنا ہے اِس محبت میں، کہیں بھی دل نہیں لگتا
بِنا اس کے نگاہوں میں، کوئی موسم نہیں جچتا
خفا جس سے محبت ہو، وہ جیون بھر نہیں ہنستا
بہت انمول ہے جو دل، اُجڑ کر پھر نہیں بستا
محبت ہم سے نہ ہو گی!
محبت ہم سے نہ ہو گی!

حمیرا خان۔ شاہ کوٹ۔

ہمیں خاموش چاہت ہے

انہیں کہہ دے کوئی جا کر
بہت تکلیف ہے ہر پل
نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
نہ ہم بِن سانس لیتے ہیں
نہ اب یہ دل سنبھلتا ہے
نہ دھڑکن ساتھ دیتی ہے
نہ پلکیں خشک ہوتی ہیں
نہ کھل کے اشک بہتے ہیں
عجب بے چین حالت ہے
بہت خاموش رہتے ہیں
سبب جو پوچھ لے کوئی
اگر بے چین حالت کا
لبوں پہ اِک ہنسی لا کر
تسلی دے ہی دیتے ہیں
کہ سب موسم کی سازش ہے
اصل میں کیا ہے ناں کہ وہ
بس اِک خاموش چاہت ہے
ہمیں پاگل دسمبر سے......

فرح علی۔ کراچی

تجھے پالیا

میری چاہت
میری ریاضت!
کا ہی تو صلہ ہے کہ
میں نے تجھے ہارتے ہارتے
آخر پا ہی لیا ہے

سعدیہ عابد۔ کراچی

غزل

محبت کی کبھی مجھ پر نظر کرلو تو اچھا ہے
مجھے اب زندگی کا ہمسفر کرلو تو اچھا ہے
بہت دن سے اُداسی ہے میری ویران گلیوں میں
اِدھر سے اب مرے ہمدم گزر جاؤ تو اچھا ہے
تمہارے پیار کے قابل اگر میں ہو نہیں سکتی
مجھے آنکھوں سے اپنی بے بسر کرلو تو اچھا ہے
تمہاری زندگی میں پھر پلٹ کر آ گئی ہوں میں
تمہارے عشق میں پاگل ہوئی جاتی ہے تمثیلہ
خطا اس کی اگر تم درگزر کرلو تو اچھا ہے

تمثیلہ لطیف۔ جودھالہ

کا طریقہ کیا ہے؟
ج: کبھی بچوں کو آپس میں بات کرتے بغور سنا اور دیکھا ہے......بس عمل کریں۔

صغریٰ حمید۔ جہلم

س: زین جی! بات کا بتنگڑ کیسے بنایا جاتا ہے؟
ج: جیسے پر کا کوا، ٹھیکرے سے گڑھا اور رائی کا پربت۔ بنایا جاتا ہے آپ بات کا بتنگڑ بنالیا کیجئے۔

ریاست دین۔ پشاور

س: زین لڑکیاں ناخن کاٹنے کے بجائے بڑھاتی کیوں ہیں؟
ج: تا کہ لڑکے ان سے تعلقات نہ بڑھا سکیں۔

راحیلہ احمد۔ بھوربن

س: زین جی! پیاز اور پیار میں کیا فرق ہے؟
ج: دونوں کی پرت اترنے لگے تو آنسو بہانے پڑتے ہیں۔

شاہد حسن خان۔ سجاول

س: زین بھائی جتنی عورت کی زبان چلتی ہے اگر اسی طرح دماغ چلتا ہو؟
ج: شوہر کے جتنے بال رہ گئے وہ بھی ختم ہو جائیں گے۔

نور جہاں۔ نواب شاہ

س: زین بھائی ان کی مسکراہٹ اب پہچانی کیوں نہیں جاتی؟
ج: انہوں نے نئی بتیسی جو لگائی ہے۔

شایان۔ کراچی

س: جتنی عورت کی زبان چلتی ہے اگر اسی طرح دماغ چلے تو کیا ہوگا؟
ج: شوہر کے سر پر جتنے بال رہ گئے ہیں، وہ بھی ختم ہو جائیں گے۔

ثمینہ اشفاق۔ کراچی

س: زین بھائی۔ شادی کی مووی بنانے کا کیا فائدہ ہے؟
ج: تا کہ جب بیوی سے لڑائی ہو تو فارورڈ کر کے دیکھا جائے۔

دعا شہزاد۔ حیدر آباد

س: بھیا جی! پرندے بجلی کی تاروں پہ بیٹھتے ہیں انہیں کرنٹ کیوں نہیں لگتا؟
ج: ربر کے دستانے پہنے ہوتے ہوں گے۔

ثمیہ غازی۔ بدین

س: بھائی مجھے خواب بہت دھندلے نظر آتے ہیں؟
ج: آپ عینک لگا کر سویا کرو۔

فرواشاہ۔ ماتلی

س: بھیا جی! زندگی آزمائش ہے تو قیامت کیا ہے؟
ج: قیامت Result Day ہے۔

☆☆......☆☆

کے لیے میرا سوال یہ ہے...

کوپن برائے جنوری 2015ء

نام:

پتا:

دنیا میں کس جگہ
دوشیزہ
کے چرچے نہیں
آپ دوشیزہ کے خریدار بن کو ملک کو
زرمبادلہ بھیجیے
اندرون ملک =/720 روپے
ہر ملک' ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے
زرسالانہ
کویت 55 امریکی ڈالرز
ایران 55 امریکی ڈالرز
سعودی عرب 55 امریکی ڈالرز
سری لنکا 55 امریکی ڈالرز
یو اے ای 55 امریکی ڈالرز
جاپان 55 امریکی ڈالرز
مصر 55 امریکی ڈالرز
لیبیا 55 امریکی ڈالرز
یونان 55 امریکی ڈالرز
ڈنمارک 55 امریکی ڈالرز
فرانس 55 امریکی ڈالرز
جرمنی 55 امریکی ڈالرز
برطانیہ 55 امریکی ڈالرز
ہالینڈ 55 امریکی ڈالرز
ناروے 55 امریکی ڈالرز
پولینڈ 55 امریکی ڈالرز
امریکہ 65 امریکی ڈالرز
کینیڈا 65 امریکی ڈالرز
افریقہ 65 امریکی ڈالرز
آسٹریلیا 65 امریکی ڈالرز
آج ہی رابطہ کیجیے
110 آدم آرکیڈ' شہید ملت روڈ/ بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی
فون نمبر: 021-34939823,34930470

ہمارا تمام پروگرام ہفتہ بھر اتوار کے دن کے لیے ملتوی رہتا ہے اور اسی طرح بیگم صاحبہ بھی اتوار کی تاک میں لگی رہتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اتوار کے دن ہمارا ذاتی پروگرام اور ہمارے بیگم صاحبہ کا پروگرام جو ہمارے پروگرام کا رفیق حیات ہوتا ہے مل جل کر ایسا ہو جاتا ہے کہ......

مزاح کا ایک انوکھا رنگ جو شاید آپ سب کے دل کی آواز ہو

وہ مبارک مسعود دن جس کی قدر شاہ داندیا بداند جوہری یعنی یا تو عیسائی یا ہمارے ایسے ملازمت پیشہ ان ہی لوگوں کا یہاں ذکر ہی نہیں جو گھر بیٹھے شنبہ، یکشنبہ، دوشنبہ سب کو ایک ہی لاٹھی ہانکا کرتے ہیں۔ ان کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ ہفتے کے بعد کون سا دن آنے والا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اتوار کی کیا قدر کر سکتے ہیں، ان کے نزدیک جیسے بدھ اور منگل ویسے ہی اتوار۔ اور اس اتوار کی قدر تو کوئی ہمارے دل سے پوچھے کہ یہی وہ دن ہے۔

دن گنے جاتے تھے، جس دن کے لیے

یقین کیجیے کہ اس دن کا انتظار پیر کے دن سے شروع ہو جاتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے ایسے بیچارے ملازمت پیشہ خدا کے بندے اپنی ذاتی زندگی کا دن تمام ہفتہ میں صرف اتوار ہی کو سمجھتے ہیں اس کے علاوہ باقی تمام دن کو بندگی اور بیچارگی میں اس طرح گزارتے ہیں کہ ہم کو اپنے انسان ہونے کا ایک دفعہ بھی احساس نہیں ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مشین ہے اگر لکھنے والا بٹن دبا دیا گیا تو لکھ رہے ہیں۔ اگر بیٹھنے والا پرزہ چلا گیا تو بیٹھے ہوئے ہیں مختصر یہ کہ صبح ہوتے ہی دفتر آنا دفتر میں ایک مقررہ خدمت انجام دینا، شام کو دفتر سے جانا سب کچھ اس طرح ہوتا ہے:

اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

کی ایک متحرک تصویر معلوم ہوتے ہیں ہم نے کبھی یہ غور نہیں کیا کہ علاوہ اتوار کے ہم کبھی انسان رہتے ہیں یا نہیں اور نہ اس مسئلے پر غور کرنے کا موقع ملا لیکن جب کبھی اتوار کے دن ہم نے اپنی زندگی پر غور کیا تو یہی نتیجہ نکلا کہ ہماری زندگی کے دن شمار کرنے والے جو چاہیں شمار کریں لیکن، ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ اتوار کا دن ہماری زندگی کے دنوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ اس کے علاوہ باقی دن تو خدا جانے ہم زندگی بسر کرتے ہیں یا زندگی ہم کو بسر کرتی ہے۔ اب اس سے اندازہ فرمائیے کہ بجائے بہادر شاہ ظفر کے آپ کے جناب غالب صاحب قبلہ ہم کو یہ دعا دیتے ہیں کہ

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

تو یا تو ہم ان سے کہتے کہ قبلہ عالم یہ دعا آپ ہی

کو مبارک رہے۔ ہم کو تو ایسی دعا دیجئے کہ ہماری جتنی زندگی بھی ہے اس میں چاہے کچھ تخفیف کر دی جائے لیکن ہر دن اتوار بن جائے یا کم سے کم ہفتہ میں دو تین مرتبہ اتوار کا دن آیا کرے ذرا غور تو فرمائیے کہ ایک اتوار کا دن ہفتہ بھر کے بعد آتا ہے۔ جس میں معمولی دنوں کی طرح بارہ گھنٹے ہوتے ہیں۔ ان ہی بارہ گھنٹوں میں اپنی خوشی کھانا کھائیے، اپنی خوشی نہائیے، اپنی خوشی بال بنوائیے، اپنی خوشی سیر کو جائیے اور اگر کہیں اپنی خوشی سو رہے ہیں تو تمام کام آئندہ اتوار تک ملتوی یا اگر بیگم صاحبہ نے موقع غنیمت جان کر اس وقت کی قدر کرتے ہوئے اپنی خوشیاں پوری کرانا شروع کر دیں تو بس دن بھر گھر سے بزاز کی دکان، گھر سے اناج کی منڈی، گھر سے جوتے والے کی دکان، گھر سے گوٹا کناری، لیس، پانکڑی والے کی دکان کے سو سو چکر کاٹیے اور چورن چٹنی دال کا مسالہ فراہم کرتے ہوئے شام کو اس طرح تھک کر پڑ رہیے گویا دن بھر ہل جوتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ہمارا تمام پروگرام ہفتہ بھر اتوار کے دن کے لیے ملتوی رہتا ہے۔ اور اسی طرح بیگم صاحبہ بھی اتوار کی تاک میں لگی رہتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اتوار کے دن ہمارا ذاتی پروگرام اور ہمارے بیگم صاحبہ کا پروگرام جو ہمارے پروگرام کا رفیق حیات ہوتا ہے مل جل کر ایسا ہو جاتا ہے، کہ ہفتہ بھر کا کھایا پیا نکلوا کر چھوڑتا ہے۔ ہم تو تمام ہفتہ یہ کرتے ہیں کہ بالوں پر ہاتھ پھیرا اور زیر لب کہہ دیا اب کی اتوار کو بنوائیں گے۔ جوتے پر نظر پڑی اور طے کر لیا کہ اب کی اتوار کو پالش ہوگی۔ کپڑوں کو دیکھا اور ارادہ کر لیا کہ اب اتوار کو نہا کر بدلیں گے۔ کسی نے نہ ملنے کی شکایت کی تو وعدہ کر لیا کہ اب کی اتوار کو حاضر ہوں گا کوئی مر گیا تو تعزیت کے لیے بھی اتوار کے کا دن مقرر کیا گیا کسی نے ہم سے ملنے کو کہا تو اتوار کا دن

ترقی کا راز

نادر بادشاہ نے جب دلی پر قبضہ کیا تو اسے ہاتھی کی سواری پیش کی گئی۔ ہاتھی پر بیٹھ کر اس نے مہاوت سے کہا۔

''اس کی لگام میرے ہاتھ میں دے دو۔''

مہاوت نے کہا۔ ''حضور! اس کی لگام نہیں ہوتی بلکہ یہ میرے اشارے پر چلتا ہے۔''

نادر شاہ یہ سن کر ہاتھی سے اتر آیا اور کہنے لگا۔

''میں ایسی سواری پر نہیں بیٹھتا جس کی لگام کسی اور کے ہاتھ میں ہو۔''

حسنِ انتخاب: محمد کاشف بٹ۔ سیالکوٹ

دیا کہیں سفر کو جانا ہوا تو اتوار کا دن سفر کی ٹھہری، شکار کو دل چاہا تو اتوار پر اٹھا رکھا غرضیکہ تمام ہفتہ جو باتیں ہم کو اپنی زندگی کے متعلق یاد آئیں ہم نے سب کو اتوار کے سپرد کر دیا لیکن ہم کو یہ خبر نہیں ہوتی کہ اسی طرح بیگم صاحبہ نمک ختم ہونے پر۔ کپڑے پھٹنے پر، زیور ٹوٹنے پر، غرضیکہ ہر بات پر اتوار کو یاد کیا کرتی ہیں اور اتوار کے دن ان کو وہ باتیں سوجھتی ہیں کہ ہمارے فرشتوں کو بھی نہیں سوجھ سکتیں۔ وہ تو کہیئے اس دن ہمارے دفتر کی طرح ہسپتال کچہریاں، ڈاک خانہ مدرسے وغیرہ سب بند ہوتے ہیں، ورنہ بچوں کو ہسپتال لے جانا، اسکول میں نام لکھوانا، وغیرہ بھی اسی دن پر اٹھا رکھا جاتا۔ اور اب شکر ہے کہ ہم کو اس سے ایک طرح کی یکسوئی حاصل ہے اس میں شک نہیں کہ اتوار کے دن کی مشغولیتیں معمولی دنوں سے دگنی اور چوگنی ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود کہ ہم اتوار کے عاشق صرف اس لیے ہیں کہ وہ تمام مشغولیتیں ہم کو اپنی اور اپنی ذاتی زندگی سے متعلق معلوم ہوتی ہیں اور باقی دنوں میں تو نہیں معلوم ہم کس طرح اور کس کے لیے جیتے ہیں۔

☆☆......☆☆

سلمان خان، قوال بن گئے

سلو بھیا! آنے والی فلم 'بجرنگی بھائی جان' کے لیے قوال بن گئے کیونکہ اس فلم میں ایک قوالی بھی شامل ہے۔ دبنگ خان پرفیکشن کے لیے مکمل طور پر قوال بن گئے ہیں۔ اس قوالی کے چرچے ابھی سے بولی وڈ میں گونج

رہے ہیں۔ کیونکہ سلو بھیا یہ قوالی اپنی آواز میں ریکارڈ کرائیں گے۔ یاد رہے کہ اس سے پہلے اپنی فلم 'کک' میں بینگ اوور بھی وہ ریکارڈ کرواکر مقبول کرا چکے ہیں۔

ایان علی کی گڈی چڑھ گئی

ایک انٹرنیشنل ایجنسی کی طرف سے ہونے والے سروے 'ٹاپ موسٹ بیوٹی فل ماڈل آف 2014ء' میں دنیا کے مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والی ماڈلز کے پروفائل رکھے گئے۔ لولی وڈ کی ایان علی کو دسواں نمبر دیا

گیا۔ یہ خبر واقعی لولی وڈ فیشن انڈسٹری کے لیے خوش آئند ہے۔ گڈ لک...... ایان علی۔

جوہی چاؤ فور سیون

بولی وڈ کی شوخ و چنچل جوہی چاؤلہ نے اپنی **47** ویں سال گرہ منائی۔ **1984**ء میں جوہی 'مس انڈیا' کا تاج اپنے سر پر سجانے کے بعد فلم انڈسٹری میں داخل ہوگئیں۔ **1986**ء میں فلم 'سلطنت' سے اپنے کیریئر کا آغاز کرنے والی جوہی **1988**ء میں 'قیامت سے قیامت تک' سے لاکھوں دلوں کی دھڑکن بن گئیں۔ جوہی چاؤلہ نے **26** برس کے کیریئر میں **70** سے زائد فلموں میں کام کیا۔ جن میں عشق، دراڑ، ڈر، لولو، اینا مینا ڈیکا،

لٹیرے، زہریلے، انداز، ساڑھے سات پھیرے، گلاب گینگ، ہم ہیں راہی پیار کے۔

دوسری ''میرا'' بھی تیار

میرا کے بعد (اب بھی) لولی وڈ کی دوسری سب سے بڑی سپر اسٹار (آہم م م) لیلیٰ جی ہیں۔ کیونکہ یہ بات ہم کنٹروورسی پھیلانے کے حوالے سے کررہے ہیں۔ اس لیے آپ کو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ انڈسٹری میں In رہنے کے لیے شفقت چیمہ تک کی ہیروئن بننے والی لیلیٰ

کو (اس عمر میں) بولی وڈ سے آفرز آنے لگی ہیں۔

بہت جلد آپ انہیں رنبیر کپور کے ساتھ کاسٹ ہوتا بھی سنیں گے اور پھر ٹائیں ٹائیں فش، پھر لیلیٰ میں جذبۂ حب الوطنی جاگ جائے گا اور...... وہ خواب سے بیدار جائیں گی۔ لیلیٰ سے واقف ہیں نا آپ......

ثناء پھر سے اِن

لولی وڈ کی سپر اسٹار ثناء نے بیٹے کی پیدائش سے قبل شوبز سرگرمیوں کو کلوز کردیا تھا اب پھر سے شوبز میں شو اِن بزنس کے لیے واپس آگئی ہیں۔ بہت جلد پھر سے

ثناء پوری آن بان شان کے ساتھ، شوبز مصروفیات کا آغاز کریں گی۔ تیار ہوجایئے کیونکہ فلمز کے لیے تو وہ اب اَن فٹ ہیں۔ منی اسکرین ہی سے سلور کمائیں گی اور گھر کا چولہا ہانڈی چلائیں گی۔

ارجن کپور کے سوناکشی کے ساتھ تیور

بولی وڈ کے کامیاب اداکار ارجن کپور اور خوش قسمت سوناکشی کی نئی فلم تیوز کا پہلا ٹریلر منظر عام پر آگیا

ہے۔ اس فلم کے ذریعے یہ دونوں تو تہلکہ مچائیں گے ہی اس فلم میں ایک اور دھماکہ منوج باجپائی بھی فل فارم میں نظر آئیں گے۔ اس فلم کی نمائش آئندہ برس 9 جنوری کو متوقع ہے۔

عامر خان، ایشوریہ رائے پہلی بار ساتھ

پہلی بار عامر خان اور ایشوریہ رائے کی جوڑی بڑے پردے پر نیا رنگ جمائے گی۔ کرن جوہر نے ایک کنگ فلم 'دھرما' میں مسٹر پرفیکٹ کے ساتھ بڑی بہو ایشوریہ رائے بچن کو کاسٹ کیا ہے۔ لیجیے ریڈرز Wait & Watch۔ دونوں سپر اسٹارز کی موجودگی کی وجہ سے ابھی سے اس فلم کو سپر ہٹ قرار دیا جانے لگا ہے۔

الیانا ڈی کروز کی ہیپی اینڈنگ

ساؤتھ کی 16 فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھانے کے بعد بولی وڈ کا رُخ کرنے والی الیانا ڈی کروز نے بہت سوچ سمجھ کر سیف علی خان کے ساتھ 'ہیپی اینڈنگ' میں کام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ الیانا نے جب انڈسٹری میں قدم رکھا تو وہ فقط 18 برس کی تھیں اور اب وہ 26 برس کی ہو گئی ہیں اور ہر فیصلہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر، سوچ سمجھ کر کرتی ہیں۔ 'ہیپی اینڈنگ' کی ریلیز 2014ء کے اواخر میں متوقع ہے۔

کپل شرما 'بینگ چور' میں

کامیڈی سرکس سے شہرت کی بلندیوں کو چھونے والے کپل شرما نے عباس مستان کے ساتھ بولی وڈ میں دھماکے دار انٹری دے ماری ہے۔ ڈائریکٹر عباس مستان ایکشن فلموں کے مانے ہوئے ہدایت کار ہیں۔ دیکھتے ہیں اس بار کپل شرما کی قسمت اور عباس مستان کی ہدایتکاری کون سے پہاڑ سر کرتی ہے۔

جیکولین کا ڈبل رول

بھوشن کمار کی آنے والی فلم 'رائے' میں بولی وڈ ساحرہ جیکولین فرنانڈس ڈبل رول میں جلوہ گر ہو رہی ہیں۔ اس فلم میں اُن کے ساتھ ارجن رام پال اور رنبیر کپور بھی کام کر رہے ہیں۔ جیکولین کی خوش قسمتی ہے کہ انہیں اتنی جلدی ایک چیلنجنگ رول مل گیا ہے۔ اُمید ہے جیکولین اپنی پرفارمنس سے 'رائے' کو ضرور کامیاب کرائیں گے۔

پریانکا چوپڑا کا خواب پورا ہوا

وارسوا میں 100 کروڑ مالیت کا بنگلہ خرید کر پریانکا چوپڑا نے ایک خواب کی تکمیل کر لی۔ بولی وڈ کی نمبرون

اداکارہ پریانکا نے 2014ء میں 'میری کوم' کے ذریعے اپنی اداکاری کا لوہا منوالیا۔ پریانکا کے بنگلے میں 15 بیڈ رومز ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ پریانکا اس بنگلے میں اپنے کس کس خواب کی تعبیر پائیں گی۔

دیا مرزا کا ہنی مون

بولی وڈ کی اداکارہ دیا مرزا اپنی شوبز مصروفیات میں اتنا مگن ہیں کہ اپنے ہبی ساحل سانگھا کو اب تک ہنی مون کے لیے وقت نہیں دے پا رہی ہیں۔ دیا کے لیے بس اتنا

کہنا ہے کہ ڈھائی گھنٹے کی فلم کے لیے اپنی لائف ٹائم فلم کو خراب نہ کریں اور فوری طور پر ساحل کے ساتھ ہنی مون یاترا پر روانہ ہو جائیں۔

نئے دیول، بہت جلد اسکرین پر

سنی دیول کی آج سے 25 برس پہلے ریلیز ہونے

والی فلم 'گھائل' نے ریکارڈ کامیابی حاصل کی تھی۔ جس کا گیت 'ساتھیا تیری قسم' آج بھی سدا بہار ہے۔ سنی دیول نے اپنے دونوں بیٹوں بڑے کرن دیول اور چھوٹے راج ویر دیول کو لانچ کرنے کا فیصلہ کیا تو 'گھائل' ہی کے سیکوئل پر کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ ریڈرز اب بہت جلد آپ اس فیملی ڈرامہ کو سلور اسکور پر دیکھ سکیں گے جس میں دادا دھرمیندر، چاچا بوبی دیول، باپ سنی دیول اور پوتے کرن اور راج ویر بھی ساتھ ہوں گے۔

سورج پنچولی کی ہیرو

آدیتیہ پنچولی 30 برس بولی وڈ میں ہیرو کی Race میں دوڑتے رہے مگر ناکام رہے۔ ہاں

سپورٹنگ اور سیکنڈ ہیرو کے طور پر انہیں ضرور قبول کیا گیا۔ اب ان کے بیٹے سورج پنچولی کو اُن کی پہلی فلم ملی ہے اور اس فلم کے ذریعے ایک نئے ہیرو سورج پنچولی اور نئی ہیروئن آتھیا سیٹھی کا جنم بھی ہو رہا ہے۔ 1983ء کی بلاک بسٹر، سبھاش گھئی کی Debet اسٹار جیکی شروف کے ساتھ کامیاب ترین فلم 'ہیرو' نے ہیرو کا Trand ہی بدل دیا تھا۔ اب دیکھنا ہے نکھل ایڈوانی کی 'ہیرو' کون سے جھنڈے گاڑتی ہے۔ سلمان خان اور آدیتیہ پنچولی بھی اس فلم میں اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ آدیتیہ کا سگا بیٹا اس فلم میں اُن کے لے پالک بیٹے کا رول پلے کر رہا ہے۔

☆☆......☆☆

نفسیاتی اُلجھنیں اور اُن کا حل

مختار بانو طاہرہ

زندگی اپنے ساتھ جہاں بہت ساری خوشیاں لے کر آتی ہے وہیں بہت سارے ایسے مسائل بھی جنم لیتے ہیں جو اس زندگی کو مشکلات کے شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں ان میں سے بیشتر الجھنیں انسان کی نفسیات سے جڑی ہوتی ہیں اور انہیں انسان از خود حل کرسکتا ہے۔ یہ سلسلہ بھی اُن ہی الجھنوں کو سلجھانے کی ایک کڑی ہے۔ اپنے مسائل لکھ بھیجیں، ہماری کوشش ہوگی کہ آپ ان مسائل سے چھٹکارہ پالیں۔

شہناز۔ خیبر پختونخوا

✿: باجی میری بیٹی نے ضد کر کے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا ہے اور بیٹے کو اپنے والد کی حمایت حاصل ہونے پر اسٹوڈنٹ ویزا مل گیا۔ وہ انگلینڈ جارہا ہے۔ دو بچے ابھی کالج میں پڑھتے ہیں، وقت آنے پر یہ بھی کہیں نہ کہیں چلے جائیں گے۔ مجھے آنے والے وقت کا خوف ہے۔ وسوسے ستاتے ہیں۔ دنیا کے حالات میں تبدیلی آرہی ہے۔ ملک کے حالات بھی ٹھیک نہیں رہے۔ پتا نہیں کیا ہوگا۔ ایسے ایسے واقعات ظہور پذیر ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے جو آئے دن خبروں میں سنتی رہتی ہوں۔

ج: ان واقعات کا خوف جو پیش نہیں آئے۔ وسوسے، اندیشے یہ سب ذہن میں آنے والے منفی خیالات کی پیداوار ہیں۔ پریشانی کے بغیر اس کا بوجھ اٹھانے والے ایسی مشکل میں خود کو ڈالے رکھتے ہیں جس کا وجود نہیں ہوتا۔ شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ اندیشے حقیقت بنے ہوں، آنے والا وقت کیسا ہوگا؟ کیا حالات پیش آئیں گے اس کا فیصلہ غیب سے ہوتا ہے، اوہام اور وسوسوں سے نہیں۔ لوگ چاہتے ہیں ان کے بچے اچھی تعلیم حاصل کریں، کیونکہ تعلیم پر ہی بہتر اور روشن مستقبل کا انحصار ہوتا ہے۔ آپ کو بچوں پر فخر کرنا چاہیے۔ بری خبریں بار بار نہ سنا کریں۔

سلمٰی قاضی۔ کراچی

✿: پیاری باجی! یقین کریں مجھے بے حد تکلیف ہوتی ہے جب میرے بچے اپنے باپ سے تیز آواز میں بات کرتے ہیں۔ وہ مجھ سے بھی بدتمیزی کرلیتے ہیں۔ مگر میں درگزر کردیتی ہوں۔ میرے شوہر کو برداشت نہیں۔ ہمارا آپس میں بھی اختلاف ہوتا رہا ہے۔ بچے یہ بات نہیں سمجھتے کہ میرا اور شوہر کا برابری کا معاملہ ہے اور بچوں کا احترام کرنے والا رشتہ ہے۔ وہ مجھے کچھ بھی کہہ لیں لیکن باپ کی عزت کریں۔ یہی میری خواہش ہے، دل چاہتا ہے بچے مثالی ہوں۔

ج: بچوں کو مثالی بنانے کے لیے والدین کو بھی مثالی تعلقات قائم کرنے ضروری ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ دونوں اونچی آواز میں تلخ کلامی کریں اور بچے نہ سیکھیں۔ جہاں تک بچوں کا باپ کے ساتھ احترام والا رشتہ ہے تو آپ کا بھی اپنے شوہر کے ساتھ عزت و احترام کا ہی رشتہ ہے۔

شینا گل۔ ایبٹ آباد

✿: شروع سے میری عادت ہے اپنے سارے مضامین ایک ساتھ لے کر بیٹھتا اور پڑھ کر اُٹھ جاتا، کبھی فیل نہیں ہوا۔ میٹرک میں اچھے نمبر نہیں آرہے۔ سالانہ امتحان باقی ہے۔ ٹیسٹ میں فیل ہو رہا ہوں۔

اب ٹیچر بھی بدل گئی ہیں۔ میری سمجھ میں پہلے والی ٹیچر کی بات آتی تھی۔ کبھی سوچتا ہوں پڑھنے میں اچھا نہ ہونے کی وجہ نفسیاتی بھی ہوسکتی ہے۔

ج: اب آپ بڑی کلاس میں ہیں۔ ہر مضمون کو علیحدہ علیحدہ پڑھنے کی ضرورت ہوگی۔ اسکول میں پڑھائے جانے کے حوالے سے گھر میں بھی پڑھنے کے لیے دن اور گھنٹے مقرر کرلیں۔ مثلاً ایک دن دو گھنٹے صرف کیمسٹری کا مضمون پڑھنا ہے۔ دوسرے دن حساب کے مضمون کو وقت دینا ہے، اسی طرح تیسرے دن اور باقی دن بھی اسی طرح بھرپور توجہ دیں۔ یہ ٹائم ٹیبل اپنے کمرے کی دیوار پر لگا کر رکھیں۔ الفاظ بڑے ہوں کہ صبح اُٹھ کر بستر سے ہی نظر آجائیں۔ جو مضمون پڑھنا ہو اس پر نگاہ مرکوز کریں۔ اس کی کتابیں اپنی میز پر رکھ لیں۔ اس کے علاوہ ہر سوچ کو ذہن سے نکال دیں۔ اتنی توجہ سے پڑھتے ہوئے ٹیسٹ دیں گے تو کبھی فیل نہیں ہوں گے اور ساتھ ہی امتحان کی بھی تیاری ہوجائے گی۔

محمد راحت احمد۔ کوٹلی

باجی جان! گزشتہ چھ ماہ سے ہماری والدہ کی عجیب حالت ہے۔ انہیں اپنے گردوپیش کی خبر نہیں۔ ورنہ پہلے ان کے گرد بچوں اور بڑوں کا ہجوم رہتا تھا۔ تحفے تحائف دینا، دعوتیں کرنا، لوگوں سے رابطے رکھنا، تقریبات میں شرکت کرنا ان کے مشاغل تھے۔ اتنی ہر دلعزیز خاتون کو کسی کا خیال نہ رہے تو حیرانی ہوتی ہے۔ اب کئی دن کپڑے نہیں بدلتیں، پہلے بولنا کم کیا، ایک جگہ بیٹھی رہتی ہیں۔ آہستہ آہستہ عادت تبدیل ہوتے ہوتے اب لاتعلقی اختیار کرنے لگیں۔ اگر وہ ہم سے ناراض ہیں تو بتائیں ہم بہن بھائیوں نے ان سے معافی مانگی ہے۔ کسی کی بات اثر نہیں کررہی۔ میں آپ کو سچ بتا رہا ہوں، مجھے اُن کی کیفیت پر رونا آتا ہے۔ کوئی تکلیف نہیں بتاتیں۔

ج: جسمانی تکلیفوں کو بیان کرنا آسان ہوتا ہے جبکہ ذہنی حالت کو بیان کرنا مشکل اور بعض اوقات ناممکن ہوجاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جسم بیمار ہوتا ہے تو دماغ صحیح کام کرتا ہے اور مریض جسمانی تکلیف کو محسوس کرکے بیان کردیتا ہے۔ اگر دماغ ہی ٹھیک طرح کام نہ کرے بلکہ بیمار ہوجائے تو ایسے موقع پر مریض کے اختیار میں نہیں ہوتا کہ وہ بتا سکے کہ اسے کیا تکلیف ہے۔ گردوپیش سے بے خبر ہوجانا معمولی بات نہیں۔ والدہ کی عادت نہیں بلکہ رویہ تبدیل ہورہا ہے۔ چھ ماہ میں اتنی زیادہ تبدیلی کہ انسان کی شخصیت ہی بدل جائے، معمولی نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید لاتعلقی اختیار کریں اور بھول کی کیفیت پیدا ہوجائے، ان کے ذہنی علاج کی طرف توجہ دیں۔

راحت جان۔ سیالکوٹ

میرا چھوٹا بھائی جو میرے ہی کمرے میں سوتا ہے۔ صبح اُٹھ کر مجھے بتاتا ہے کہ میں رات کو بڑبڑا رہا تھا۔ تب میں یاد کرتا ہوں کہ واقعی ایسا ہوا تو مجھے یاد نہیں آتا۔ البتہ ہلکا ہلکا سا خواب یاد آتا ہے مگر واضح طور پر کوئی بات نہیں یاد آتی۔ امی بتاتی ہیں میرے چچا نیند میں چلتے تھے۔ مجھ میں ان کا اثر آیا ہے۔

ج: ماہرین نفسیات کی رائے میں خواب میں بڑبڑانے والے لوگوں کی ذہنی ساخت نیند میں چلنے والے لوگوں سے مختلف ہوتی ہے۔ پہلی قسم کے لوگوں میں تخیل کی بہت صلاحیت ہوتی ہے جبکہ دوسری قسم کے لوگ عملی کارکردگی میں تیز ہوتے ہیں یعنی خواب دیکھنے والے اور بڑبڑانے والے تصور کا سہارا لیتے ہیں جبکہ نیند میں چلنے والے جسم کو حرکت دیتے ہیں۔ عام طور پر یہ عادتیں عمر کے ساتھ ختم ہوجاتی ہیں۔ آپ کوشش کریں سونے سے پہلے دماغ کو منفی خیالات سے خالی کرلیا جائے۔

☆☆......☆☆

نوٹ: اپنا مسئلہ بھیجتے ہوئے لفافے کے ایک کونے پر ''نفسیاتی مسائل'' ضرور لکھیں تاکہ آپ کے خطوط براہِ راست متعلقہ شعبے تک پہنچائے جاسکیں۔

خط و کتابت کے لیے:

110 آدم آرکیڈ، شہید طلت روڈ، بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی

نادیہ طارق

بہت پیارے ساتھیو۔ ابھی عید قرباں کا تہوار گزرا ہے۔ قربانی کا گوشت کھا کھا کر ہم یکسانیت کی شکار، ڈشز سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں۔ اِس ماہ ہم آپ کے لیے مچھلی اور جھینگوں کی ڈشز ہیں یہ ہماری سی فوڈز میں شمار ہوتی ہیں۔ مچھلی اور جھینگوں سے بنی یہ ڈشز یقیناً آپ کے دستر خوان اور Taste کو تھوڑا چینج دیں گی۔ اس ماہ کا کچن کارنر آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

فش کوفتہ کری

اجزاء

بغیر کانٹے کی مچھلی	آدھا کلو
کٹی ہوئی پیاز	دو سے تین عدد
کٹی ہوئی ہری مرچ	پانچ عدد
پھینٹا ہوا انڈا	ایک عدد
ڈبل روٹی کا چورا	آدھا کپ
لیموں	ایک عدد
نمک	حسبِ ذائقہ
پسا ہوا دھنیا	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
پسا ہوا زیرہ	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
ہلدی	چوتھائی چائے کا چمچہ
پسا ہوا لہسن	آدھا چائے کا چمچہ
پسی ہوئی ادرک	آدھا چائے کا چمچہ
ٹماٹر کا گودا	آدھا کپ
کٹا ہوا دھنیا	دو کھانے کے چمچے
پسی ہوئی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
تیل	حسبِ ضرورت

ترکیب:
مچھلی کے گوشت کو پیس لیں، فرائی پین میں ایک کھانے کا چمچہ تیل گرم کر کے اس میں تھوڑی سی پیاز، ہری مرچ اور ہرا دھنیا ڈال کر تھوڑی دیر پکائیں۔ جب یہ نرم ہو جائیں تو نکال کر الگ رکھ دیں۔ ایک پیالے میں مچھلی کا گوشت، انڈا، لیموں کا رس اور پیاز کا آمیزہ شامل کر کے کوفتے بنالیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کریں، ڈبل روٹی کا چورا لگا کر کوفتے فرائی کریں۔ دیگچی میں تیل گرم کر کے پہلے پیاز سُنہری کریں پھر ادرک، لہسن، پسا ہوا دھنیا، زیرہ، لال مرچ، ہلدی اور ٹماٹر شامل کر کے بھون لیں۔ کوفتے ڈال کر مزید دس منٹ پکانے کے بعد اُتار لیں۔ نان یا سادہ چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

فش پیٹیز

اجزاء

مچھلی کا قیمہ	ڈھائی کپ
اُبلے ہوئے آلو	دو عدد
چوکور کٹی ہوئی پیاز	ایک عدد
پسا ہوا لہسن	ایک عدد
پسی ہوئی ادرک	ایک عدد
کٹی ہوئی ہری مرچ	پانچ عدد
پسا ہوا گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
ہلدی	چوتھائی چائے کا چمچہ
نمک	حسبِ ذائقہ
انڈے	دو عدد
ڈبل روٹی کا چورا	آدھا کپ
تیل	حسبِ ضرورت
کٹا ہوا دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب:

ایک پیالے میں انڈے کو پھینٹ لیں اب بڑے سائز کے پیالے میں تمام اجزا ڈالیں اور پھینٹے ہوئے انڈے کی نصف مقدار شامل کرکے ملائیں آمیزے کو رول کی طرح لمبا بنا کر ہلکے ہاتھ سے چپٹا کریں، کڑاہی میں تیل گرم کریں، پیٹیز پر انڈا لگا کر ڈبل روٹی کا چورا لگائیں پھر سنہری ہونے تک تلیں۔ ہری چٹنی یا کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

لاہوری فش

اجزاء

مچھلی	ایک کلو
پسا ہوا لہسن	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
پسی ہوئی ادرک	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
پسی ہوئی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
پسا ہوا دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
پسا ہوا گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
پسا ہوا زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	چار کھانے کے چمچے
سرکہ	دو کھانے کے چمچے
پسی ہوئی اجوائن	ایک چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت

آمیزہ بنانے کے لیے:

بیسن چھ کھانے کے چمچے، میدہ ایک کپ، کارن فلور چار کھانے کے چمچے، نمک حسب ذائقہ۔

ترکیب:

مچھلی کو دھو کر خشک کرلیں، ایک پیالے میں لیموں کا رس، سرکہ اور پسے ہوئے مسالے ڈال کر ملائیں۔ اب مچھلی کو ایک بڑے برتن میں رکھ کر مسالا لگائیں اور ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ ایک برتن میں بیسن، میدہ، کارن فلور، نمک اور پانی ڈال کر گاڑھا آمیزہ بنالیں، کڑاہی میں تیل گرم کریں، مسالا لگی ہوئی مچھلی کو میدے کا آمیزہ لگا کر گرم تیل میں ڈیپ فرائی کریں۔ اس دوران آنچ درمیانی رکھیں۔ مچھلی کا رنگ سنہری ہوجانے پر اسے نکال لیں۔ سلاد اور چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

ہول بریڈ فش

اجزاء

ثابت مچھلی	دو کلو
سفید الائچی	چھ عدد
ثابت سفید زیرہ	دو چائے کے چمچے
دہی	چار کھانے کے چمچے
باریک کٹا ہوا لہسن	دو جوے
باریک کٹی ہوئی ادرک	آدھا چائے کا چمچہ
پسا ہوا گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	ایک چٹکی
دکنی مرچ	چوتھائی چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
لال فوڈ کلر	ایک چٹکی
زیتون کا تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

مچھلی دھونے کے بعد خشک ہونے کے لیے رکھ دیں، چھری سے دونوں جانب کٹ کے نشان لگائیں، فرائی پین میں تھوڑا سا تیل گرم کرکے الائچی کے دانے اور زیرہ بھونیں جیسے ہی خوشبو آئے فوراً نکال کر موٹا موٹا پیس لیں۔ بلینڈر میں تمام مسالے، دہی اور فوڈ کلر ڈال کر آمیزہ بنالیں، مچھلی کے دونوں جانب آمیزے کو اچھی طرح لگا کر فریج میں تین سے چار گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ گرل کو چکنا کرکے گرم کریں، برش کی مدد سے مچھلی پر بھی تیل لگائیں، گرل پر مچھلی کو لگا کر تقریباً سات منٹ تک پکائیں جب یہ دونوں جانب سے پک جائے تو ڈش میں رکھ کر ٹماٹر، پیاز، لیموں اور ہرے دھنیے سے سجا کر چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

پراؤن بال چاؤ

اجزاء

درمیانے سائز کے جھینگے	ایک کلو
تیل	چار کھانے کے چمچے

چوکور کٹے ہوئے ٹماٹر — تین عدد
لہسن — پانچ سے چھ عدد
ادرک — ایک انچ کا ٹکڑا
ثابت لال مرچ — دس سے بارہ عدد
زیرہ — ایک کھانے کا چمچہ
رائی — چوتھائی چائے کا چمچہ
دار چینی — دو انچ کا ٹکڑا
لونگ — آٹھ سے دس عدد
پیاز — ایک عدد
چینی — دو کھانے کے چمچے
سرکہ — آدھا کپ
نمک — حسب ذائقہ
کڑی پتا — آٹھ سے دس عدد

ترکیب:
ایک فرائی پین میں لال مرچ، زیرہ، رائی لونگ اور دار چینی ڈال کر بھونیں۔ ٹھنڈا کر کے پیس لیں۔ ادرک لہسن بھی پیس لیں۔ اب ایک علیحدہ پین میں تیل گرم کریں کڑی پتا اور پیاز چوکور کاٹ کر ڈالیں۔ ٹماٹر ڈال کر نرم ہونے تک پکائیں، اب پسے ہوئے مسالے میں سرکہ، چینی اور نمک شامل کر دیں۔ جب مسالا اچھی طرح بھن جائے تو جھینگے شامل کریں۔ آٹھ سے دس منٹ تک پکائیں۔ تیار ہونے پر گرم گرم اُبلے ہوئے چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

چٹ پٹے ماہی کباب

اجزاء
بغیر کانٹے کی مچھلی — آدھا کلو
نمک — حسب ذائقہ
پسی ہوئی کالی مرچ — آدھا چائے کا چمچہ
پسی ہوئی لال مرچ — آدھا چائے کا چمچہ
پسا ہوا گرم مسالا — آدھا چائے کا چمچہ
پسا ہوا لہسن — آدھا چائے کا چمچہ
بھنا ہوا سفید زیرہ — آدھا چائے کا چمچہ
کٹی ہوئی پیاز — چار کھانے کے چمچے
کٹی ہوئی ہری مرچ — دو کھانے کے چمچے
کٹا ہوا ہرا دھنیا — دو کھانے کے چمچے
تیل — حسب ضرورت

ترکیب:
سب سے پہلے مچھلی میں نمک، لہسن اور تھوڑا سا پانی ڈال کر پکنے رکھ دیں، تھوڑی دیر میں بھانپ میں گل جائے گی پھر اسے ٹھنڈا کرنے کے بعد تمام اجزا ڈال کر اچھی طرح ملائیں، جب تمام چیزیں یکجا ہو جائیں تو حسب پسند شکل دے کر کباب بنالیں انڈا پھینٹ لیں اور تیار کیے ہوئے کباب اس میں ڈبو کر دھیمی آنچ پر تلیں۔ ٹماٹو کیچپ یا چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

نیپالی چلی پراؤن

اجزاء
درمیانی سائز کے جھینگے — آدھا کلو
چلی ساس — دو کھانے کے چمچے
کٹا ہوا پارسلے — آدھا کپ
زیتون کا تیل — تین کھانے کے چمچے
نمک — حسب ذائقہ
پسی ہوئی کالی مرچ — حسب ذائقہ

میش پوٹیٹو و دا آلیو آئل
آلو — چار عدد
زیتون کا تیل — چار کھانے کے چمچے
کٹا ہوا پارسلے — چوتھائی کپ
پسی ہوئی کالی مرچ — حسب ذائقہ
نمک — حسب ذائقہ

ترکیب:
جھینگوں کی نس نکال لیں دھو کر اِن کو خشک ہونے کے لیے رکھ دیں۔ پیالے میں چلی ساس، نمک اور کالی مرچ کا آمیزہ بنالیں پھر اس آمیزے کو جھینگوں پر لگا کر رکھ دیں۔ فرائی پین میں زیتون کا تیل گرم کریں پھر دھیمی آنچ پر جھینگے تلیں، تیل سے نکالنے کے بعد جھینگوں پر کٹا ہوا پارسلے ڈالیں۔ دیگچی میں پانی، نمک اور آلو ڈال کر اُبالیں، جب آلو گل جائیں تو چھلکا اُتار کر ان کو مسل لیں پھر پارسلے، نمک اور کالی مرچ شامل کر کے گول کباب بنالیں، جھینگوں کو میش پوٹیٹو اور چلی ساس کے ساتھ پیش کریں۔

☆☆......☆☆

حکیم جی!

محمد رضوان حکیم

ساتھیو! اکثر ہمیں کسی ایسی بیماری سے سامنا کرنا پڑتا ہے جس کے لیے ہمیں سمندر کی تہہ یا آسمان کی بلندیوں، جنگل بیابانوں یا پہاڑوں تک پر جانا پڑ جاتا ہے مگر...... جان ہے تو جہان ہے۔ خدا اگر بیماری دیتا ہے تو اُس نے شفا بھی دی ہے۔ قدرت کے طریقۂ علاج کا آج بھی کوئی مول نہیں۔ حکمت کو آج بھی روزِ اول کی طرح عروج حاصل ہے۔ اسی لیے طبیب اور حکیم صاحبان کو خدائی تحفہ کہا جاتا ہے۔ آپ کی صحت اور تندرستی کے لیے ہم نے یہ سلسلہ بعنوان 'حکیم جی' شروع کیا ہے۔ اُمید ہے ہمارے مستند اور تجربہ کار حکیم صاحب آپ کی جملہ بیماریوں کے خاتمے کے لیے اہم کردار ادا کریں گے۔ نیا سلسلہ حکیم جی! آپ کو کیسا لگا؟ اپنی آراء سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

بالوں کا خوبصورت، گھنا اور پُرکشش ہونا انسان کو جاذبِ نظر بناتا ہے کیونکہ بالوں کی خوبصورتی انسان کی شخصیت کو دوسروں سے ممتاز کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

بالوں کی افزائش کیسے ہوتی ہے؟

بالوں کی جڑ جلد کے نچلے حصے یعنی Dermis میں پائی جاتی ہے۔ جو ایک گانٹھ Knob کی شکل کی ہوتی ہے یہ جڑ Fibrous Tissues سے تشکیل پاتی ہے۔ بالوں کا یہی حصہ نشو ونما پاتا ہے۔ چونکہ بالوں کا یہ حصہ Dermis میں ہوتا ہے اور جلد کے اس حصے میں خون کی نالیاں بکثرت پائی جاتی ہیں لہٰذا بالوں کی نشو ونما کے لیے ضروری غذائی اجزاء (وہ بیرونی طور پر استعمال کیے جائیں یا اندرونی طور پر مہیا کیے جائیں) باآسانی دستیاب ہوجاتے ہیں جو بالوں کی مضبوطی اور خوبصورتی کے لیے انتہائی ضروری ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ ہر انسان کے بال ایک خاص حد تک نشو ونما پانے کے بعد مزید بڑھنا بند ہوجاتے ہیں۔

بالوں کے گرنے اور کمزور ہونے کی عام وجوہات:

بالوں کے گرنے اور کمزور ہونے کی کئی وجوہات ہوتی ہیں لیکن عام طور پر چند وجوہات زیادہ دیکھنے میں آتی ہیں جن میں خشکی، سکری، بے خوابی، سر درد، دماغی کمزوری، خون کا بالوں کی جڑوں تک نہ پہنچنا، مناسب مقوی غذا کی کمی، جسم میں وٹامن اے اور ڈی کی کمی، مسلسل نزلے کی شکایت' غیر معیاری تیل اور ادویات کا استعمال، ہر لمحے ذہنی پریشانی میں مبتلا رہنا' ہر لمحے سوچ میں ڈوبے رہنا اور زیادہ دماغی محنت کرنا وغیرہ۔

مخصوص وجوہات:

موروثی بالوں کا گرنا، کسی شدید مرض کے بعد بالوں کا کمزور ہونا اور گرنا اور ایسی ادویات کا استعمال جو بالوں کے گرنے اور کمزور ہونے کا سبب بنیں۔

جڑی بوٹیوں کا تیل ہی کیوں استعمال کیا جائے:

جڑی بوٹیوں کو قدرت نے انسان کی ضروریات کے مطابق پیدا کیا ہے۔ کوئی نہ کوئی جڑی بوٹی انسان کے کسی نہ کسی مرض کو شفا پہنچانے میں معاون ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر جڑی بوٹی میں قدرت نے مرض کے مطابق خواص رکھے ہیں۔ انسانی جسم جڑی بوٹی کو آسانی سے قبول کرلیتا ہے اور اس کے کوئی منفی اثرات بھی مرتب نہیں ہوتے جبکہ دیگر

ادویات کیمیکل سے تیار کی جاتی ہیں جو انسانی صحت پر مضر اثرات مرتب کرتی ہیں۔ ہم نے ایسی خاص جڑی بوٹیوں کے مخصوص اجزاء کو یکجا کر کے یہ نسخہ تیار کیا ہے جو بالوں کے گرنے اور کمزور ہونے کو روکتا ہے۔ ان جڑی بوٹیوں کے مخصوص اجزاء میں ایسے شفائی عناصر پائے جاتے ہیں جو بالوں کے امراض کو شفا سے ہمکنار کرنے میں مخصوص افادیت رکھتے ہیں۔

یہ نسخہ بالوں کو گرنے اور کمزور ہونے سے روکتا ہے۔ بالوں کو لمبا، گھنا اور مضبوط بناتا ہے۔ بالوں کی جڑوں کو مضبوط کرتے ہوئے خشکی اور سکری کا خاتمہ کرتا ہے۔ بالوں کی رنگت کو خراب ہونے سے بچاتے ہوئے انہیں قدرتی رنگت

فراہم کرتا ہے۔ بالوں کو خوبصورت اور پُرکشش بناتا ہے۔ نزلہ زکام کے باعث اگر بال سفید ہو چکے ہوں تو انہیں واپس قدرتی رنگت پر لاتا ہے (بشرطیکہ عمر کے حساب سے بال سفید نہ ہوئے ہوں) دماغی کمزوری، سر درد اور بے خوابی کو دور کرتے ہوئے پُرسکون نیند لانے میں معاونت فراہم کرتا ہے۔ بالوں کو ملائم کرتے ہوئے بالوں کے سروں کو دو موہنا ہونے سے بچاتا ہے۔

طریقہ استعمال:

بالوں کو اچھی طرح دھو کر خشک کرلیں۔ خشک ہونے کے بعد روزانہ صبح اور رات تیل کو بالوں کی جڑوں میں لگا کر جلد میں جذب ہونے تک مساج کریں۔ کم از کم رات کو تیل کا مساج ضرور کریں اور صبح بالوں کو اچھے صابن یا شیمپو سے دھولیں۔

احتیاط:

بالوں کو تیز دھوپ اور گرد و غبار سے بچائیں۔ خوشبودار صابن اور شیمپو سے احتیاط کریں۔

بال چھڑ	10 گرام
افتیمون	10 گرام
چھڑیلا	10 گرام
ناگرموتھ	10 گرام
آملہ	10 گرام
سیکاکائی	10 گرام
رتن جوت	10 گرام
خس	10 گرام
تخم حلبہ	10 گرام
تالیس پتر	10 گرام
براہمی	10 گرام
حب الآس	10 گرام
ہنس راج	10 گرام
صندل سرخ	10 گرام
جونیپر	10 گرام
کنجد سیاہ تیل	آدھا کلو

ترکیب تیل تیار کرنے کے لیے:

یہ تمام چیزیں کوٹ کر آدھا کلو کنجد سیاہ تیل میں 15 منٹ تک درمیانی آنچ پر پکائیں۔ جب تیل ٹھنڈا ہو جائے تو اُس کو ململ کے کپڑے سے چھان کر روزانہ رات کو سوتے وقت بالوں کی جڑوں میں لگائیں اور صبح سر دھولیں۔

☆☆......☆☆

آپ کے جانے پہچانے اسکن اسپیشلسٹ ڈاکٹر خرم مشیر

ہر ماہ آپ کی بیوٹی سے متعلقہ مسائل کے حل کے ساتھ

حسن اور خوبصورتی میں صرف چہرہ ہی نہیں بلکہ خواتین اپنے ہاتھ اور پیر بھی نرم و ملائم اور خوبصورت چاہتی ہیں۔ اس ماہ ہم بیوٹی گائیڈ میں خواتین کے لیے ہاتھوں کی خوبصورتی کے حصول کے لیے اہم معلومات لائے ہیں جو یقیناً آپ کے اس مسئلے کو حل کرنے میں معاون ثابت ہوں گی۔

چہرے کی دلکشی کے بعد ہر عورت کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے ہاتھ اور پاؤں نرم و ملائم اور خوبصورت نظر آئیں لیکن اس خواہش کا حصول ایسا کچھ مشکل بھی نہیں، تھوڑی سی توجہ اور محنت سے ہاتھوں اور پیروں کی صفائی اور نکھار کے لیے مینی کیور اور پیڈی کیور کا طریقہ اختیار کریں۔

نرم و ملائم اور خوبصورت ہاتھ

جسم کی دلکشی کے لیے متوازن غذا ضروری ہے۔ متوازن غذا میں ایسے پروٹین وغیرہ شامل ہوتے ہیں جو چہرے، ہاتھ اور پیروں کی جلد کو نرم و ملائم اور صحت مند و خوبصورت رکھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اپنی غذا کو متوازن بنانے کے لیے سبزیاں، دالیں، اناج، مچھلی، دودھ اور پھل استعمال کریں اور کم سے کم دن بھر میں بارہ گلاس پانی ضرور پئیں تاکہ زہریلے اور فاسد مادے سم سے خارج ہوجائیں۔ کھلی جگہ میں روزانہ کم از کم دس بار لمبی لمبی اور گہری سانس لیں تاکہ آکسیجن خون میں شامل ہوکر صاف و تازہ خون جسم کو گردش کرنے دے، صاف و شفاف خون چہرے پر ہی نہیں ہاتھوں پر بھی دلکشی بن کر جھلکتا ہے۔ متوازن غذا کے ساتھ کیلشیئم کی بھی مناسب مقدار لینی چاہیے تاکہ آپ کے ناخن ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوکر ہاتھوں کی بے رونقی کا سبب نہ بنیں۔

ہاتھوں کی بیرونی صفائی کے لیے روزانہ جتنی بار آپ ہاتھ دھوئیں، کم از کم خشک موسم میں ہاتھوں کو خشک کرنے کے بعد ہینڈ لوشن، کولڈ کریم یا پھر بالائی مل لیں، اس طرح کلائیوں تک مساج ہوجائے گا پھر ہتھیلیوں کی پشت اور انگلیوں کی حرکت ہمیشہ نیچے سے اوپر کی جانب رکھیں۔ اوپر سے نیچے کی جانب حرکت کرنے سے جلد لٹکنے لگتی ہے۔ گلیسرین، عرقِ گلاب اور لیموں کا رس ہم وزن لے کے ملا لیں۔ اس آمیزے کو بازو سے لے کر ہاتھوں کی انگلیوں تک لگا کر پانچ منٹ مساج کریں۔ اس طرح ہاتھوں کی جلد نرم اور دلکش ہوجاتی ہے اور بازو سڈول اور خوبصورت شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

سردیوں میں گرم پانی کے استعمال سے نہ صرف جسم کی جلد خشک ہوکر چٹختی ہوئی نظر آنے لگتی ہے بلکہ ہاتھ بھی گرم اور سرد پانی کے باعث کٹے پھٹے، بے رونق اور خشک ہوجاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ناخن بھی

خراب ہوکر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ گھر کا کام کاج مثلاً کپڑے اور برتن دھونے کے باعث بھی ہاتھوں کی جلد اور ناخن کو نقصان پہنچتا ہے اور ہاتھ بدنما دکھائی دیتے ہیں اس لیے ان امور کی انجام دہی کے وقت دستانے پہنیں تاکہ ہاتھوں کی ملائمت برقرار رہے بلکہ سبزیوں کو کاٹنے اور انہیں چھیلتے وقت بھی سردیوں کے موسم میں کپڑے کے دستانے استعمال کرنا مناسب ہوگا تاکہ روز روز ہاتھوں پر محنت کرنے سے بچ سکیں اور ہاتھ بھی صاف ستھرے اور نرم وملائم رہیں۔

ہاتھوں کی خوبصورتی و دلکشی برقرار رکھنے کے لیے رات کو سوتے وقت ہاتھوں پر دودھ کی بالائی مالش کریں۔ دودھ اور عرقِ گلاب ملا کر ہاتھوں پر ملیں اور ایک گھنٹے کے بعد ہاتھ دھولیں۔

زیتون کے تیل میں لیموں کا رس ملا کر ہاتھوں پر ملیں تو ناخن گلابی، مضبوط اور جلد میں نکھار اور ملائمت آئے گی۔ لیموں کا رس اور سرکہ بھی ہاتھوں پر ملنے سے داغ دھبے اور نشانات کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور جلد نکھر جاتی ہے۔ اس کے علاوہ نیم گرم دودھ کو سونے سے قبل ہاتھوں پر ملنے سے بھی ہاتھ خوبصورت ہوجاتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً کھیرے اور ٹماٹر کے گودے کو مسل کر یا ہاتھوں پر اس مساج کریں۔ مردہ اور بھدی کھال نکل کر صاف شفاف جلد نکھر آئے گی اور ہاتھ خوبصورت ہوجائیں گے۔

ہاتھوں اور پیروں کی خوبصورتی کے لیے ناخن تراشنے سے ابتدا کریں۔ یہ عمل ہفتے میں کم ازکم ایک بار ضروری ہے۔ ناخن تراشتے وقت اس کی موزوں لمبائی اور گولائی کا خاص خیال رکھیں۔ اگر آپ کے ناخن کمزور ہیں اور ٹوٹتے ہیں تو ایسے میں انہیں تین سے چار دن بعد تھوڑا تھوڑا تراشتی رہیں۔ ناخن تراشنے کے بعد اگر ان پر تھوڑا سا زیتون کا تیل، بادام یا ناریل کا تیل مل لیا جائے تو یہ عمل ناخنوں کے لیے موئسچرائزر کا سبب بنے گا۔

ناخنوں کو خوشنما بنانے کے لیے انہیں دودھ اور لیموں کے رس میں پندرہ منٹ بھگو کر رکھیں۔ کبھی کبھی شہد میں عرقِ گلاب ملا کر اس سے بھی ناخن صاف کریں۔ اگر ناخن میلے ہوں تو ایک پیالی پانی میں ایک چمچہ لیموں کا رس ملا کر اس سے ناخن صاف کریں۔ لہسن کے ایک یا دو جوے روزانہ ناخنوں پر ملنے سے ناخن مضبوط اور خوشنما ہوجاتے ہیں۔ مینی کیور کا اگر بہترین نعم البدل درکار ہو تو ایک چمچہ چینی اپنے ہاتھوں پر ڈالیں اور اسے لیموں کے ٹکڑے سے آہستہ آہستہ ملیں۔

ہاتھوں کی خوبصورتی اور دلکش کہنیوں کی صفائی کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ کہنیوں کی دلکشی کے لیے ایک آلو کاٹ کر اسے کانٹے سے گود کر اس کا عرق کہنیوں پر ملنے سے سیاہی دور ہوجاتی ہے۔ اس کے علاوہ لیموں کا رس لگانے سے بھی کہنیوں کی سیاہ رنگت صاف ہوجاتی ہے۔ ناریل کے تیل میں لیموں کا رس شامل کرکے لگانے سے بھی کھردری، سیاہ اور بھدی کہنیوں کی جلد صاف ستھری اور چکنی ہوجاتی ہے۔

☆☆......☆☆